سیر و سلوک
آیت اللہ مطہری - علامہ طباطبائی - آیت اللہ خمینی

سیر و سلوک

استاد مرتضیٰ مطہری

علامہ محمد حسین طباطبائی

آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی

SHAHEED MUTAHHERI FORUM
www.smforum.org
smforum@hotmail.com

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۵۴۲۵ ۔ کراچی

ترجمہ ــــــــــــــــــ ایم۔ اے۔ انصاری
نظرثانی ــــــــــــــــــ رضا حسین رضوانی
کتابت ــــــــــــــــــ اشرف راحت
مصحح ــــــــــــــــــ کاظم علی گجراتی

طبع چہارم ۲۰۰۲ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں: یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ جامعہ ہذا کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریتاً کرائے پر دیجائیگی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کیجائیگی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنیوالے پر یہ شرط عائد نہ کرنیکے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی
جامعہ تعلیمات اسلامی

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم موسوی خوئیؒ کا قائم کردہ یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان اب حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی سیستانی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں دنیا بھر میں معتبر اور مستند اسلامی لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو، انگریزی، فرانسیسی، سواحلی، گجراتی اور دیگر زبانوں میں سیکڑوں کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوب بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر واشاعت کا یہ سلسلہ انسانیت کو صراط مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔

اس کے علاوہ جامعہ ہذا تقریباً ۵۰۰ مدارس ومکاتب میں زیر تعلیم بچوں اور جوانوں کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

دعوت اسلام ایک ایسا کام ہے جس کو فروغ دینے کے لئے ہم سب کو باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کار خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں عام کیا جاسکے۔

دعا ہے کہ خداوند منان بحق محمدؐ وآل محمدؑ ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

شیخ یوسف علی نفسی

وکیل حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سیستانی دام ظلہ العالی

قارئین گرامی

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیمات اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ ادارۂ ہذا کی مطبوعات کی اشاعت کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اجاگر کرنا ہے۔

اس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گراں قدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔

آپ سے یہ بھی استدعا ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آراء تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے:

"(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو"

(سورۂ سبا۔ آیت ۴۶)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار

سکریٹری نشر و اشاعت

اسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدّد ندّیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اُصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اُصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے

اب یہ تمھارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو اس کے مُعتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اسے اس کا مناسب مقام دو۔۔

امام علی علیہ السلام

سیر و سلوک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا

فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا اُنھیں ہم ضرور اپنی راہ کی ہدایت کریں گے

(سورۃ عنکبوت۔ آیت ۶۹)

جامعہ تعلیمات اسلامی

پیش لفظ

سلام بے پایاں ہو نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ص کی روحِ پاک پر اور آپ کے وصیِ عالیمقام صاحبِ ولایتِ کبریٰ حضرت علی مرتضیٰ ع پر اور آپ کی اولادِ امجاد ائمۂ اطہار ع پر خصوصاً قطبِ دائرۂ امکان حضرت بقیۃ اللہ امام مہدی ع پر۔

مذہب سے وابستگی کا احساس اور عالمِ غیب کے اسرار معلوم کرنے کی خواہش انسان کی جبلت میں داخل ہے۔ اس جبلت کا منشا ربِّ ودود کی طرف سے اس کشش کو سمجھا جا سکتا ہے جو عالمِ امکان اور خصوصاً انسان کو لاہوت کے مقامِ مطلق کی طرف کھینچتی ہے۔ یہ مقناطیسی قوت اس جانِ جاں کی ہے جس کو جاناں، حقیقت الحقائق، اصلِ قدیم، منبعِ جمال، مبداءِ وجود اور غایۃ الکمال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اَلْکُلُّ عِبَارَۃٌ وَاَنْتَ الْمَعْنٰی
یَامَنْ ھُوَ لِلْقُلُوْبِ مِغْنَاطِیْسٌ۔

اے وہ ذات جو دلوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے تو ہی معنی ہے، باقی سب الفاظ ہیں (یعنی تو ہی اصل حقیقت ہے باقی سب کہنے کی باتیں ہیں)۔

ایسا صحیح مقناطیسی جذبہ جس کا نتیجہ اور اثر یہ ہو کہ آدمی طبیعت یا نیچر کی قیود اور انسانی حدود کو پھلانگ کر عالمِ تجرّد اور عالمِ لاہوت کی طرف سفر کرنے لگے اور بالآخر غایۃ الغایات اور مبداء المبادی یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال و اسماء میں اس طرح فنا اور جذب ہو جائے کہ اس کی ہستی کی بقا خود بقائے معبود کے ساتھ وابستہ ہو جائے، تو یہ جذبہ ہر اس عملِ صالح سے جس کا تصور کیا جاسکے بالاتر اور عالی تر ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

"جَذْبَۃٌ مِنْ جَذْبَاتِ الرَّحْمٰنِ تُوَازِیْ عِبَادَۃَ الثَّقَلَیْنِ"

"رحمان کا ایک رحمانی جذبہ جن وانس کی تمام عبادات کے مساوی ہے۔"

انسان خود اپنی ذات اور اپنی فطرت کی گہرائی میں اس کعبۂ مقصود کی طرف حرکت کو پاسکتا ہے اور اپنی خداداد جبلی اور فطری صلاحیت اور طاقت سے یہ سفر اختیار کرسکتا ہے لیکن اس سفر کے لیے ضروری ہے کہ اس کا تمام وجود اس سمت میں سفر کرے اور اس کے تمام اعضاء و جوارح اس سفر میں شریک ہوں۔

عالمِ جسم و مادہ جو انسان کی طبیعت ہے، عالمِ ذہن و مثال جو اس کا برزخ ہے اور عالمِ عقل و روح جو اس کی حقیقت ہے، ان سب کو اس

جامع تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

سفر میں باہم شریک و معاون ہونا چاہیے۔

بدن کو کعبہ کی طرف متوجہ ہونا اور نماز کی حالت میں قیام رکوع اور سجود میں مشغول ہونا چاہیے، ذہن کو تمام وسوسوں اور بیہودہ خیالات سے دور رہ کر سدرۃ المنتہیٰ کی طرف ملتفت ہونا چاہیے اور روح کو حرمِ خداوندی کے انوار میں غرق اور بارگاہِ احدیت میں محو و مدہوش ہونا چاہیے۔

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو صرف ظاہر پر اکتفا کرتے ہیں اور عبادات اور نیک اعمال کے مغز اور جوہر کو چھوڑ کر صرف چھلکے اور پوست پر قانع ہیں، وہ کعبۂ مقصود سے کس قدر دور اور جمال و لقائے الٰہی سے کتنے محروم ہیں۔

ایسے ہی کچھ اور لوگ ہیں جن کی توجہ بخیالِ خویش فقط معنی کی طرف ہے۔ وہ اعمالِ حسنہ اور عباداتِ شرعیہ سے بے نیاز ہیں۔ ایسے لوگ بھی حقیقت سے دور، مجاز پر قانع اور وہم و خیال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ اللہ کا نور عالمِ امکان کے تمام مظاہر میں جاری و ساری ہے؟ تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جسم کو عبادت سے الگ رکھا جائے اور اس عالمِ صغیر کو انوارِ الٰہی کی تجلیات سے محروم کر دیا جائے اور صرف اللہ تک رسائی کی باتوں اور مغز و جوہر کا نام لیکر عبادتِ قلبی پر اکتفا کر لیا جائے؟ کیا ایسی عبادت یک طرفہ نہیں ہے؟

قرآن نے مسلمانوں کو امتِ وسط کہا ہے، یعنی متوازن اور اعتدال پسند امت۔ متوازن طریقہ انہی لوگوں کا ہے جو ظاہر و باطن کے جامع ہیں جو اپنے وجود کے ہر درجے میں محبوبِ حقیقی کے مطیع و فرمانبردار ہیں اور جو اس

جامعہ تعلیمات اسلامی

کی طرف ملکوتی سفر کی دل وجان سے تیاری کرتے ہیں۔

وہ ظاہر کو باطن کی پہچان اور باطن کو ظاہر کی روح اور حقیقت سمجھتے ہیں۔ ظاہر و باطن دونوں کی شیر و شکر کی طرح آمیزش کرتے ہیں۔ ظاہر سے ان کا مقصد باطن تک رسائی ہے اور ظاہر کے بغیر باطن تک رسائی کو عبث اور لاحاصل تصور کرتے ہیں۔

حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام سے منسوب ایک دعا میں ہے:

اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ ظَاهِرِيْ بِطَاعَتِكَ وَبَاطِنِيْ بِمَحَبَّتِكَ وَقَلْبِيْ بِمَعْرِفَتِكَ وَرُوْحِيْ بِمُشَاهَدَتِكَ وَسِرِّيْ بِاسْتِقْلَالِ اتِّصَالِ حَضْرَتِكَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

اے اللہ میرے ظاہر کو اپنی طاعت سے، میرے باطن کو اپنی محبت سے، میرے قلب کو اپنی معرفت سے، میری روح کو اپنے جمال کے مشاہدہ سے اور میرے دل کی گہرائی کو اپنی حضوری سے منور فرما۔ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ روح کی تکمیل اور کمالِ انسانیت کے مدارج کے حصول کے لیے نظریاتی دینی علوم اور فلسفہ کی تحصیل کسی طرح بھی کافی نہیں کیونکہ صحیح منطقی دلائل ذہن و دماغ کو تو قائل کر سکتے ہیں لیکن قلب و روح کی تسکین کا سامان نہیں بن سکتے اور انسان کو مشاہدۂ حق سے سیراب کر کے اس کی روحانی تشنگی کو دُور نہیں کر سکتے۔

اگرچہ حکمت و فلسفہ کے علم میں سچائی اور پختگی ہے اور وہ ذہنی اور فکری علوم جو باری تعالٰی کی وحدانیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، ہر طرح کے شک و شبہ کا بھی ازالہ اور سدِّباب کرتے ہیں اور اسی وجہ سے قرآن مجید

نے حکم دیا ہے اور راسخین فی العلم ائمہ طاہرین السلام علیہم اجمعین نے بھی جو وحی و نبوت کے پاسدار ہیں، غور و فکر کرنے اور منطقی دلائل و براہین سے استدلال کرنے کی تاکید کی ہے لیکن صرف توحید کے فلسفیانہ مضامین کی مدد سے، دل اور ضمیر کے انقیاد اور مشاہدۂ باطن کے بغیر بات نہیں بنتی۔

دل کو بھوکا رکھ کر اور باطن کو غذائے روحانی اور انوارِ الٰہی سے محروم کر کے کتابوں، کتب خانوں اور درس و تدریس میں مشغولی چاہے کتنے ہی اونچے درجے کی ہو، مطلب اس کا یہی ہے کہ ایک عضو کی سیری کا تو انتظام کیا گیا لیکن دوسرے عضو کو جو اس سے زیادہ اہم تھا بھوکا رکھا گیا۔

دینِ متین کہ وہی صراطِ مستقیم ہے، دونوں پہلوؤں کی رعایت کرتا ہے اور انسانی صلاحیت و استعداد کی ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے تکمیل کرتا ہے۔

ایک طرف اسلام غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے اور دوسری طرف اخلاص کی، دل کو شہوانی کدورتوں سے پاک و صاف کرنے کی اور اطمینانِ قلب اور سکونِ خاطر کے حصول کی۔ حق تعالیٰ شانہ، گیارہ بڑی بڑی قسمیں کھانے کے بعد فرماتا ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا.

"وہ یقیناً بامراد ہو گیا جس نے اپنی جان کو پاک کر لیا اور وہ یقیناً نامراد ہو گیا جس نے اس کو دبا دیا" (سورۂ والشمس۔ آیات ۹-۱۰)۔

ایسی قرآنی آیات میں انسان کے باطن اور اس کی روح کے متعلق گفتگو ہے۔ یہ آیات اہلِ فکر و دانش اور معلمین و مدرسینِ فلسفہ کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ عبادتِ الٰہی کا ذوق پیدا کریں اور اپنے نفس کی نگرانی اور اس کا محاسبہ کریں تاکہ حسبِ فرمانِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے

جامعہ تعلیمات اسلامی

اعمال خالص اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ہوں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا ظَهَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ اِلٰى لِسَانِهٖ۔[1]

جن لوگوں نے چالیس دن تک خلوص دل سے اللہ کی رضا کے لیے عمل کیا، معارفِ الٰہیہ کے چشمے ان کے دل سے پھوٹ کر ان کی زبان پر جاری ہو جائیں گے اور بالآخر الہامات و وارداتِ رحمانی ان کے وجود کے مرکز سے حرکت میں آجائیں گے۔

فخرِ فلاسفۂ مشرق اور فخرِ فلاسفۂ عالم صدر المتالہین شیرازی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ حکمت و فلسفہ کے بلند پایہ مباحث میں صرف کیا تھا لیکن آخر میں جب عبادت اور باطنی طہارت کا جذبہ غالب آیا تو ان کے طاقتور قلم سے یہ تحریر نکلی:

---

[1] یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے۔ روایات کے الفاظ مختلف ہیں مگر مضمون ایک ہے۔ یہ حدیث احیاء العلوم جلد چہارم صفحہ ۲۲۳، حاشیہ احیاء العلوم صفحہ ۱۹۱ اور عوارف المعارف بر حاشیہ احیاء العلوم جلد دوم صفحہ ۲۵۶ میں موجود ہے۔ شیعہ کتابوں میں سے عیون الاخبار الرضاؑ صفحہ ۲۸۵، عدۃ الداعی صفحہ ۷۰ اور اصول کافی جلد دوم صفحہ ۱۶ پر بھی آئی ہے۔ صاحب عیون نے اپنے اسناد سے حضرت امام رضا علیہ السلام سے اس طرح روایت کی ہے۔ امام رضاؑ نے اپنے والد ماجد سے، انھوں نے اپنے دادا سے، انھوں نے امام باقرؑ سے، انھوں نے اپنے والد امام سجادؑ سے، انھوں نے جابر بن عبد اللہ انصاریؓ سے، انھوں نے امیر المومنینؑ سے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: مَا اَخْلَصَ عَبْدٌ لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا اِلَّا جَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ عَلٰى لِسَانِهٖ۔

"میں خداوندِ عزّوجل سے عفو اور درگزر کا طالب ہوں کیونکہ میں نے اپنی عمر کا ایک حصہ مدعیانِ فلسفہ کے خیالات کے مطالعہ، متکلمین کی بحثوں اور مجادلوں کی تحقیق اور ان کی باریک بینیوں اور خُردہ گیریوں کے سیکھنے میں صرف کیا۔ آخر ایمان کی روشنی اور اللہ کی تائید سے مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ فلاسفہ کا قیاس بے نتیجہ اور ان کی راہ غیر مستقیم ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی زمامِ کار اللہ اور اس کے بشیر و نذیر رسول ص کے ہاتھ میں دیدی اور جو کچھ اللہ کے رسول ص سے ہم تک پہنچا ہے، میں اس سب پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی۔ میں نے اس کی کوشش نہیں کی کہ اس کی عقلی توجیہہ کروں یا کسی علمی بحث میں پڑوں۔ جن باتوں کا اللہ نے حکم دیا ہے ان کی تعمیل اور جن باتوں سے اس نے منع کیا ہے اُن سے اجتناب کی راہ، میں نے بے چون وچرا اختیار کرلی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "رسول ص تمہیں جو حکم دیں اس کی پیروی کرو اور جس بات سے منع کریں اس سے رک جاؤ"۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جس قدر چاہا، میرے دل کو منور کر دیا اور رسولِ خدا ص کی برکت سے مجھے کامیابی اور سرخروئی عطا کی۔" (عرفان کے موضوع پر صدر المتالہین کی مایۂ ناز کتاب "اسفارِ اربعہ" کے مقدمہ سے اقتباس)۔

پچھلی صدی کے بہترین عارفِ ربانی اور فقیہِ صمدانی کی حیثیت سے مرحوم آخوند حسین قلی ہمدانی کا نام لیا جانا چاہیے۔ یہ بڑے فقیہ بھی تھے، بلند پایہ فلسفی بھی اور ایسے متفکر بھی کہ ان جیسے کم ہی ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام علوم کو علمِ عرفان اور تہذیبِ نفس کے زیرِ سایہ جگہ دی تھی اور انوارِ ذاتِ الٰہی میں ان سب کو مدغم کر دیا تھا۔ مرحوم آخوند حسین قلی نے

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

ہر علم کو اپنی جگہ پر رکھا تھا اور اس کا درجہ متعین کیا تھا۔ انھوں نے اپنا اصل مقصد وصول الی اللہ کو قرار دیا تھا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کی ایسی تربیت کی تھی اور انہیں مسلکِ عرفان کی ایسی تعلیم دی تھی کہ ان میں سے ہر ایک آسمانِ فضیلت و توحید پر ستارہ بن کر چمکا اور ہر ایک نے اپنی بصیرت سے تا حدِ نظر ایک عالم کو روشن اور منور کیا۔ ان کے شاگردوں میں سے ایک عارفِ ربانی آغا سید احمد طہرانی کربلائی تھے جن کے شاگرد فخر الفقہاء وجمال العرفاء حاجی مرزا علی آغا قاضی اعلی اللہ مقامہا ہیں۔

فخر المفسرین و سند المحققین حضرت علامہ سید محمد حسین طباطبائی امد اللہ ظلالہ الشارفۃ ابتداء ہی سے علم و عمل کے دونوں بازوؤں سے مصروفِ پرواز تھے۔ انھوں نے فلسفہ و عرفان کی منازل جناب قاضی طبؒ کی زیرِ ہدایت طے کی تھیں اور ایک عمر فلسفہ اور خطابت میں مشغولی اور اشارات، اسفار اور شفا جیسی اعلیٰ علمی کتابوں کے درس و تدریس اور ان پر حواشی لکھنے میں صرف کی تھی۔ گو ان مصروفیات کے ساتھ بھی وہ خلوتِ باطنی اور مراقبہ عرفانی میں پوری طرح مشغول رہتے تھے لیکن آخر میں سب کچھ چھوڑ کر انھوں نے اپنے آپ کو قرآن کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا اور اس کام میں اس طرح محو و مستغرق ہو گئے تھے کہ قرآنی آیات پر غور و فکر ان کی تلاوت و تفسیر اور تاویل و تحلیل کا کام ان کے لیے ہر دوسرے کام سے زیادہ خوشگوار بن گیا تھا۔ گویا صاحبِ شریعتِ غرا اور ان کے اوصیائے کرام کی اطاعتِ محض کے سوا انھیں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

کچھ ایسا ہی حال استاد شہید مرتضیٰ مطہری رضوان اللہ علیہ کا تھا۔

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

انھوں نے بھی ایک عمر درس و تدریس، تصنیف و تالیف، خطابت، وعظ اور فلسفہ کے مباحث کی تحقیق و تدقیق میں صرف کی تھی اور اپنی ذہانت اور نکتہ رسی کے خوب خوب جوہر دکھائے تھے لیکن اپنی عمر کے آخری چند سالوں میں وہ اس واضح نتیجے پر پہنچے تھے کہ باطن اور خدائے ذوالمنن سے رابطہ قائم کیے بغیر اور فیوضاتِ ربانی کے سرچشمے سے دل کو سیراب کیے بنا آدمی کو نہ اطمینانِ خاطر نصیب ہو سکتا ہے، نہ روحانی تسکین حاصل ہو سکتی ہے، نہ اس کا حرمِ مطہر خداوندی میں داخلہ ممکن ہے اور نہ کعبہ مقصود تک رسائی۔

ان کا طریقہ سیر و سلوک تھا۔ شب بیداری، خلوت میں گریہ و زاری اور مناجاتِ سحر گاہی، ذکر و فکر میں استغراق، درسِ قرآن میں مشغولی، اہلِ دنیا اور بندگانِ ہوس سے گریز اور اہل اللہ سے قربت۔ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ رَحْمَةً وَّاسِعَةً۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ "ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ (سورۂ صافات۔ آیت ۶۱)۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدّمہ

علامہ محمد حسین طباطبائی

اگرچہ لوگ زیادہ تر تلاشِ معاش میں مصروف رہتے ہیں اور روحانی معاملات کی جانب کم توجہ دیتے ہیں تاہم قطعی حقیقت کو پہچاننے کی خواہش ہر انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ بعض لوگوں میں یہ خوابیدہ قوت بیدار ہو کر بالکل ظاہر ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں انھیں کئی ایک روحانی ادراکات حاصل ہوتے ہیں۔

سوفسطائیوں اور منکرین مذہب کے اس دعوے کے باوجود کہ ہر سچائی اور حقیقت ایک دھوکا اور فریب ہے ہر شخص ایک ابدی حقیقت پر ایمان رکھتا ہے۔ اکثر جب انسان صاف دل اور پاک روح کے ساتھ کائنات اور مخلوق پر محیط ابدی حقیقت پر نگاہ ڈالتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کے گوناگوں اجزاء کی ناپائیداری کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے اس امر کا احساس

ہوتا ہے کہ دنیا اور اس کے مظاہر ایسے آئینے ہیں جن میں ابدی حقیقت کا جمال منعکس ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے ادراک سے مشاہدہ کرنے والے کو جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ہر دوسری خوشی کو اسکے دل سے محو کر دیتی ہے اور ہر دوسری چیز اس کی نگاہوں میں ہیچ اور بے وقعت ہو جاتی ہے۔

یہ نظارہ اہل عرفان[1] کا وہی "جذبہ" ہے جو خدا شناس لوگوں کی توجہ ماورائے ادراک دنیا کی طرف مبذول کراتا ہے اور ان کے دل میں اللہ کی محبّت پیدا کرتا ہے۔ اس کشش کی وجہ سے وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور ان کے دل سے مختلف خواہشیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ یہ کشش انسان کی رہنمائی اس غیر مرئی ذاتِ خداوندی کی پرستش اور حمد کی جانب کرتی ہے جو در اصل سب مرئی اور مسموع اشیاء سے زیادہ روشن اور آشکار ہے۔ درحقیقت یہ باطنی کشش ہی ہے جس نے دنیا میں بہت سے ایسے مذاہب پیدا کیے ہیں جنکی بنیاد اللہ تعالیٰ کی پرستش پر ہے۔ عارف وہ ہے جو اللہ کی عبادت جزا کی امید یا سزا کے خوف کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا علم رکھتے ہوئے اور اس سے محبت کی وجہ سے کرتا ہے[2]۔

---

[1] اسلامی باطنیات کو عرفان کہا جاتا ہے جس کا تعلق فکری اور ایمانی پہلو سے ہے۔ ایک طبقہ نے اسے تصوف سے بھی تعبیر کیا ہے جس میں غیر شرعی اعمال کو بھی دخل ہے لیکن شیعیت فقط اسلامی شریعت ہی کو تقرب الٰہی کے لیے کافی سمجھتی ہے (ناشر)۔

[2] امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا: "عبادت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک گروہ اللہ کی عبادت خوف کی بنا پر کرتا ہے اور یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ دوسرا گروہ اللہ کی عبادت صلے کی خاطر کرتا ہے اور یہ مزدوروں کی عبادت ہے۔ تیسرا گروہ اللہ کی عبادت اس سے محبت اور اخلاص کی وجہ سے کرتا ہے اور یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے (جاری ہے)

جامعہ تعلیمات اسلامی

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ عرفان کو دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب نہیں بلکہ تمام مذاہب کا دل سمجھنا چاہیے۔ عرفان عبادت کا ایک کامل تر راستا ہے جس کی بنیاد خوف و رجا پر نہیں بلکہ محبت پر ہے۔ یہ دین کی ظاہری صورت اور عقلی فکر سے مطمئن رہنے کی بجائے دین کے باطنی حقائق کو سمجھنے کا راستا ہے۔ ہر الہامی مذہب کے پیروؤں میں حتیٰ کہ ان مذاہب کے ماننے والوں میں بھی جو بت پرستی کے قائل ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عرفان کی راہ پر چلتے ہیں۔ مشرکانہ مذاہب[1] اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور اسلام سبھی کے پیروؤں میں ایسے اشخاص ہیں جو عارف ہیں۔

اسلام میں عرفان کا ظہور

رسولِ اکرمؐ کے صحابہ میں سے حضرت علیؑ عرفانی حقائق اور روحانی زندگی کی منازل کے فصیح بیان کے لیے مشہور ہیں۔ اس موضوع پر آپکے ارشادات علم و دانش کا لازوال خزانہ ہیں۔ دوسرے صحابہ کے اقوال جو ہم تک پہنچے ہیں ان میں اس موضوع پر کافی مواد موجود نہیں۔ تاہم حضرت علیؑ کے رفقاء مثلاً سلمان فارسی، اویس قرنی، کمیل ابن زیاد، رشید ہجری، میثم تمار، ربیع بن خثیم اور حسن بصری وہ بزرگوار ہیں جنہیں صوفیوں کی اکثریت — خواہ وہ

یہی عبادت کی بہترین صورت ہے (بحار الانوار۔ جلد ۱۵ صفحہ ۲۰۸)۔

[1] یہاں فاضل مصنف کے ذہن میں ہندوستان اور مشرق بعید کے مذاہب ہیں جن میں الوہیت کے مختلف پہلو دیومالائی اور اشاری تشکلوں اور دیوی دیوتاؤں کی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں اور اس بنا پر مسلمان انہیں بالعموم "شرک" سمجھتے ہیں (ناشر)۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامع تعلیمات اسلامی

سنّی ہوں یا شیعہ ___ حضرت علیؑ کے بعد اپنے روحانی سلسلے کے پیشوا مانتی ہے۔

اس گروہ کے بعد کچھ اور حضرات مثلاً طاؤس یمانی، شیبان راعی، مالک بن دینار، ابراہیم بن ادہم اور شریف بلخی دوسری صدی ہجری میں منظرِ عام پر آئے جنہیں لوگ ولی اللہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ بر سرِ عام عرفان اور تصوف کا ذکر کیے بغیر ظاہراً زاہد نظر آتے تھے اور اس حقیقت کو نہیں چھپاتے تھے کہ انہیں پہلے گروہ نے روحانیت سے روشناس کرایا ہے اور تربیت دی ہے۔

ان کے بعد دوسری صدی ہجری کے آخری حصے اور تیسری صدی ہجری کے آغاز میں بایزید بسطامی، معروف کرخی اور جنید بغدادی وغیرہ جیسے اشخاص پیدا ہوئے جنہوں نے تصوف کا راستا اختیار کیا اور کھلے عام تصوف اور عرفان سے اپنے تعلق کا اظہار کیا۔ وہ روحانی بصیرت پر مبنی کچھ باطنی اقوال زبان پر لائے جو ظاہری طور پر مکروہ اور معیوب تھے چنانچہ کچھ فقہا اور متکلمین نے انہیں لعنت ملامت کی اور مجرم قرار دیا۔ لہٰذا ان میں سے کئی ایک کو قید کیا گیا اور کوڑے لگائے گئے اور قتل کر دیا گیا۔[۱] اس کے باوجود یہ گروہ باقی رہا اور تمام مخالفت کے باوجود ان لوگوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ یوں عرفان اور طریقت کی نشو و نما جاری رہی حتیٰ کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں اپنی وسعت اور بلندی کی قوت پر جا پہنچا۔ اس کے بعد کبھی اس کا زور بڑھ گیا اور کبھی کم ہو گیا لیکن اس کی ہستی برقرار رہی

---

[۱] حکماء کے سوانحِ حیات پر لکھی گئی کتابیں، شیخ عطار کی کتاب تذکرۃ الاولیاء (مطبوعہ تہران - ۱۳۲۱ ہجری شمسی) اور معصوم علی شاہ کی کتاب "طرائق الحقائق" (مطبوعہ تہران - ۱۳۱۸ھ) ملاحظہ کریں۔

جامع تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

اور اب تک یہ اسلامی دنیا میں باقی ہے۔

اکثر مشائخ عرفان و تصوف جن کے نام تذکروں کی کتابوں میں ملتے ہیں بظاہر سنی مکتب کی پیروی کرتے تھے اور جو طریقت اور تصوف آجکل ہمیں نظر آتا ہے (قرآن اور سنت کی تعلیمات سے عاری وہ چند آداب اور رسومات پر مشتمل ہے)۔ یہ انہی مشائخ کی یادگار کے طور پر باقی ہے اگرچہ بعد میں بعض آداب و رسومات شیعوں میں بھی داخل ہو گئیں۔

مشائخ کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اسلام میں سیر و سلوک کے کسی پروگرام اور طریقے کا بیان موجود نہیں ہے بلکہ طریقۂ معرفت نفس وہ طریقہ ہے جسے خود صوفیوں نے ایجاد کیا اور بقول ان کے جس کو اللہ نے اسی طرح قبول فرما لیا ہے جیسے نصرانیوں نے دعوتِ نصرانیت کے لیے رہبانیت کو اپنے مذہب میں داخل کیا تو اللہ کے نزدیک مقبول قرار پائی۔

اس کے باوجود یہ پیشوا اپنا روحانی شجرہ ـــ جو روحانی زندگی میں کسی شخص کے شجرۂ نسب کی مانند ہوتا ہے ـــ اپنے سابقہ پیشواؤں کے واسطے سے حضرت علیؑ سے ملاتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کی رویا اور وجدان کے جو نتائج ہم تک پہنچے ہیں وہ بیشتر توحید الٰہی اور روحانی زندگی کے ان حقائق کے بارے میں ہیں جو ہمیں حضرت علیؑ اور دوسرے ائمۂ اہلبیتؑ کے اقوال میں ملتے ہیں۔ یہ حقائق ہمیں نظر آ سکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان صوفی پیشواؤں کے کچھ جاذبِ توجہ اور بعض اوقات نفرت انگیز کلمات کا اثر قبول نہ کریں اور ان کی مجموعی تعلیمات کا مطالعہ غور و خوض اور صبر و سکون سے کریں۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

ا۔ روحانی مسلک پر گامزن ہونے سے پیدا ہونیوالا تقدس[1] جسے صوفی انسان کا کمال قرار دیتے ہیں ایک ایسی کیفیت ہے جس کا — اہلِ تشیع کے عقیدے کے مطابق — امام مکمل طور پر حامل ہوتا ہے اور اس کے وجود کی نور افشانی کے ذریعے یہ کیفیت اسکے سچے پیرو بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

ب۔ صوفیا کا روحانی قطب[2] کی ہر دور میں لازمی موجودگی کا عقیدہ اور اس سے منسوب صفات بھی شیعوں کے عقیدۂ امامت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اہلبیتِ رسولؐ کے قول کے مطابق امام — صوفیاء کی زبان میں — ایک آفاقی انسان، اسمائے الٰہی کا مظہر اور لوگوں کی زندگیوں اور اعمال کا رہنما ہوتا ہے لہٰذا اہلِ تشیع کے ولایت کے تصور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روحانی زندگی اور ولایت کے ماخذ کے لحاظ سے صوفی اکابر شیعہ ہیں، گو دین کی ظاہری صورت کے لحاظ سے وہ سنّی مکتب کی پیروی کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ تشیع کو امامِ معصوم کے پیرو ہونے کی وجہ سے وہ تمام چیزیں حاصل ہیں جو اہلِ تصوف بتاتے ہیں۔ اس کے برعکس خود اہلِ تصوف جس قطب

---

[1] عرفاء کی زبان میں جب عارف اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے تو فنا فی اللہ ہو جاتا ہے اور اللہ کی رہنمائی اور ولایت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔

[2] عرفاء کہتے ہیں کہ دنیا نے اپنی ظاہری ہستی اللہ کے ناموں سے حاصل کی ہے اور اسی بنا پر وہ اپنا سفر طے کر رہی ہے۔ اللہ کے تمام ناموں کا مصدر اس کا "مکمل اور اعلیٰ ترین نام" ہے۔ اس کا اعلیٰ ترین نام آفاقی انسان کا مقام ہے جسے کائنات کا قطب بھی کہا جاتا ہے۔ کائنات کبھی قطب سے خالی نہیں رہتی۔

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

اور انسان کامل کا تصور کرتے ہیں وہ شیعی دنیا کے علاوہ کہیں وجود خارجی نہیں رکھتا۔ ہاں! "ماننا" اور "تصور کرنا" اور چیز ہے اور "ہونا" اور "پانا" اور چیز ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اہلسنت کی مستند کتابوں میں بھی بعض اوقات یہ کہا گیا ہے کہ شریعت کی ظاہری شکل وصورت اور تعلیمات کے ذریعے طریقت کے روحانی مسلک[1] یعنی اس طریق کار کی وضاحت ممکن نہیں جس کا اہل تصوف دعویٰ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس صوفیاء کا دعویٰ ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے انفرادی طور پر بعض ایسے طریقے اور دستور دریافت کر لیے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لیا ہے جیسے کہ اس نے نصرانیت میں رہبانیت کو قبول کر لیا ہے[2] لہٰذا مشائخ طریقت میں سے ہر ایک نے جو آداب و رسوم درست سمجھے انہیں سیر و سلوک کے پروگرام میں شامل کر دیا اور اپنے مریدوں کو اس پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا اور بتدریج ایک وسیع اور مستقل پروگرام وجود میں آگیا۔ مثلاً اطاعت و تلقین، ذکر و خرقہ اور موسیقی و غنا کا استعمال اور ذکر کے موقع پر وجد اور حال اور بعض سلسلوں میں نوبت یہاں تک آپہنچی کہ شریعت اور طریقت نے دو مختلف راستے اختیار

---

[1] اسلام میں روحانی راستے کو سیر و سلوک کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی انسان کے اللہ کی جانب سفر کرنے کے ہیں (ناشر)۔

[2] اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: رہبانیت ان لوگوں نے (یعنی عیسائیوں نے) خود ایجاد کی تھی، ہم نے انہیں اسکا حکم نہیں دیا تھا۔ انہوں نے یہ طریقہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا مگر اسے صحیح طور پر نبھا نہ سکے (سورۂ حدید۔ آیت ۲۷)۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

کیے اور اس روش پہ چلنے والے عملی طور پہ باطنیہ کے ساتھ ملحق ہو گئے لیکن شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق جو کچھ اسلام کے اصلی مدارک (کتاب و سنت) سے پتا چلتا ہے وہ اس کے برعکس ہے اور یہ ہرگز ممکن نہیں کہ دینی بیانات اس حقیقت کی جانب رہنمائی نہ کریں یا بعض پروگرام واضح کرنے میں کوتاہی برتیں یا کسی شخص کے لیے (خواہ وہ کوئی بھی ہو) اپنے واجبات اور محرمات کو نظر انداز کر دیں۔

عرفان کے بارے میں قرآن مجید اور سنت کی مہیا کردہ رہنمائی

خداوند عالم نے قرآن مجید میں انسان کو کئی جگہ حکم دیا ہے کہ وہ کتاب اللہ میں غور کرے اور یہ کوشش جاری رکھے اور اس کے مندرجات کو محض سطحی طور پہ سمجھنے پر اکتفا نہ کرے۔ بہت سی آیات میں کائنات اور تمام تر مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں (آیات) قرار دیا گیا ہے۔ 'آیت' اور 'نشانی' کے الفاظ کے معانی کے بارے میں غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ مختلف اشیاء کو یہ نام اس لیے دیے گئے ہیں کہ خود اپنے آپ کو اس قدر ظاہر نہیں کرتیں جتنی اپنے علاوہ ایک اور حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً جب انسان ایک دفعہ سرخ روشنی کو خطرے کے نشان کے طور پر دیکھ لیتا ہے تو پھر اس کے دماغ پر خطرے کا خیال چھا جاتا ہے اور وہ سرخ روشنی پہ کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اگر وہ روشنی کی شکل، ماہیت اور رنگ کی طرف توجہ دینے لگے تو پھر اس کے دماغ میں خطرے کا تصور پیدا ہو جانے کی بجائے بتی

کی شکل اس کے شیشے اور رنگ کا تصور پیدا ہو گا۔ اسی طرح اگر کائنات اور اس کے مظاہر ہر لحاظ سے خالق کائنات کی نشانیاں ہیں تو پھر وہ آزاد وجود کے حامل نہیں ہیں۔ ہم خواہ کسی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں وہ اللہ کے سوا کسی چیز کی طرف نشاندہی نہیں کرتے۔ جو شخص قرآن مجید کے زیر ہدایت دنیا اور اہل دنیا کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھے وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کا ادراک نہیں کرتا۔ اس مستعار حسن کو دیکھنے کی بجائے جسے لوگ دنیا کے دلکش خدوخال میں دیکھتے ہیں وہ ایک بے پایاں حسن کو دیکھتا ہے۔ وہ ایک ایسے محبوب کو دیکھتا ہے جو اپنا جلوہ دنیا کی تنگنائے سے دکھاتا ہے۔ بلاشبہ جیسا کہ سرخ روشنی کی مثال میں بتایا گیا ہے جو چیز نشانیوں میں دیکھی جاتی ہے وہ دنیا نہیں بلکہ دنیا کے خالق کی ذات ہے۔ ایک خاص نقطۂ نگاہ سے اللہ اور دنیا کے مابین رشتہ ایک جمع ایک (1+1) یا ایک ضرب ایک کا نہیں بلکہ ایک جمع صفر (1+0) کا ہے (جس سے مراد یہ ہے کہ دنیا اللہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور اس کی ذات میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتی)۔

جونہی انسان کے دل میں اس حقیقت کا شعور پیدا ہوتا ہے تو اپنی علیحدہ ہستی کا پندار ٹوٹ جاتا ہے اور اچانک اس کے دل میں اللہ تعالٰے کی محبت جاگزیں ہو جاتی ہے جیسا کہ ظاہر ہے یہ شعور آنکھ، کان یا دوسرے ظاہری حواس کی بدولت یا دماغ کی قوت کے ذریعے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمام اعضاء بجائے خود نشانیاں ہیں اور جس روحانی ہدایت کا یہاں

ذکر ہو رہا ہے اس کے لیے ان کی کوئی حیثیت نہیں[1]

جس شخص کی رسائی جلوۂ الٰہی تک ہو اور جو فقط اللہ کو یاد رکھنا چاہتا ہو اور باقی سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہو جب وہ یہ سنتا ہے کہ اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

"اے ایمان والو! تم اپنے نفسوں کے خود ذمہ دار ہو۔ اگر تم راہِ راست پر ہو تو کوئی گمراہ شخص تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۰۵)

تو پھر وہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ واحد شاہراہ جو اس کی مکمل رہنمائی کر سکتی ہے "خود شناسی" کی شاہراہ ہے۔ اس کا سچا رہنما جو خود اللہ تعالیٰ ہے اسے اس بات کا پابند کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سمجھے۔ تمام دوسرے راستے چھوڑ کر خود شناسی کا راستا تلاش کرے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی روح کے دریچے سے دیکھے اور یوں اپنی تلاش کا حقیقی مقصد پالے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"[2]

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

---

[1] حضرت علیؑ نے فرمایا ہے: "خدا وہ نہیں ہے جو علم کے احاطے میں آجائے۔ خدا وہ ہے جو دلیل کی رہنمائی اپنی جانب کرتا ہے۔" (بحار الانوار۔ جلد ۳ صفحہ ۱۸۶)

[2] ایک معروف حدیث جس کی سنی اور شیعہ صوفیاء اور عرفاء کی کتابوں میں بالخصوص تکرار کی گئی ہے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

"تم میں سے وہ لوگ اللہ کو بہتر پہچانتے ہیں جو اپنے آپ کو بہتر پہچانتے ہیں"[۱]

جہاں تک سیر و سلوک کا یہ راستا اختیار کرنے کا تعلق ہے قرآن مجید کی بہت سی آیات ہیں جو یادِ الٰہی کی تاکید کرتی ہیں مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

"مجھے یاد کرو اور پھر میں بھی تمہیں یاد کرونگا" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۲)۔

انسان کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ نیک اعمال کرے جن کی وضاحت قرآن مجید اور حدیث میں کر دی گئی ہے۔ نیک اعمال کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"بیشک تمہارے لیے اللہ کا رسولؐ بہترین نمونہ ہے"۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۲۱)

یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام ایک مخصوص راہ کو وہ راہ قرار دے جو اللہ کی طرف لے جاتی ہے جب تک وہ تمام لوگوں کو اس راہ سے متعارف نہ کرا دے؟ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس راہ کے بارے میں بتائے لیکن یہ وضاحت نہ کرے کہ اس پر چلنے کا کیا طریقہ ہے؟

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"اے رسولؐ! ہم نے تم پر کتاب (قرآن) نازل کی جس میں دین اور دنیا کا واضح طور پر بیان ہے"۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۸۹)

---

[۱] یہ حدیث بھی شیعہ اور سنی عرفاء کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے (ناشر)۔

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

علمِ عرفان

استاد مرتضیٰ مطہری

جو علوم اسلامی تمدن کی گود میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے' ان میں سے ایک علمِ عرفان ہے۔

اس علم پر دو مختلف پہلوؤں سے بحث اور تحقیق ممکن ہے ' ایک معاشرتی پہلو سے دوسرے علمی پہلو سے۔

اہلِ عرفان اور دوسرے اسلامی علوم کے عالموں مثلاً محدثین' مفسرین' فقہاء' متکلمین' فلاسفہ' ادباء اور شعراء وغیرہ میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ گو عارفوں کا تعلق بھی ایک علمی طبقہ سے ہے لیکن چونکہ انھوں نے علمِ عرفان کے نام سے ایک علم ایجاد کیا اور اس علم کے بڑے بڑے عالم بھی پیدا کیے جنھوں نے اس موضوع پر اہم کتابیں تصنیف کیں اس لیے انھوں نے دنیائے اسلام میں اپنا ایک معاشرتی فرقہ بھی پیدا

کر لیا جس کی اپنی خصوصیات ہیں۔ دوسرے علمی گروہ جیسے فقہاء اور علماء وغیرہ صرف علمی گروہ ہی ہیں اور وہ دوسروں سے الگ کوئی فرقہ شمار نہیں ہوتے۔

اہلِ عرفان کو علمی لحاظ سے عارف کہا جاتا ہے لیکن جب ان کو معاشرتی پہلو سے دیکھنا ہوتا ہے تو انھیں غالباً صوفی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پھر بھی عرفاء اور صوفیہ مسلمانوں کا کوئی جداگانہ مذہبی فرقہ نہیں سمجھے جاتے اور نہ وہ خود کوئی الگ مذہبی فرقہ ہونے کے مدعی ہیں۔ یہ لوگ تمام اسلامی فرقوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی معاشرتی نقطۂ نظر سے صوفیوں کا اپنا گروہ اور اپنی ایک الگ جماعت بھی ہے جس کے اپنے مخصوص خیالات، افکار اور طور طریقے ہیں۔ یہ لوگ خاص قسم کا لباس پہنتے ہیں، خاص طرح کے بال رکھتے ہیں اور خانقاہوں وغیرہ میں رہتے ہیں۔ اس طرح صوفی معاشرتی اور مذہبی لحاظ سے ضرور ایک الگ فرقہ بن گئے ہیں۔

ساتھ ہی ہمیشہ سے ۔ خاص طور پر اہلِ تشیع میں — ایسے عارف ہوتے رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جن میں اور دوسروں میں کوئی ظاہری فرق یا امتیاز نہیں لیکن اس کے باوجود سیر و سلوک اور معرفت و عرفان سے ان کا گہرا تعلق ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حقیقی عارف یہی لوگ ہیں، وہ نہیں جنھوں نے سیکڑوں خود ساختہ رسوم اختیار کر لی اور بدعتیں ایجاد کر لی ہیں۔

یہاں ہمارا مقصد محض اسلامی علوم کی ایک شاخ کی حیثیت سے عرفان پر گفتگو کرنا ہے۔ صوفیوں نے جو معاشرتی فرقہ (متصوّفہ) کی شکل اختیار کر لی ہے

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

اس سے یا ان کے مخصوص طور طریقوں اور آداب و رسوم سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔

اگر ہمیں تصوف کے معاشرتی پہلو سے بحث مقصود ہوتی تو ضروری تھا کہ ہم اس فرقہ کے وجود میں آنے کے اسباب سے بحث کرتے، یہ بتلاتے کہ اسلامی معاشرے پر اس کے وجود میں آنے کے کیا مثبت اور منفی، مفید اور مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ فرقہ اور دوسرے فرقے ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ اسلامی علوم کو اس فرقے نے کیا رنگ دیا اور دنیا میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت پر اس کا کیا اثر مرتب ہوا مگر فی الحال ہمیں ان موضوعات سے سروکار نہیں۔ ہمارا مقصد محض عرفان سے بحیثیت ایک علم کے بحث کرنا ہے۔

علمی لحاظ سے عرفان کے دو پہلو ہیں: ایک عملی، دوسرا نظری۔

عملی پہلو عرفان کا وہ حصہ ہے جو اس تعلق کو بیان کرتا ہے جو آدمی کا اپنے ساتھ، اس جہان کے ساتھ اور خدا کے ساتھ ہے۔ وہ ان تعلقات اور اس ضمن میں پیدا ہونے والے آدمی کے فرائض کی تشریح کرتا ہے۔

عرفان کا یہ حصہ علم اخلاق سے مشابہت رکھتا ہے کیونکہ یہ ایک عملی علم ہے۔ اخلاق اور عرفان کا فرق ہم بعد میں واضح کریں گے۔

عرفان کا یہ حصہ "سیر و سلوک" کہلاتا ہے۔ اس حصہ میں اس کی تشریح کی جاتی ہے کہ "سالک" کو انسانیت کی معراج یعنی "توحید" تک پہنچنے کے لیے کہاں سے ابتدا کرنی چاہیے اور کن "منازل" اور "مقامات" کو کس ترتیب کے ساتھ طے کرنا چاہیے۔ ان منازل میں

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

سالک کو کیا کیا "احوال" پیش آتے ہیں اور اس پر کونسی "واردات" گزرتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ یہ تمام منازل کسی مردِ پختہ کار کی نگرانی میں طے کی جائیں جو خود ان منازل سے گزر چکا ہو اور رسم و راہِ منزل سے بخوبی آگاہ ہو۔ اگر کسی ایسے مردِ کامل (جس کو طائرِ قدس یا خضر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کی رہنمائی میسر نہ ہو تو گمراہی کا اندیشہ ہے۔

ایک شاعر کہتا ہے:

ہمتم بدرقہ راہ کن اے "طائرِ قدس"
کہ دراز است رہِ مقصد و من نو سفرم

(میرے مرشد اس راستے میں میری ہمت بڑھا منزلِ مقصود دُور ہے اور مجھے سفر کا پہلا اتفاق ہے)۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

ترک ایں مرحلہ بے ہمرہیِ "خضر" مکن
ظلمات است بترس از خطرِ گمراہی

(جب تک خضر ساتھ نہ ہو اس منزل سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔ راستا میں ظلمات ہے اس لیے ڈرتے رہو کہ راستہ نہ بھٹک جاؤ)۔

توحید جو عارف کی نظر میں انسانیت کی معراج اور سیر و سلوک کا آخری مقصد ہے وہ عوام کی توحید سے کوسوں دُور ہے حتیٰ کہ فلسفی توحید کا جو تصور رکھتا ہے اس سے بھی بہت مختلف ہے فلسفی کے نزدیک توحید کا مطلب صرف اتنا ہے کہ واجب الوجود ایک ہے، ایک سے زیادہ نہیں۔

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

عارف کے نزدیک توحید یہ ہے کہ موجودِ حقیقی فقط اللہ ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ "موجود" نہیں صرف "ظاہری نمود" ہے۔ عارف کے نزدیک خدا کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

عارف کی توحید یہ ہے کہ طریقِ سلوک طے کر کے اس منزل تک پہنچ جائے جہاں خدا کے سوا کچھ نظر نہ آئے لیکن عارفوں کے مخالفین اس منزل کے قائل نہیں بلکہ کبھی کبھی تو وہ اسے کفر و الحاد قرار دیتے ہیں مگر عارفوں کے نزدیک حقیقی توحید یہی ہے اور توحید کے باقی درجے شرک سے خالی نہیں ہیں۔ عارفوں کی نظر میں اس درجے تک پہنچنا عقل اور فکر کا کام نہیں۔ یہ دل کا کام ہے اور یہ مرتبہ سیر و سلوک، مجاہدہ اور تہذیبِ نفس سے حاصل ہوتا ہے۔

بہر حال یہ عرفان کا عملی پہلو ہے اور اس لحاظ سے علمِ اخلاق سے مشابہت رکھتا ہے کیونکہ علم اخلاق میں بھی اسی سے بحث کی جاتی ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔ ان دونوں علوم میں فرق یہ ہے کہ:

اولاً: عرفان میں اس تعلق سے بحث کی جاتی ہے جو آدمی کا خود اپنے سے، سارے جہان سے اور خدا سے ہے لیکن کوئی اخلاقی نظام اس تعلق سے بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا جو انسان کا خدا سے ہے۔ صرف مذہب کا اخلاقی نظام ہی اس پہلو کی طرف توجہ کرتا ہے۔

ثانیاً: عرفانی سیر و سلوک جیسا کہ سیر و سلوک کے الفاظ سے ظاہر ہے، ایک متحرک کیفیت ہے۔ اس کے برخلاف اخلاق ساکن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عرفان میں نقطۂ آغاز سے بات کی جاتی ہے اور پھر بالترتیب منزلِ مقصود اور ان تمام منازل و مراحل کا ذکر ہوتا ہے جو سالک کو آخری

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

منزل پہ پہنچنے کے لیے طے کرنے ضروری ہیں۔
عارف کے نقطۂ نگاہ سے فی الواقع اور بغیر کسی مجاز کے شائبہ کے ایک راہ ہے جس کو مرحلہ بمرحلہ اور منزل بمنزل طے کرنا ضروری ہے۔ پہلی منزل سے گزرے بغیر اگلی منزل تک پہنچنا ناممکن ہے۔
عارف کی نظر میں انسانی روح ایک بچے یا ایک پودے کی مانند ہے جس کی نشو ونما ایک مخصوص نظام کے مطابق ہونی ضروری ہے۔ اس کے برخلاف اخلاقیات میں محض سچائی، دوستی، عدالت، عفت، احسان، انصاف اور ایثار جیسی اخلاقی خوبیوں پہ زور دیا جاتا ہے جن سے روح کو جلا ملتی ہے۔ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے انسانی روح کی مثال ایک گھر کی سی ہے جسے نقش ونگار اور سامان آرائش سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی ترتیب کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال نہیں رکھنا پڑتا کہ کہاں سے شروع کیا جائے اور کہاں ختم کیا جائے مثلاً یہ کہ چھت سے شروع کیا جائے یا دیوار سے یا پھر کونسی دیوار سے۔ دیوار کے اوپر سے یا نیچے سے؟
اس کے برعکس عرفان میں بھی اخلاقیات سے بحث ہوتی ہے لیکن وہاں اخلاقی عناصر متحرک ہوتے ہیں۔
ثالثاً: اخلاق کے روحانی عناصر محدود ہیں اور اس کے معنی و مطلب سے تقریباً سب واقف ہیں جبکہ عرفان کے روحانی عناصر مقابلتاً بہت زیادہ وسیع ہیں۔
سیر وسلوک میں ایسے احوال اور قلبی واردات کی بات کی جاتی ہے جو فقط سالک کو مجاہدات کے دوران میں اور سلوک کی راہ طے کرتے ہوئے پیش آتے ہیں۔ ان احوال اور واردات میں دوسرے لوگوں کا کوئی حصہ نہیں۔

عرفان کے ایک اور حصے کا تعلق کائنات کی تشریح سے ہے یعنی اس میں خدا' جہان اور انسان کی تشریح ہوتی ہے۔ عرفان کا یہ حصہ فلسفہ سے ملتا جلتا ہے اور اسی طرح کائنات کی تفسیر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برخلاف پہلا حصہ اخلاقیات سے مشابہت رکھتا ہے اور وہ انسان کی اخلاقی حالت بدلنا چاہتا ہے۔ جس طرح پہلا حصہ اخلاقیات سے قریبی مشابہت کے باوجود بھی اخلاقیات سے مختلف ہے' اسی طرح دوسرا حصہ فلسفہ سے مشابہت کے باوجود اس سے مختلف ہے۔ اس کی مزید تشریح ہم انشاء اللہ بعد میں کرینگے۔

نظری عرفان

اب ہم عرفان کے نظری پہلو کو لیتے ہیں۔ نظری عرفان کا تعلق کائنات کی تشریح سے ہے۔ اس میں خدا' انسان اور جہان سے بحث کی جاتی ہے۔

اس لحاظ سے عرفان کا یہ حصہ فلسفۂ الٰہیات سے گہری مماثلت رکھتا ہے اور اس کا کام کائنات کی تشریح ہے۔ جس طرح فلسفہ کے اپنے مسائل اور اصول ہیں اسی طرح تصوف کے بھی اپنے مسائل اور اصول ہیں۔ فرق یہ ہے کہ فلسفہ صرف اپنے عقلی اصولوں سے استدلال کرتا ہے اور انہی اصولوں پر بھروسا کرتا ہے جبکہ عرفان کشف سے استدلال کرتا ہے اور کشف سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اسے منطقی پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔

فلسفی کے عقلی استدلال گویا کہ ایسا مضمون ہے کہ اسے جس زبان میں لکھا جائے اسی زبان میں اس کا مطالعہ کیا جائے لیکن عرفانی استدلال ایک ایسا مضمون ہے جو گویا کہ غیر زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ کم از کم خود عارف

کے اپنے دعوے کے مطابق صورت یہ ہے کہ وہ جو کچھ اپنے دل کی آنکھوں اور اپنے تمام وجود سے مشاہدہ کرتا ہے اسی کو وہ عقل کی زبان سے بیان کر دیتا ہے۔

عرفانِ ہستی کی جو تشریح کرتا ہے یا بہ الفاظِ دیگر عرفان میں "وجود" کا جو تصور ہے وہ وجود کی اس تشریح سے بدرجہا مختلف ہے جو فلسفہ پیش کرتا ہے دونوں میں گہرا اور بنیادی فرق ہے۔

فلسفی کے نقطۂ نگاہ سے خدا کا وجود بھی واقعی ہے اور غیرِ خدا کا بھی۔ فرق یہ ہے کہ خدا واجب الوجود اور قائم بالذات ہے اور غیرِ خدا ممکن الوجود اور قائم بالغیر ہے جس کو وجود میں لانے والا واجب الوجود ہے لیکن عارف کی نظر میں غیرِ خدا کے وجود کو خدا کے بالمقابل نہیں لایا جا سکتا' ہر چند یہ کہا جائے کہ غیر اللہ کو وجود میں لانے والا اللہ ہی ہے۔ عارف کی نظر میں خدا کا وجود ہر شے پر محیط ہے یعنی سب چیزیں خدا ہی کے اسماء' صفات اور اسی کی شان کی تجلیات ہیں اس کے بالمقابل کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

فلسفی کا نقطۂ نظر عارف کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ فلسفی اس کائنات کو سمجھنا چاہتا ہے یعنی وہ چاہتا ہے کہ اس کے ذہن میں اس جہان کی صحیح اور نسبتاً جامع اور مکمل تصویر ہو۔ فلسفی کی نگاہ میں انسان کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وہ اس جہان کا اپنی عقل کی مدد سے اس طور پر ادراک کرے کہ اس کے وجود میں جہان کا ایک وجود قائم ہو جائے اور وہ خود جہان بن جائے۔ اسی لیے فلسفہ کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ:

فلسفہ یہ ہے کہ آدمی موجود جہان کے مشابہ ایک عقلی اور ذہنی جہان بن جائے مگر عارف کو عقل و فہم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ عارف چاہتا ہے کہ اس

وجود کی حقیقت تک رسائی حاصل کرے جو خود اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اس سے ملنا اور اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔

عارف کی نظر میں انسان کا کمال یہ ہے کہ سیر و سلوک کے ذریعے سے وہ اپنی اصل کی طرف (یعنی جہاں سے وہ آیا ہے) لوٹ جائے۔ ذاتِ حق سے دوری اور فاصلے کو مٹا دے اور قرب الٰہی کے دامن میں اپنی ذات کو فنا کر کے بقاء باللہ کا درجہ حاصل کرے۔

فلسفی عقل، منطق اور استدلال سے کام لیتا ہے لیکن عارف کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے قلبِ صافی، تہذیبِ نفس، مجاہدہ اور باطنی جد و جہد سے کام لینا پڑتا ہے۔

آگے چل کر جب ہم عرفان کے تصورِ کائنات سے بحث کریں گے تو اس کا اور فلسفہ کے تصورِ کائنات کا فرق واضح ہو جائیگا۔

عرفان اور اسلام

عرفان کے عملی اور نظری دونوں پہلوؤں کا دینِ مقدس اسلام سے قریبی تعلق ہے کیونکہ ہر دین و مذہب کی طرح بلکہ دوسرے ادیان و مذاہب سے بڑھ کر اسلام انسان کے خدا سے، کائنات سے اور خود اپنے آپ سے تعلق کو بیان کرتا اور اس تعلق کی توضیح کرتا ہے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ عرفان پیش کرتا ہے اور جو کچھ اسلام بیان کرتا ہے ان دونوں میں کس طرح کا تعلق ہے۔

مسلمان عرفاء ہرگز یہ نہیں کہتے کہ وہ اسلام سے ہٹ کر کوئی بات کہتے

جامعہ تعلیمات اسلامی

ہیں بلکہ اگر کوئی اور بھی ان کے متعلق کوئی ایسی بات کہے تو وہ اس کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اسلامی حقائق سے دوسروں سے بہتر واقف ہیں بلکہ درحقیقت سچے مسلمان وہی ہیں۔ عارفین عرفان کے عملی اور نظری دونوں پہلوؤں کے لیے کتاب وسنت، سیرت نبوی سیرت ائمہؑ اور اکابر صحابہ سے استناد کرتے ہیں۔

لیکن دوسرے ان کے بارے میں مختلف نظریے رکھتے ہیں۔ ہم بالترتیب وہ نظریے بیان کرتے ہیں۔

ا۔ محدثین اور فقہائے اسلامی کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ صوفیہ عملاً اسلام کے پابند نہیں ہیں اور وہ کتاب وسنت سے استناد محض عوام کو دھوکا دینے اور مسلمانوں کے دل موہنے کے لیے کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر تصوف کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ب۔ عصرِ حاضر کے تجدد پسندوں میں سے ایک گروہ کا خیال ہے — اور یہ گروہ اسلام سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتا بلکہ ہر اس چیز سے خوش ہوتا ہے جس سے بے راہ روی کی بو آتی ہو یا جسے اسلام اور اسلامی احکام کے خلاف گزشتہ زمانے کی کوئی تحریک قرار دیا جاسکے — کہ عرفاء عملاً اسلام پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ عرفان اور تصوف ایک تحریک تھی جو عجمیوں نے عربوں اور اسلام کے خلاف چلائی تھی اور حقیقت کو چھپانے کے لیے اس پر روحانیت کا پردہ ڈال دیا تھا۔

جہاں تک عرفان وتصوف کی مخالفت کا تعلق ہے، وہاں تک اس گروہ کی رائے وہی ہے جو پہلے گروہ کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلا گروہ اسلام

کو مقدس جانتا ہے اور عوام کے اسلامی جذبات کا خیال رکھتے ہوئے عارفوں اور صوفیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ عرفان کو اسلامی علوم کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ اس کے برخلاف دوسرا گروہ بعض دنیادار صوفیوں کی شخصیت پر حملہ کر کے چاہتا ہے کہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا بہانہ ہاتھ آئے تاکہ اسلام پر تنقید کی جا سکے۔ انکے نزدیک ایسے بلند اور لطیف روحانی اور عرفانی خیالات کا اسلام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ اس طرح کے خیالات باہر سے آئے ہیں۔ اسلام اور اسلامی افکار کی سطح اس طرح کے خیالات سے پست تر ہے۔

اس گروہ کا دعوئ ہے کہ عارفین اور صوفیہ کتاب و سنت سے استناد بطور تقیہ اور عوام کے خوف سے کرتے ہیں اور اس طرح وہ درحقیقت اپنی جان بچانا چاہتے ہیں۔

ج۔ تیسرا گروہ ان غیر جانبدار لوگوں کا ہے جن کی نظر میں عرفان و تصوف میں خصوصاً عملی تصوف میں، خاص طور پر جب وہ ایک فرقہ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے بہت زیادہ بدعات پائی جاتی ہیں۔ اس میں ایسی کج روی آجاتی ہے کہ اسے کتاب و سنت سے تطبیق نہیں دیجا سکتی لیکن عارفین اور صوفیہ دوسرے اسلامی علمی طبقوں اور اسلامی فرقوں کی طرح اسلام کے بارے میں پوری طرح مخلص ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی بات دانستہ اسلام کے خلاف کہیں۔

یہ ممکن ہے کہ ان سے کچھ غلطیاں ہو گئی ہوں۔ ایسی غلطیاں سب علمی طبقوں سے ہوئی ہیں مثلاً متکلمین سے، فلاسفہ سے، مفسرین سے، فقہاء سے

لیکن اس میں اسلام کے خلاف کسی بدنیتی کو ہرگز دخل نہیں۔

عارفوں اور صوفیوں کی اسلام دشمنی کی بات صرف وہ لوگ کرتے ہیں جن کو یا تو عرفان و تصوف سے مخاصمت ہے یا اسلام سے۔ ایسے لوگ اپنی مخصوص اغراض کے تحت ایسی باتیں کرتے ہیں۔ جو شخص بغیر کسی تعصب کے عرفاء کی کتابوں کا مطالعہ کریگا بشرطیکہ وہ ان کی زبان اور اصطلاحات سے واقف ہو تو یہ تو ممکن ہے کہ وہ ان کتابوں میں بہت سی غلطیاں پائے لیکن اسے یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ عارف اسلام سے مخلص نہیں تھے۔

ہمارے خیال میں یہ تیسرا نظریہ ہی قابلِ ترجیح ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ عارفوں کی نیت بری نہیں لیکن بہرحال یہ ضروری ہے کہ ایسے لوگ جو عرفان سے ماہرانہ واقفیت رکھتے ہوں اور دوسرے اسلامی علوم میں بھی ان کو کافی دستگاہ حاصل ہو وہ عرفان کے مسائل کے بارے میں غیر جانبدارانہ تحقیق کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ کہاں تک اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں۔

شریعت، طریقت اور حقیقت

عارفوں اور غیر عارفوں خصوصاً فقیہوں کے درمیان اختلاف کی ایک اہم وجہ شریعت، طریقت اور حقیقت کے بارے میں عارفین کا مخصوص نظریہ ہے:

اس بات پر تو عارفوں اور فقیہوں کا اتفاق ہے کہ احکامِ شریعت حقائق اور مصالح پر مبنی ہیں۔ عام طور پر فقہاء مصالح سے وہ باتیں مراد لیتے ہیں جو انسان کی سعادت کا موجب ہوں یعنی جن کے ذریعے سے انسان زیادہ سے زیادہ مادی اور روحانی نعمتیں حاصل کر سکے لیکن عارفوں کا عقیدہ ہے کہ سب

واسطے خدا کی طرف جاتے ہیں اور تمام حقائق اور مصالح ایک طرح سے خدا کی طرف لے جانے کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں اور اس مقصد کے لیے حالات کو سازگار بناتے ہیں۔

فقہاء صرف اتنا ہی کہتے ہیں کہ شرعی احکام میں کچھ مصلحتیں پوشیدہ ہیں جن کو ان احکام کی علت یا روح شریعت سمجھنا چاہیے۔ ان مصلحتوں کے فائدے شریعت کے احکام پر عمل کر کے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن عارفوں کا خیال ہے کہ جو مصلحتیں شرعی احکام میں پوشیدہ ہیں وہ دراصل ایک طرح کی وہ منازل ہیں جو انسان کو قربِ الٰہی کے مقام تک لے جاتی اور حقیقت تک رسائی میں اس کی رہنمائی کرتی ہیں۔

عارفوں کا عقیدہ یہ ہے کہ شریعت کا باطن "راہ" ہے جسے وہ طریقت کہتے ہیں اور اس کی راہ کی انتہا "حقیقت" ہے یعنی توحید ان خاص معنوں میں جو ہم نے پہلے بیان کیے ہیں۔ یہ درجہ اپنی ذات اور خودی کو مٹانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ عارف تین چیزوں کا قائل ہے: شریعت، طریقت اور حقیقت۔ اس کے نزدیک شریعت، طریقت تک پہنچنے کا ذریعہ یا طریقت کا چھلکا ہے اور طریقت حقیقت تک رسائی کا ذریعہ یا حقیقت کا چھلکا ہے (یعنی شریعت چھلکا ہے اور اس کے مقابلے میں طریقت مغز۔ اسی طرح طریقت چھلکا ہے اور اس کے مقابلے میں حقیقت مغز)۔

فقہاء کے نقطۂ نظر سے اسلامی تعلیمات کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم عقائد ہیں جن کو علم کلام میں بیان کیا جاتا ہے۔

جہاں تک عقائد سے متعلق مسائل کا تعلق ہے، آدمی کے لیے

ضروری ہے کہ وہ اصول عقائد پر عقلی طور پر غیر متزلزل اعتقاد رکھتا ہو۔

اسلامی تعلیمات کی دوسری قسم کا تعلق اخلاق سے ہے۔ اس قسم میں اخلاقی فضائل ورذائل کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ بحث علمِ اخلاق سے متعلق ہے۔

اسلامی تعلیمات کی تیسری قسم احکام ہیں جن کا تعلق آدمی کے اعمال اور کردار سے ہے۔ احکام بیان کرنا فقہ کا کام ہے۔

اسلامی تعلیمات کی یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔ عقائد کا تعلق عقل وفکر سے ہے۔ اخلاق کا تعلق عادات وخواہشات سے ہے اور احکام کا تعلق اعضاء وجوارح سے ہے۔

جہاں تک عقائد کا تعلق ہے عارفین صرف ذہنی اور عقلی اعتقاد کو کافی نہیں سمجھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جن حقائق پر ایمان لایا جائے ان پر غور کرنا اور کوئی ایسا کام کرنا بھی ضروری ہے کہ انسان کے اور ان حقائق کے درمیان سے پردہ اٹھ جائے۔ اسی طرح وہ ساکن اور محدود اخلاقی فضائل کو بھی کافی نہیں سمجھتے اور علمی اور فلسفی اخلاق کے بجائے عرفانی سیروسلوک تجویز کرتے ہیں جس کی اپنی ایک خاص ساخت ہے۔

جہاں تک فقہی احکام کا تعلق ہے عارفین کو ان پر کوئی اعتراض نہیں۔ صرف بعض مسائل کے بارے میں ان کی رائے ایسی ہے جس کو ممکن ہے کہ فقہ کے مسلمہ قواعد کے خلاف سمجھا جائے۔

عارفین اسلامی تعلیمات کی ان تین قسموں کو شریعت، طریقت اور حقیقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جس طرح ایک انسان

جامعہ تعلیمات اسلامی

کے تین حصے یعنی بدن، نفس اور عقل ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں اور ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود بھی متحد ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے تعلق ظاہر اور باطن کا ہے۔ اسی طرح شریعت، طریقت اور حقیقت کا بھی آپس میں تعلق ہے یعنی شریعت ظاہر ہے، طریقت باطن اور حقیقت باطن کی بھی باطن، فرق یہ ہے کہ انسانی وجود کے مراتب و مراحل عارفین کے نزدیک تین سے زیادہ ہیں۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ انسانی وجود کے بعض درجے ماورائے عقل ہیں۔ اس کی مزید وضاحت ہم انشاءاللہ بعد میں کریں گے۔

اسلامی عرفان کا مواد

کسی علم سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس علم کی تاریخ اور اس میں وقتاً فوقتاً جو تغیرات ہوئے ان کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔ ان شخصیتوں کا حال معلوم کیا جائے جنہوں نے اس علم کو ایجاد کیا یا اسے ترقی دی اور اس علم کی بنیادی کتابوں سے واقفیت پیدا کی جائے۔ اب ہم انھیں مسائل کو لیتے ہیں۔

سب سے پہلا مسئلہ جس کا یہاں ذکر ضروری ہے یہ ہے کہ کیا اسلامی عرفان کی نوعیت بھی وہی ہے جو فقہ، اصول، تفسیر اور حدیث کی ہے یعنی کیا یہ بھی ان علوم میں سے ہے جن کا مواد مسلمانوں نے اسلام سے اخذ کیا ہے اور پھر اس کے قواعد و ضوابط اور اصول دریافت کیے ہیں یا اس کی نوعیت طب اور ریاضی کی سی ہے جو ابتداء میں اسلام سے باہر

جامعہ تعلیمات اسلامی

کی دنیا سے دنیائے اسلام میں آئے اور بعد میں مسلمانوں نے انہیں اپنے دامن تمدن میں ترقی دی اور نقطۂ عروج تک پہنچا دیا یا پھر کوئی تیسری صورت ہے۔

خود اہل عرفان پہلی شق کو اختیار کرتے ہیں اور کسی طرح کسی اور صورت کے قائل نہیں۔ بعض مستشرقین کا اصرار رہا ہے اور اب بھی ہے کہ عرفان اور معرفت کے لطیف اور دقیق خیالات دنیائے اسلام میں باہر سے آئے ہیں۔ وہ کبھی کہتے ہیں کہ عارفانہ خیالات کی اصل مسیحی ہے اور ان خیالات نے مسلمانوں میں ان کے عیسائی راہبوں سے میل جول کے نتیجے میں نفوذ کیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ عرفان و تصوف اسلام اور عربوں کے خلاف ایرانیوں کا ردعمل ہے۔ کبھی اسکو نو افلاطونی فلسفہ کی پیداوار بتلاتے ہیں۔ یہ نوافلاطونی فلسفہ خود ارسطو و افلاطون و فیثا غورث کی آراء اور یہودی و مسیحی عقائد کا ایک معجون مرکب ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ یہ بدھ مت کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ خود دنیائے اسلام میں بھی عرفان کے مخالفین یہ کوشش کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں کہ کسی طرح یہ ثابت کر دیں کہ عرفان اور تصوف کی اصل غیر اسلامی ہے اور اس کا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ عرفان کے عملی اور نظری دونوں پہلو بنیادی طور پر خود اسلام سے ماخوذ ہیں اور انھیں اصولوں کے مطابق اسکے قواعد و ضوابط اصولی طور پر مرتب کیے گئے ہیں۔ بعد میں اس پر بیرونی اثرات بھی پڑے ہیں خاص طور پر علمِ کلام اور فلسفہ نے اسے متاثر کیا نیز اشراقی فلسفہ کا بھی اس پر بہت اثر ہوا۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

رہی یہ بات کہ اہلِ عرفان اس میں کہاں تک کامیاب رہے کہ جو ابتدائی مواد انھوں نے اسلام سے اخذ کیا اسی کے مطابق صحیح قواعد و ضوابط مرتب کریں، اس سلسلے میں وہ اسی طرح کامیاب رہے ہیں جیسے فقہاء۔ اہلِ عرفان نے کس حد تک اس کی پابندی کی کہ وہ اسلام کے سچے اصول سے ہٹنے نہ پائیں اور کیا اسلامی عرفان پہ بیرونی اثر صرف معقول حد تک رہا؟ کیا اسلامی عرفان نے بیرونی اثرات کو اپنے اندر جذب کر کے انھیں اپنے رنگ میں رنگ کر ان سے فائدہ اٹھایا ہے یا اس کے برعکس ان بیرونی اثرات نے اسلامی عرفان کا رُخ موڑ دیا ہے؟

یہ سب سوال ایسے ہیں کہ ان پہ الگ سے بحث اور غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ اسلامی عرفان کا خمیر خود اسلام سے اٹھا ہے۔ پہلے نظریہ کے طرفداروں اور کم و بیش دوسرے نظریہ کے طرفداروں کا بھی یہی خیال ہے کہ اسلام ایک سادہ، بے تکلف اور عام فہم دین ہے اور اسے ہر طرح کے ابہام، پر اسرار مضامین اور سمجھ میں نہ آنے والی باتوں سے کوئی علاقہ نہیں۔

اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ اسلام میں توحید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر مکان کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے جو مکان سے بالکل الگ اور مختلف ہوتا ہے، اسی طرح اس جہان کا بھی ایک بنانے والا ہے جو اس جہان سے الگ ہے۔ اسلام کی نظر میں اس دنیا کے سامان اور مال و متاع کی بنیاد زہد پہ ہے۔

زہد کے معنی ہیں آخرت کی جاودانی نعمتوں کی خاطر دنیا کی متاعِ فانی

جامعہ تعلیمات اسلامی

کی طرف توجہ نہ کرنا۔ اس کے کچھ سیدھے سادے احکام ہیں جن پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ ان احکام کا بیان فقہ میں ہے۔

اس گروہ کی رائے ہے کہ عارفین نے توحید کا جو مطلب بتایا ہے وہ اسلامی توحید سے بہت دور اور مختلف ہے کیونکہ عرفان میں توحید کا مطلب ہے وحدتِ وجود یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور اسکے اسماء و صفات اور اس کی شئون و تجلیات کے سوا کسی چیز کا کوئی وجود نہیں۔

عرفان کا سیر و سلوک بھی اسلامی زہد سے مختلف چیز ہے۔ سیر و سلوک میں کئی ایسی چیزوں کا ذکر آتا ہے جن کا اسلامی زہد میں نام و نشان نہیں جیسے خدا سے عشق و محبت، خود کو خدا میں فنا کر دینا، عارف کے قلب پر خدا کی تجلّی وغیرہ۔

عرفان میں طریقت بھی شریعت سے مختلف چیز ہے۔ طریقت کے آداب میں جن مسائل سے بحث ہوتی ہے فقہ میں ان کا کہیں پتا نہیں۔

اس گروہ کی رائے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ نیک صحابہ کرام جن سے عرفاء و متصوفین اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں اور جن کو اپنا پیشرو تصور کرتے ہیں وہ صرف زاہد تھے۔ انکی روح عرفانی سیر و سلوک اور عرفانی توحید سے نا آشنا تھی۔ وہ دنیا کے ساز و سامان سے بے پروا اور عالم آخرت کی طرف متوجہ تھے۔ اصل میں ان کی روح پر خوف و رجاء کا جذبہ چھایا ہوا تھا، دوزخ کے عذاب کا خوف اور بہشت کے ثواب کی امید۔ بس اتنی ہی سی بات تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گروہ کا یہ نظریہ کسی طرح بھی قابلِ قبول

جامعہ تعلیمات اسلامی

نہیں ہے۔ اسلام کا ابتدائی مواد اس سے بہت زیادہ بھرپور ہے جتنا کہ ان لوگوں نے اپنی ناواقفیت سے یا قصداً فرض کر لیا ہے۔ نہ اسلامی توحید اس قدر سادہ اور کھوکھلی ہے جس قدر انھوں نے سمجھ لی ہے، نہ اسلام میں روحانیت زہدِ خشک تک محدود ہے، نہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نیک صحابہ کرام ویسے تھے جیسا کہ انھوں نے بیان کیا ہے اور نہ اسلامی آداب جسمانی اعمال تک محدود ہیں۔

ہم یہاں مختصر طور پر اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ اسلام کی اصل تعلیمات میں ایسے مضامین موجود ہیں جن سے نظری اور عملی عرفان دونوں سے متعلق بہت بلند علمی نکات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ مسلمان عارفوں اور صوفیوں نے کس حد تک ان تعلیمات سے صحیح طور پر استفادہ کیا ہے اور کس قدر غلطیاں کی ہیں تو اس مختصر تحریر میں اس پر بحث کی گنجائش نہیں۔

توحید کے بیان میں قرآن کریم نے کہیں خدا اور مخلوق کو مکان اور اس کے بنانے والے سے تشبیہ نہیں دی۔ قرآن تو خدا کو سارے عالم کا خالق کہتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ وہ مقدس ذات ہر جگہ اور ہر چیز کے ساتھ ہے۔

أَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ. "تم جدھر منہ کرو ادھر ہی خدا کا چہرہ ہے۔" وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْكُمْ مِنْكُمْ. "ہم تم سے زیادہ تمہارے نزدیک ہیں۔" هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ. "وہ سب سے اول ہے اور سب سے آخر یعنی ہر چیز کی ابتدا اسی سے ہوئی

اور انتہا اسی پر ہوگی)۔ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔"

صاف ظاہر ہے کہ اس طرح کی آیات ذہن کو عوام کی توحید سے بہتر اور برتر توحید کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ چنانچہ "کافی" کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو توحید کی گہرائی میں جائیں گے اس لیے اس نے سورۂ حدید کی ابتدائی آیات اور سورۂ توحید نازل فرمائی۔

سیر و سلوک اور قربِ حق کی منازل طے کرنے کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ ہم ان آیات کو پیشِ نظر رکھیں جن میں "لقاء اللہ" (لقائے الٰہی) اور "رضوان اللہ" (رضائے الٰہی) کا ذکر ہے۔ اسی طرح وہ آیات ہیں جن میں وحی و الہام کا بیان ہے یا ملائکہ کے انبیاء کے علاوہ دوسروں سے باتیں کرنے کا تذکرہ ہے جیسے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا سے۔ اس ضمن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج سے متعلق آیات خاص طور پر اہم ہیں۔

قرآن شریف میں نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ کا ذکر آیا ہے۔ علمِ لدنی اور مجاہدہ کے نتیجے میں ہدایت کی بات ہوئی ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ اسی طرح قرآن میں تزکیۂ نفس کو فلاح و رستگاری کا سبب بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔

قرآن مجید میں متعدد جگہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی محبت کو تمام انسانی محبتوں اور رشتوں سے بڑھ کر بتایا گیا ہے۔

قرآن میں ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور پھر اس انداز سے بات کہی گئی ہے جس سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم انسان اپنے "تفقّہ" کو کامل کرو تو ان کی تسبیح کو سمجھ سکو گے۔ اس کے علاوہ انسانی فطرت کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے اور اس طرح نفخۂ الٰہی کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ سب چیزیں انسان، جہان اور خدا کے درمیان وسیع اور عظیم روحانی رشتوں اور خصوصاً انسان اور خدا کے درمیان تعلق کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے کافی ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا سوال یہ نہیں ہے کہ مسلمان عارفوں نے اس سرمایہ سے کس طرح استفادہ کیا۔ صحیح طریقے سے یا غلط طریقے سے۔ بات صرف اس عظیم سرمایہ کے وجود کی ہے جو دنیائے اسلام میں نہایت عمدہ خیالات سجھانے کا سبب بن سکتا ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان لوگوں نے جو عارف کے نام سے مشہور ہیں اس سرمایہ سے صحیح استفادہ نہیں کیا۔ جب بھی کچھ دوسرے لوگوں نے جو اس نام سے مشہور نہیں، اس سرمایہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اس کے علاوہ اسلامی آثار و روایات، خطبوں، دعاؤں اور احتجاجوں[۱] وغیرہ سے اور اکابرین اسلام کے حالات سے یہ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ صدرِ اول میں صرف خشک زہد اور محض اجر و ثواب کی امید میں عبادت کرنا کافی نہیں تھا۔

---

[۱] علمائے اسلام کی وہ کتابیں جو انھوں نے غلط عقائد و نظریات پر بطور احتجاج لکھیں مثلاً احتجاج طبرسی۔

روایتوں، خطبوں، دعاؤں اور احتجاجوں میں بڑے عالی مضامین آئے ہیں۔ صدرِ اسلام کی بزرگ شخصیتوں کے حالات سے ان کی روحانی واردات، قلبی روشن بینی اور ان کے سوز و گداز اور روحانی عشق پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم یہاں صرف ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔

کافی میں لکھا ہے کہ ایک دن نماز کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ ایک ایسے نحیف و نزار نوجوان پر پڑی جس کا رنگ اڑا ہوا تھا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اور اسے اپنا توازن قائم رکھنا بھی مشکل تھا۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا حال ہے؟ اس نے کہا: میں یقین کی حالت میں ہوں۔ فرمایا: تمہارے یقین کی علامت کیا ہے؟

عرض کیا کہ یہ میرا یقین ہی ہے جس نے مجھے غم دیا ہے جو مجھے راتوں کو جگاتا ہے (شب بیداری) اور دن میں پیاسا رکھتا ہے (روزہ کی وجہ سے)۔ اس نے مجھے دنیا و مافیہا سے بیگانہ بنا دیا ہے یہاں تک کہ میں دیکھتا ہوں گویا کہ پروردگار کا عرش لوگوں کے حساب کتاب کے لیے نصب ہے۔ حشر کے میدان میں لوگ جمع ہیں۔ میں بھی انھیں میں شامل ہوں۔ یوں سمجھیے گویا میں جنتیوں کو جنت کے عیش و آرام میں اور دوزخیوں کو جہنم کے عذاب میں دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت بھی گویا میں اپنے کانوں سے آتشِ جہنم کی لپٹوں کی آواز سن رہا ہوں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ یہ شخص وہ ہے کہ جس کے دل کو اللہ تعالٰی نے نورِ ایمان سے

منور کر دیا ہے۔ پھر اس نوجوان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: اپنی اس حالت کی حفاظت کرو کہیں یہ سلب نہ ہو جائے۔

نوجوان نے کہا اللہ سے دعا کیجیے کہ مجھے شہادت نصیب فرمائے۔ زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ ایک غزوہ پیش آگیا۔ اس نوجوان نے اس میں شرکت کی اور شہید ہو گیا۔

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی، آپ کے حالات، اقوال اور دعائیں، روحانی جوش اور عرفانی اشارات سے پُر ہیں۔ عارف اکثر آپ کی دعاؤں کا حوالہ دیتے اور ان سے استناد کرتے ہیں۔

حضرت امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کے ملفوظات بھی روحانیت اور معرفت سے لبریز ہیں۔ تقریباً سب اہلِ عرفان وتصوف اپنے سلسلے آپ ہی سے ملاتے ہیں۔ ہم نہج البلاغہ کی دو عبارتیں پیش کرتے ہیں:

خطبہ نمبر ۲۲۰ میں آپ فرماتے ہیں:

"بے شک اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی یاد کو دلوں کے لیے صیقل بنایا ہے۔ اس کے ذریعے سے بہرے سننے لگتے ہیں، اندھے دیکھنے لگتے ہیں اور سرکش مطیع ہو جاتے ہیں۔ ہر زمانے اور ہر دور میں اللہ جل شانہٗ نے اپنے ایسے بندے پیدا کیے ہیں جن کے ذہنوں میں وہ اپنے راز ڈالتا ہے اور جن کی عقلوں کے ذریعے سے وہ ان سے بات چیت کرتا ہے۔"

خطبہ نمبر ۲۱۸ میں اہل اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"(اللہ والا) اپنی عقل کو زندہ کرتا ہے اور اپنے نفس کو مارتا ہے

جامع تعلیمات اسلامی

یہاں تک کہ جو چیز موٹی جھوٹی تھی وہ نرم ونازک بن جاتی ہے۔ اس کے سامنے بجلی کی طرح روشنی چمکتی ہے جو اسے راستا دکھاتی ہے اور اسے سالکِ راہِ خدا بناتی ہے۔ بہت سے دروازے اسے آگے کی طرف دھکیلتے ہیں یہاں تک کہ وہ سلامتی کے پھاٹک اور اس منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں اسے قیام کرنا ہے۔ اس کے پاؤں جمے ہوتے ہوتے ہیں اور اس کے بدن کو اطمینان حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے قلب کو کام میں لاتا ہے اور اپنے پروردگار کو خوش کرتا ہے۔"

اسلامی دعائیں خصوصاً ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کی تعلیم کردہ دعائیں معارف کا خزانہ ہیں۔ دعائے کمیل، دعائے ابوحمزہ ثمالی، مناجاتِ شعبانیہ اور صحیفۂ سجادیہ کی دعاؤں میں اعلیٰ ترین روحانی افکار موجود ہیں۔

کیا ان تمام سرچشموں کی موجودگی میں بھی اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم کسی اجنبی سرچشمہ کی تلاش میں سرگرداں ہوں؟ اسی قسم کے سوال کی نظیر تنقید و تعرض کی اس تحریک کے بارے میں بھی موجود ہے جو بزرگ صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانے کے جابروں کے خلاف چلائی تھی۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ظلم وجور اور امتیازی سلوک پر سخت اعتراض کیے تھے۔ اس کے نتیجہ میں انہیں تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اور آخر جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی اور اس جلاوطنی کی حالت میں وہ دنیا سے چلے گئے۔

کچھ مستشرقین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کا محرک

جامع تعلیمات اسلامی

کیا تھا؟ یہ لوگ حضرت ابوذر رضی کی تحریک کے لیے دنیائے اسلام سے باہر کے عوامل تلاش کرتے ہیں!!

ایک عرب عیسائی مصنف جارج جرداق اپنی کتاب "الامام علی صوتُ العدالۃ الانسانیہ" میں لکھتا ہے:

"مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کو دریا یا سمندر کے کنارے پر دیکھیں اور پھر سوچیں کہ اس شخص نے اپنا برتن کس ندی کے پانی سے بھرا ہے یعنی دریا اور سمندر کو تو نظر انداز کر دیں اور یہ کھوج لگانا شروع کر دیں کہ وہ پانی کس ندی سے لایا ہے۔"

پس اسلام کے سوا کوئی دوسرا سرچشمہ حضرت ابوذر رضی کا محرک نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلام کے سوا کونسا محرک ہو سکتا تھا جو ان کو معاویہ وغیرہ کے ظلم کے خلاف قیام پر آمادہ کر سکتا؟

بالکل یہی قصہ عرفان کا بھی ہے۔ مستشرقین اسلام کے علاوہ کسی اور سرچشمہ کی جستجو میں ہیں جسے عرفان کی روحانیت کا محرک قرار دے سکیں مگر وہ اسلام کے عظیم سرچشمہ کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم قرآن و حدیث، خطبہ و دعا اور سیرت کے سرچشموں کا اس لیے انکار کر دیں تاکہ مستشرقین اور ان کے مشرقی چیلوں کا مفروضہ درست ثابت ہو سکے؟

ابتداء میں تو مدعیانِ شرق شناسی کو یہ ضد تھی کہ اسلامی عرفان کا سرچشمہ اسلامی تعلیمات کے سوا کسی اور چیز کو ثابت کریں لیکن بعد میں

کچھ ایسے مستشرقین نے۔ جیسے انگریز مستشرق نکلسن یا فرانسیسی مستشرق ماسینیوں۔ جنھوں نے اسلامی عرفان و تصوف کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور جو اسلام سے بھی بے خبر نہیں تھے، صاف اعتراف کر لیا کہ اسلامی عرفان کا سرچشمہ قرآن و سنت ہی ہے۔

اس جگہ ہم نکلسن کے کچھ فقرے نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

ہم قرآن میں دیکھتے ہیں کہ خدا کہتا ہے:

۱۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)

۲۔ وہی اول ہے وہی آخر (ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ)

۳۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں (لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ)

۴۔ اس کے سوا ہر چیز فانی ہے (کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ)

۵۔ میں نے انسان میں اپنی روح پھونکی (وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ)

۶۔ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی روح اس سے کیا کہتی ہے کیونکہ ہم اس سے اس کی رگ گردن سے زیادہ نزدیک ہیں (اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ)

۷۔ تم جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا ہے (اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ)۔

۸۔ جس کو خدا نے روشنی نہیں دی، اس کے لیے کوئی روشنی نہیں (وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان آیات میں عرفان کی جڑیں پیوستہ ہیں۔ ابتدائی عرفاء کے لیے قرآن صرف خدا کا کلام ہی نہیں تھا بلکہ اسے خدا کا

جامعہ تعلیمات اسلامی

تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ عبادت اور قرآنی آیات پر غور و خوض کے ذریعے سے خصوصاً ان آیات پر جن میں معراج کی طرف اشارہ ہے، صوفیہ کوشش کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔

تصوف میں وحدت کا جو اصول ہے اس کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک حدیث قدسی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: "جب میرا بندہ عبادت اور نیک اعمال کے ذریعے سے میرے نزدیک آجاتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے' اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے[1]

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں' سوال یہ نہیں ہے کہ آیا عارفوں نے ان آیات اور آثار و روایات سے صحیح استفادہ کیا ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ عارفانہ خیالات کا ماخذ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔

مختصر تاریخچہ

صحیح اسلامی افکار اور روحانی تجلیات سے بریز پیشوایان اسلام کی زندگی جس نے دنیائے اسلام میں عمیق روحانیت کو جنم دیا ہے کچھ اس

---

[1] میراث اسلام (فارسی) اسلام کے بارے میں مستشرقین کا مجموعہ صفحہ ۸۴

چیز کے ساتھ مخصوص نہیں جسے اصطلاحاً عرفان یا تصوف کہا جاتا ہے۔

ہم یہاں کوشش کریں گے کہ علمی نقطۂ نگاہ سے معارف اسلامی کی اس شاخ پر جو کچھ گزری ہے اس کی ہو بہو تشریح کر دیں۔ اس مقصد کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب سے پہلے عرفان اور تصوف کی پہلی صدی ہجری سے کم از کم دسویں صدی ہجری تک کی مختصر تاریخ بیان کریں۔ اس کے بعد جہاں تک گنجائش ہو گی عرفان کے مسائل سے بحث کریں گے اور پھر ان مسائل کا کچھ تجزیہ پیش کریں گے۔

یہ تو مسلّم ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اور کم از کم پہلی صدی ہجری میں عارف یا صوفی نام کا کوئی گروہ مسلمانوں میں موجود نہیں تھا۔ صوفی کا لفظ دوسری صدی ہجری میں وجود میں آیا۔

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ابو ہاشم کوفی کو اس نام سے پکارا گیا۔ ابو ہاشم دوسری صدی میں گزرے۔ ابو ہاشم ہی نے فلسطین کے مقام رملہ میں مسلمان عابدوں اور زاہدوں کی ایک جماعت کی عبادت کے لیے ایک خانقاہ (صومعہ) بنائی[1]۔ یہ تو صحیح معلوم نہیں کہ ابو ہاشم کب فوت ہوئے مگر وہ سفیان ثوری کے استاد تھے جو ۱۶۱ھ میں فوت ہوئے۔

---

[1] ڈاکٹر قاسم غنی نے اپنی کتاب "تاریخ تصوف در اسلام" کے صفحہ ۱۹ میں ابن تیمیہ کی کتاب "صوفیہ و فقراء" کے صفحہ ۲۴ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے صوفیہ کے لیے ایک چھوٹی سی خانقاہ قائم کی وہ عبدالواحد بن زید کے ایک مرید تھے۔ عبدالواحد حسن بصری کے اصحاب میں سے ہیں۔ اگر ابو ہاشم صوفی، عبدالواحد کے پیروکاروں میں سے ہوں تو ان دونوں روایتوں میں کوئی تناقض نہیں رہتا۔

مشہور عارف وصوفی ابوالقاسم قشیری کہتے ہیں کہ صوفی کا لفظ ۲۰۰ھ سے قبل رائج نہیں تھا۔ نکلسن بھی یہی کہتا ہے کہ یہ نام دوسری صدی ہجری کے اواخر میں وجود میں آیا۔ کافی جلد پنجم کی کتاب المعیشۃ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں یعنی دوسری صدی کے پہلے نصف میں کچھ لوگ جن میں سفیان ثوری بھی شامل تھے، صوفی کہلاتے تھے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ ابو ہاشم کوفی پہلے شخص تھے جو صوفی کہلائے اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) کے استاد تھے، تو یہ نام دوسری صدی ہجری کے نصف اول ہی میں رائج ہو گیا تھا نہ کہ دوسری صدی کے اواخر میں جیسا کہ نکلسن وغیرہ کہتے ہیں۔ بظاہر اس میں بھی شبہ نہیں کہ صوفی اس لیے صوفی کہلائے کہ وہ صوف یا اون کا لباس پہنتے تھے۔

صوفیہ اپنے زہد اور ترک دنیا کے سبب سے نرم لباس سے اجتناب کرتے تھے اور خاص طور پر اون کا موٹا جھوٹا لباس پہنتے تھے۔

مگر یہ لوگ کب سے اپنے آپ کو عارف کہلانے لگے، اس کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اتنی بات یقینی ہے او رسری سقطی متوفی ۲۴۳ھ کے ملفوظات سے معلوم ہوتی ہے (تذکرۃ الاولیا شیخ عطار) کہ یہ اصطلاح تیسری صدی ہجری میں رائج ہو چکی تھی لیکن ابو نصر سراج طوسی کی کتاب اللمع (صفحہ ۲۲) میں جو تصوف کی ایک معتبر کتاب ہے سفیان ثوری کا ایک قول منقول ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوئی۔

بہر حال پہلی صدی ہجری میں صوفی نام کا کوئی گروہ موجود نہیں تھا۔
یہ نام دوسری صدی ہجری میں وجود میں آیا اور بظاہر اسی صدی میں صوفیوں نے ایک خاص "گروہ" کی شکل اختیار کرلی۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ تیسری صدی کا واقعہ ہے صحیح نہیں ہے (تاریخ تصوف در اسلام ڈاکٹر غنی)۔

پہلی صدی ہجری میں ہرچند کہ کوئی خاص جماعت صوفی یا عارف یا ایسے ہی کسی دوسرے نام سے موجود نہیں تھی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ممتاز صحابہؓ صرف زاہد و عابد ہی تھے۔ وہ محض ایک ہی طرح کا سادہ ایمان رکھتے تھے اور ان کی کوئی روحانی زندگی نہیں تھی۔

شاید بعض نیک اور اچھے صحابہؓ صرف عابد و زاہد ہی تھے لیکن کچھ صحابہؓ روحانی زندگی سے بھی مالا مال تھے۔ یہ بھی سب ایک درجہ پر نہیں تھے۔ یہاں تک کہ حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہم بھی ایمان کے ایک درجہ پر نہیں تھے۔ حضرت سلمانؓ ایمان کا جو درجہ رکھتے تھے وہ حضرت ابوذرؓ کے لیے قابلِ برداشت نہیں تھا۔

متعدد احادیث میں آیا ہے لَوْ عَلِمَ اَبُوْذَرٍّ مَا فِیْ قَلْبِ سَلْمَانَ لَقَتَلَہٗ[1]۔ اگر ابوذرؓ کو معلوم ہوتا کہ سلمانؓ کے دل میں کیا ہے تو انہیں (کافر سمجھ کر) قتل کر دیتے۔

اب ہم دوسری صدی سے دسویں صدی تک کے عرفاء اور صوفیہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔

---

[1] سفینۃ البحار از محدث قمی، مادہ سلم

جامع تعلیمات اسلامی

دوسری صدی کے عارف

علم کلام کی طرح اصطلاحی عرفان و تصوف کی تاریخ بھی حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ ہجری سے شروع ہوتی ہے۔

حسن بصری ۲۲ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ۸۸ سال کی عمر پائی۔ ان کی نوے فیصد عمر پہلی صدی میں گزری۔

حسن بصری "صوفی" نہیں کہلاتے تھے۔ ان کا شمار صوفیہ میں اس لیے ہوتا ہے کہ انھوں نے "رعایۃ حقوق اللہ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جو تصوف پر پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اس کتاب کا واحد نسخہ آکسفورڈ کی لائبریری میں ہے۔ نکلسن کہتا ہے:

حسن بصری پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے صوفی طریقۂ زندگی کے بارے میں لکھا۔ مقامات عالیہ تک پہنچنے کے لیے تصوف کا جو طریقہ بعد کے مصنفین نے تجویز کیا ہے وہ ہے اول توبہ اور اس کے بعد مختلف دوسرے اعمال جن میں سے ہر عمل ایک مقام سے دوسرے بالاتر مقام پر پہنچنے کے لیے کیا جاتا ہے۔[۱]

دوسری بات یہ ہے کہ خود صوفیہ طریقت کے بعض سلسلوں کو جیسے مثلاً ابوسعید ابوالخیر[۲] کے مشائخ کا سلسلہ حسن بصری تک اور ان کے واسطے سے حضرت

---

۱ میراث اسلام صفحہ ۸۵

۲ تاریخ تصوف در اسلام از ڈاکٹر قاسم غنی صفحہ ۶۲۴ منقول از کتاب "حالات وسخنان ابوسعید ابوالخیر"

جامعہ تعلیمات اسلامی

امیرالمومنین امام علی علیہ السلام تک پہنچاتے ہیں۔ ابن ندیم اپنی کتاب الفہرست کے فن پنجم، مقالہ پنجم میں ابو محمد جعفر خلدی کا سلسلہ حسن بصری تک لے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حسن بصری نے اصحاب بدر میں سے ستر صحابہ کا زمانہ پایا تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ بعض حکایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بصری عملاً ایک ایسے گروہ میں شامل تھے جس نے بعد میں متصوفہ کا نام پایا۔ ہم ان میں سے بعض حکایات نقل کریں گے۔

مالک بن دینار : یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے زہد اور ترک لذات میں بہت مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے بہت سے قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ ۱۳۵ھ ہجری میں فوت ہوئے۔

ابراہیم بن ادہم : ان کا قصہ مشہور ہے جو مہاتما بدھ کے قصہ سے ملتا جلتا ہے۔ ابتداء میں بلخ کے حکمران تھے۔ پھر کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ تائب ہو کر اہل تصوف کے سلسلے سے منسلک ہو گئے۔

عرفاء و صوفیہ ابراہیم بن ادہم کو بہت اہمیت دیتے ہیں مثنوی مولانا روم میں ان کا قصہ بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے تقریباً ۱۶۱ھ ہجری میں انتقال کیا۔

رابعہ عدویہ : یہ عجائب روزگار خاتون تھیں۔ چونکہ اپنے خاندان میں چوتھی بیٹی تھیں اس لیے رابعہ نام رکھا گیا۔ رابعہ عدویہ اور ہیں اور رابعہ شامیہ اور۔ رابعہ شامیہ کا شمار بھی صوفیہ میں ہوتا ہے۔ وہ جامی کی ہم عصر اور نویں صدی کی خاتون ہیں۔

رابعہ عدویہ کے ملفوظات بہت بلند پایہ اور ان کے اشعار معرفت کا شاہکار ہیں۔ ان کے احوال و واقعات بہت عجیب ہیں۔

ابوہاشم صوفی کوفی: ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ کے استاد تھے۔ بظاہر یہی پہلے شخص تھے جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سفیان ثوری کا قول ہے: اگر ابوہاشم نہ ہوتے تو میں ریا کی باریکیاں نہ سمجھ سکتا۔

شقیق بلخی: ابراہیم بن ادہم کے مرید اور شاگرد تھے۔ ریحانۃ الادب میں علی بن عیسیٰ اربلی کی کتاب کشف الغمہ اور شبلنجی کی کتاب نورالابصار سے منقول ہے کہ مکہ کے راستے میں ان کی امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان سے امام علیہ السلام کے مقام اور کرامات کے بارے میں روایات منقول ہیں۔ ان کی وفات کا سال ۱۵۳ یا ۱۷۴، یا ۱۸۴ ہجری ہے۔

معروف کرخی: یہ مشہور و معروف عارفین میں سے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کے والدین عیسائی تھے اور یہ خود حضرت امام رضا علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور ان سے استفادہ کیا تھا۔ طریقت کے بہت سے سلسلے، صوفیہ کے دعوے کے مطابق معروف کرخی تک اور ان سے امام رضاؑ تک اور حضرت کے واسطے سے ائمہؑ علیہم السلام تک اور ان سے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس سلسلے کو سلسلۃ الذہب (رشتۂ طلائی) کہتے ہیں۔ کم از کم اس سلسلہ کے متوسلین یہی دعویٰ کرتے ہیں۔

جامع تعلیمات اسلامی

فضیل بن عیاض: یہ اصلاً مرو کے رہنے والے عربی النسل ایرانی تھے۔ کہتے ہیں کہ ابتداء میں رہزن تھے۔ ایک رات بری نیت سے ایک دیوار پر چڑھے۔ ایک شب زندہ دار سے قرآن کی آیت سن کر حالت بدل گئی اور توبہ کرلی۔ کتاب مصباح الشریعہ ان سے منسوب ہے کہتے ہیں کہ یہ کتاب اسباق کا ایک سلسلہ ہے جو انہوں نے امام جعفر صادقؑ سے لیے تھے۔

پچھلی صدی کے متبحر محدث مرحوم حاجی مرزا حسین نوری نے اپنی کتاب مستدرک کے خاتمہ پر اس کتاب پر اعتماد کا اظہار کیا ہے فضیل بن عیاض کا سال وفات ۱۸۷ ہجری ہے۔

تیسری صدی کے عارف

بایزید بسطامی (طیفور بن عیسیٰ): اکابر صوفیہ میں سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے صاف الفاظ میں فناء فی اللہ کی بات کی۔

بایزید بسطامی نے ایک دفعہ کہا کہ: میں بایزیدی سے اس طرح نکل گیا ہوں جس طرح سانپ کینچلی سے نکل جاتا ہے بایزید کی شطحیات کی وجہ سے کچھ لوگوں نے ان کی تکفیر بھی کی ہے۔ خود صوفیہ کہتے ہیں کہ وہ اصحاب سکر میں سے تھے یعنی انہوں نے وہ باتیں جذب و بے خودی کے عالم میں کہی ہیں جن میں بظاہر خلافِ اسلام اور غلط دعوے کیے گئے ہیں۔

بایزید ۲۶۱ ہجری میں فوت ہوئے۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے یہاں سقے کا کام کرتے تھے لیکن یہ بات تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ انہوں نے امام جعفر صادقؑ کا زمانہ نہیں پایا۔

بشر حافی: مشاہیر صوفیہ میں سے ہیں۔ یہ بھی شروع میں اہلِ فسق و فجور میں سے تھے۔ بعد میں تائب ہو گئے۔

علامہ حلی علیہ الرحمۃ نے منہاج الکرامہ میں ایک قصہ نقل کیا ہے جس کے مطابق انھوں نے حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کے دستِ حق پرست پر توبہ کی۔ چونکہ توبہ کے وقت ننگے پاؤں تھے اس لیے بشر حافی یعنی بشر پا برہنہ مشہور ہو گئے۔ کچھ لوگ حافی کی وجہ تسمیہ کچھ اور بتلاتے ہیں۔ بشر حافی ۲۲۶ھ یا ۲۲۷ھ ہجری میں فوت ہوئے۔

سری سقطی: بشر حافی کے دوستوں اور ساتھیوں میں سے تھے۔ سری سقطی خلقِ خدا پر بہت مہربان تھے اور سب کے لیے ایثار کرتے تھے۔

ابنِ خلکان نے "وفیات الاعیان" میں لکھا ہے کہ سری نے ایک دفعہ کہا کہ تیس سال ہوئے میں نے ایک دفعہ الحمد للہ کہہ دیا تھا۔ آج تک اس کے لیے استغفار کر رہا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا: وہ کیسے؟ کہنے لگے کہ ایک رات بازار میں آگ لگ گئی۔ میں باہر نکلا کہ دیکھوں آگ میری دکان تک تو نہیں پہنچ گئی۔ مجھ سے کسی نے کہا کہ تمہاری دکان تک آگ نہیں پہنچی۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا: الحمد للہ۔ مجھے فوراً تنبیہ ہوا کہ ٹھیک ہے میری دکان کو نقصان نہیں پہنچا لیکن کیا مجھے دوسرے مسلمانوں کی فکر نہیں ہونا چاہیے تھی؟

سعدی نے یہ قصہ تھوڑے سے فرق سے بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں: ایک رات مخلوق کی آہوں کے دھوئیں سے آگ لگ گئی۔ میں نے سنا ہے کہ اس آگ سے آدھا بغداد جل گیا۔ جب یہ تباہی مچ رہی تھی ایک

جامعہ تعلیمات اسلامی

شخص نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے مکان کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس پر ایک جہاندیدہ شخص بول اٹھا کہ اے بوالہوس! کیا تجھے صرف اپنا ہی غم ہے؟ تو چاہتا ہے کہ چاہے سارا شہر جل جائے مگر تیرا مکان محفوظ رہے۔

سری معروف کرخی کے شاگرد اور مرید اور جنید بغدادی کے پیر اور ماموں تھے۔ ان سے توحید اور عشق الٰہی کے بارے میں بہت سے اقوال منقول ہیں۔ انھیں کا قول ہے کہ عارف آفتاب کی طرح سارے عالم پر چمکتا ہے اور زمین کی طرح نیک و بد کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا ہے۔ وہ پانی کی طرح ہے جس پر تمام دلوں کی زندگی کا مدار ہے۔ آگ کی طرح اسکی روشنی سب تک پہنچتی ہے۔

سری سقطی نے ۲۴۵ھ یا ۲۵۰ھ میں ۹۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حارث محاسبی: جنید بغدادی کے دوستوں اور ساتھیوں میں سے تھے۔ انہیں محاسبی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مراقبہ اور نفس کے محاسبہ کا کمال درجہ اہتمام کرتے تھے۔ احمد بن حنبل کے ہمعصر تھے۔ احمد بن حنبل چونکہ علم کلام کے مخالف تھے اور محاسبی کو علم کلام میں شغف تھا اس لیے احمد بن حنبل نے محاسبی کو دھتکار دیا۔ اسی بنا پر لوگ محاسبی سے بددل ہو گئے۔ حارث محاسبی ۲۴۳ ہجری میں فوت ہوئے۔

جنید بغدادی: اصلاً نہاوند کے رہنے والے تھے۔ صوفیہ انہیں سید الطائفہ کہتے ہیں، جیسے شیعہ فقہاء شیخ طوسی علیہ الرحمۃ کو شیخ الطائفہ کہتے ہیں۔

جنید معتدل صوفی سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے ایسی شطحیات بھی منقول نہیں جیسی اوروں سے منقول ہیں۔ وہ اہل تصوف کا لباس بھی نہیں پہنتے

تھے۔ علماء و فقہاء کے لباس میں رہتے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ دوستوں کی خاطر ہی اہل تصوف کا خرقہ پہن لیجیے۔ کہنے لگے: اگر میں سمجھتا کہ لباس سے کچھ کام بن سکتا ہے تو میں پگھلے ہوئے لوہے کے کپڑے پہن لیتا مگر حقیقت کی پکار یہ ہے کہ لَیْسَ الْاِعْتِبَارُ بِالْخِرْقَۃِ اِنَّمَا الْاِعْتِبَارُ بِالْحُرْقَۃِ یعنی خرقہ سے کچھ نہیں ہوتا، سوزِ دل کی ضرورت ہے۔ جنید، سری سقطی کے بھانجے، مرید اور شاگرد تھے۔ حارث محاسبی کے بھی شاگرد تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ ۲۹۷ھ ہجری میں فوت ہوئے۔

ذوالنون مصری: مصر کے رہنے والے تھے۔ فقہ میں مشہور فقیہ مالک بن انس کے شاگرد تھے۔ جامی ان کو رئیس صوفیہ کہتے تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تصوف کے مسائل رمز و کنایہ کی اصطلاحات میں بیان کیے تاکہ جو واقف ہیں وہی سمجھ سکیں اور اغیار کچھ نہ سمجھیں۔

آہستہ آہستہ یہی طریقہ رائج ہو گیا۔ مسائل تصوف غزل کی صورت میں یا رمز و کنایہ کے پردے میں بیان ہونے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نو افلاطونی فلسفہ ذوالنون ہی کے ذریعے سے تصوف میں داخل ہوا۔[1] ذوالنون ۲۴۰ھ اور ۲۵۰ھ ہجری کی درمیانی مدت میں فوت ہوئے۔

سہل بن عبداللہ تستری: آپ کا شمار صوفی اکابرین میں ہوتا ہے۔ صوفیہ کا ایک فرقہ جو اس بات کا قائل ہے کہ اصل چیز نفس کا مجاہدہ ہے۔ انہیں کے نام پر "سہلیہ" کہلاتا ہے۔ مکہ معظمہ میں ان کی ملاقات ذوالنون مصری سے رہی۔ ۲۸۳ھ یا ۲۹۳ھ ہجری میں وفات پائی۔[2]

---

[1] تاریخ تصوف در اسلام صفحہ ۵۵ [2] طبقات الصوفیہ ابوعبدالرحمٰن سلمی صفحہ ۲۰۶۔

حسین بن منصور حلاج : اسلامی دور کے صوفیہ میں ان کی شخصیت سب سے زیادہ نزاعی ہے ۔ ان سے بکثرت شطحیات منقول ہیں۔ ان پر کفر و ارتداد اور خدائی دعویٰ کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ فقہاء نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا عباسی خلیفہ مقتدر کے زمانے میں انہیں دار پر لٹکا دیا گیا۔ خود صوفیہ بھی ان پر اسرار فاش کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ حافظ کہتے ہیں

گفت آں یار کز و گشت سر دار بلند
جُرمش آں بود کہ اسرار ہویدا می کرد

بعضوں کا خیال ہے کہ وہ ایک شعبدہ باز انسان تھے۔ صوفیہ انکی صفائی پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے اور بایزید کے جن اقوال سے کفر کی بو آتی ہے وہ سکر و بیخودی کے عالم میں کہے گئے ہیں۔

صوفیہ انہیں شہید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حلاج کو ۳۰۶ یا ۳۰۹ ہجری میں تختۂ دار پہ لٹکا دیا گیا[۱]

چوتھی صدی کے عارف

ابوبکر شبلی : جنید بغدادی کے شاگرد اور مرید تھے۔ حلاج سے بھی ملاقات تھی۔ مشاہیر صوفیہ میں سے ہیں۔ اصلاً خراسان کے رہنے والے تھے ۔ روضات الجنات اور دوسرے تذکروں میں ان کے اشعار اور صوفیانہ اقوال بکثرت نقل ہوئے ہیں۔

---

[۱] استاد مطہری نے اپنی کتاب "علل گرائش بہ مادیگری" کے مقدمے میں بعض مادہ پرستوں کے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ منصور حلاج مادہ پرست تھے۔

جامع تعلیمات اسلامی

خواجہ عبداللہ انصاری نے کہا ہے: سب سے پہلے ذوالنون مصری نے رمز و کنایہ میں بات کی۔ جنید نے آکر اس علم کو مرتب کیا، مزید تسنی دی، اور اس علم میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جب نوبت شبلی تک پہنچی تو انہوں نے اس علم کو منبروں تک پہنچا دیا۔ شبلی نے ۳۳۴ھ اور ۳۳۷ھ ہجری کی درمیانی مدت میں، ۸۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ابو علی رودباری: ساسانی نسل سے تھے۔ خود کو نوشیرواں کی اولاد کہتے تھے۔ جنید بغدادی کے مرید تھے۔ ابوالعباس بن شریح سے فقہ کی اور ثعلب سے ادبیات کی تعلیم حاصل کی۔ ان کو شریعت، طریقت اور حقیقت کا جامع کہا جاتا ہے۔ ۳۲۲ھ ہجری میں فوت ہوئے۔

ابو نصر سراج طوسی: مشہور کتاب اللمع کے مصنف ہیں جو تصوف کی قدیم اور معتبر کتابوں میں سے ہے۔ ۳۷۸ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ بہت سے مشائخ طریقت ان کے بلاواسطہ یا بواسطہ شاگرد تھے۔

ابوالفضل سرخسی: ابو نصر سراج کے شاگرد اور مرید اور مشہور عارف ابو سعید ابوالخیر کے استاد اور پیر تھے۔ ۴۰۰ھ ہجری میں فوت ہوئے۔

ابو عبداللہ رودباری: ابو علی رودباری کے بھانجے تھے۔ شام کے مشاہیر صوفیہ میں شمار تھا۔ ۳۹۶ھ ہجری میں وفات پائی۔

ابو طالب مکی: ان کی بیشتر شہرت ایک کتاب کی وجہ سے ہے جو انہوں نے علم تصوف میں تالیف کی تھی۔ اس کتاب کا نام "قوت القلوب" ہے جو چھپ گئی ہے اور اس کا شمار تصوف کی قدیم اور بہت معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ ابو طالب مکی نے ۳۸۵ھ یا ۳۸۶ھ ہجری میں انتقال کیا۔

جامع تعلیمات اسلامی

جامع تعلیمات اسلامی

پانچویں صدی کے عارف

شیخ ابوالحسن خرقانی: مشہور ترین صوفیہ میں سے ہیں۔ صوفیہ حیرت انگیز داستانیں ان سے منسوب کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بایزید بسطامی کی قبر پہ جا کر بایزید کی روح سے رابطہ پیدا کیا تھا اور اپنی مشکلات ان سے حل کرائی تھیں۔ مولانا رومی کہتے ہیں:

بوالحسن بعد از وفاتِ بایزید
از پسِ آں سالہا آمد پدید
گاہ و بیگہ نیز رفتے بے فتور
بر سرِ گورش نشستے با حضور
تا مثالِ شیخ پیشش آمدے
تا کہ می گفتے شکالش حل شدے

(بایزید کی وفات کے برسوں بعد ابوالحسن وقتاً فوقتاً ان کی قبر پہ جا کر بیٹھتے اور متوجہ ہوتے تھے یہاں تک کہ شیخ کی شبیہہ نے سامنے آکر انکی مشکلات حل کر دیں)۔

مولانا رومی نے اپنی مثنوی میں جگہ جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رومی کو ابوالحسن خرقانی سے واقعی عقیدت تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشہور فلسفی بو علی سینا اور مشہور عارف ابو سعید ابوالخیر سے ان کی ملاقات تھی۔ سنہ ۴۲۵ ہجری میں فوت ہوئے۔

ابو سعید ابوالخیر: مشہور ترین صوفیہ میں سے ہیں۔ عمدہ احوال کے حامل تھے۔

جامع تعلیمات اسلامی

ان کی رباعیاں بڑی شستہ ہیں۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ تصوف کیا ہے؟ کہا کہ تصوف یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے سر میں ہو اسے نکال دو، جو ہاتھ میں ہو وہ دیدو اور جو ہو سکے کوشش کرو۔ بو علی سینا سے ملاقات تھی۔ ایک دن بو علی سینا نے ابو سعید کی مجلسِ وعظ میں شرکت کی۔ ابو سعید عمل کی ضرورت اور طاعت و معصیت کے بارے میں بیان کر رہے تھے۔ بو علی نے یہ رباعی پڑھی۔

ماییم بعفو تو تولّا کردہ
و ز طاعت و معصیت تبرّا کردہ
آنجا کہ عنایتِ تو باشد باشد
ناکردہ چو کردہ، کردہ چوں ناکردہ

(ہم تو تیرے عفو سے محبت کرتے اور اسی پہ بھروسا کرتے ہیں۔ طاعت و معصیت سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ جہاں تیرا کرم ہو وہاں کردہ اور ناکردہ سب اعمال برابر ہیں)۔

ابو سعید نے فوراً کہا:

بر عفو مکن تکیہ کہ ہرگز نبود
ناکردہ چو کردہ، کردہ چوں ناکردہ

(معافی کے بھروسے پہ مت رہو۔ کیونکہ جو کچھ کیا ہوا ہوتا ہے اسے ناکردہ نہیں سمجھنا چاہیے اور جو کچھ ناکردہ ہو اسے کیا ہوا نہیں سمجھنا چاہیے)[1]

ابو سعید ابو الخیر کا انتقال ۴۴۰ھ ہجری میں ہوا۔

---

[1] نامۂ دانشوران، احوال بو علی سینا کے ذیل میں۔

ابو علی دقاق نیشاپوری: شریعت و طریقت کے جامع شمار ہوتے ہیں۔ واعظ اور مفسر تھے۔ چونکہ ان کی مناجاتوں میں گریہ بہت ہے اس لیے انکا لقب شیخ نوحہ گر ہوگیا۔ سنہ ۴۰۵ یا سنہ ۴۱۲ ہجری میں فوت ہوئے۔

ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری: کتاب کشف المحجوب کے مصنف ہیں جو تصوف کی مشہور کتاب ہے۔ حال میں چھپ گئی ہے۔ سنہ ۴۷۰ ہجری میں فوت ہوئے۔

خواجہ عبداللہ انصاری: معروف ترین اور بڑے عبادت گزار صوفیہ میں سے تھے۔ ان کے مختصر فقرے' مناجاتیں اور شستہ و بامزہ رباعیاں موجود ہیں اور خواجہ عبداللہ کی شہرت زیادہ تر انھیں کی وجہ سے ہے۔

ان کا ایک ملفوظ ہے: "در طفلی پستی' در جوانی مستی' در پیری سستی' پس کے خدا پرستی؟" ایک اور ملفوظ ہے: "بدی را بدی کردن سگساری است' نیکی را نیکی کردن خرخاری است' بدی را نیکی کردن کار خواجہ عبداللہ انصاری است۔"

یہ رباعی بھی انھیں کی ہے:

عیب است بزرگ برکشیدن خود را
از جملۂ خلق برگزیدن خود را
از مردمکِ دیدہ باید آموخت
دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

(ڈُوں کی لینا اور سب سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا بہت بری بات ہے۔ آنکھ کی پتلی سے سبق سیکھنا چاہیے جو سب کو دیکھتی ہے مگر خود کو نہیں دیکھتی)

خواجہ عبداللہ ہرات میں پیدا ہوئے اور وہیں سنہ ۴۸۱ھ میں انتقال کیا۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

اسی وجہ سے پیر ہرات کے نام سے مشہور ہیں۔

خواجہ عبداللہ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں - ان کی سب سے مشہور کتاب "منازل السائرین" ہے جو تصوف کی درسی کتاب ہے اور سیر و سلوک پر بلند پایہ تصنیف ہے۔ اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

ابو حامد محمد غزالی : معروف ترین علمائے اسلام میں سے ہیں۔ شرق سے غرب تک ان کی شہرت کا آوازہ بلند ہے۔ جامع معقول و منقول تھے۔ جامعہ نظامیہ بغداد کے رئیس الجامعہ اور اپنے زمانہ کے اعلیٰ ترین مذہبی عہدہ پر فائز رہے لیکن انھوں نے یہ محسوس کیا کہ نہ ان کا علم ان کے روحانی اطمینان کے لیے کافی ہے اور نہ ان کا منصب۔ چنانچہ وہ روپوش ہو کر تہذیب و تصفیہ نفس میں مشغول ہو گئے۔

دس سال بیت المقدس میں اپنے جاننے والوں سے دور گزارے۔ انھیں ایام میں ان کی توجہ تصوف اور عرفان کی طرف ہو گئی۔ پھر آخری عمر تک کوئی منصب اور عہدہ قبول نہیں کیا۔ ریاضت میں ایک مدت گزارنے کے بعد اپنی مشہور کتاب "احیاء العلوم الدین" تالیف کی۔ ۵۰۵ھ میں اپنے اصل وطن طوس میں وفات پائی۔

چھٹی صدی کے عارف

عین القضاۃ ہمدانی : بڑے جوشیلے صوفیوں میں سے ہیں۔ محمد غزالی کے چھوٹے بھائی احمد غزالی کے مرید تھے۔ احمد غزالی بھی صوفیہ میں سے

ہیں۔ انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے اشعار پر لطف اور خوشنما ہیں لیکن شطحیات سے خالی نہیں۔ اسی بنا پر ان پر کفر کا فتویٰ لگا اور قتل کیے گئے۔ لاش کو جلا کر خاک کو برباد کر دیا گیا۔ ۵۲۵ھ اور ۵۳۳ھ ہجری کی درمیانی مدت میں قتل ہوئے۔

سنائی غزنوی: مشہور شاعر ہیں۔ ان کے اشعار میں تصوف کے دقیق مسائل کا بیان ہے۔ مولانا رومی نے اپنی مثنوی میں انکے اقوال پیش کیے ہیں اور ان کی شرح کی ہے۔ چھٹی صدی کے نصف اول میں فوت ہوئے۔

احمد جامی: ژندہ پیل کے نام سے مشہور ہیں۔ مشہور عارفوں اور صوفیوں میں سے ہیں۔ ان کی قبر ایران و افغانستان کی سرحد کے نزدیک تربتِ جام نامی قصبہ میں ہے۔ اپنی اس دو بیتی میں خوف و رجاء کا مضمون باندھا ہے:

غرہ مشو کہ مرکب مردان مرد را
در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندانِ جرعہ نوش
ناگہ بیک ترانہ بہ منزل رسیدہ اند

احمد جامی سنہ ۵۳۶ھ ہجری کے قریب فوت ہوئے۔

عبد القادر گیلانی: دنیائے اسلام کی اختلافی شخصیت ہیں۔ صوفیہ کا سلسلۂ قادریہ انہیں سے منسوب ہے۔ ان کی قبر بغداد میں مشہور و معروف ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن سے اول اول بلند بانگ دعوے نقل کیے گئے۔ سادات حسنی میں سے ہیں سنہ ۵۶۰ھ یا سنہ ۵۶۱ھ ہجری میں فوت ہوئے۔

جامع تعلیمات اسلامی

شیخ روزبہان بقلی شیرازی: "شیخ شطاح" کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ شطحیات زیادہ کہتے تھے۔ حال ہی میں ان کی بعض کتابیں مستشرقین نے چھاپ کر شائع کی ہیں۔ ۶۰۶ھ ہجری میں انتقال کیا۔

ساتویں صدی کے عارف

اس صدی میں بھی بہت سے بلند پایہ صوفی گزرے ہیں۔ ہم ان میں سے چند ایک کا انکے سالِ وفات کی ترتیب کے لحاظ سے تذکرہ کرتے ہیں:

شیخ نجم الدین کبریٰ: مشاہیر و اکابر صوفیہ میں سے ہیں۔ صوفیہ کے بہت سے سلسلے ان سے چلتے ہیں۔ شیخ روزبہان بقلی کے شاگرد، مرید اور داماد تھے۔ ان کے اپنے شاگردوں اور مریدوں کی تعداد بہت تھی۔ انھیں میں مولانا روم کے والد بہاء الدین بھی تھے۔

خوارزم میں رہتے تھے۔ اسی زمانے میں خوارزم پر منگولوں نے حملہ کیا تھا۔ انہوں نے شیخ نجم الدین کو پیغام بھیجا کہ آپ اور آپ کے اہلِ خاندان شہر سے چلے جائیں تاکہ محفوظ رہیں۔ شیخ نجم الدین نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں امن و راحت کے دنوں میں اہلِ شہر کے ساتھ رہا ہوں۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ مصیبت کے وقت انھیں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ چنانچہ ہتھیار سجائے اور اہلِ شہر کے ہمراہ مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ ۶۱۶ھ ہجری میں پیش آیا۔

شیخ فرید الدین عطار: درجۂ اول کے اکابر صوفیہ میں سے ہیں۔ ان کی تصانیف نظم اور نثر دونوں میں ہیں۔ صوفیہ کے حالات میں تذکرۃ الاولیاء

لکھی جس کا آغاز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حالات سے کیا اور خاتمہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے حالات پر۔ یہ کتاب بعد کی کتابوں کا مآخذ رہی ہے اور حوالہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے مستشرقین اس کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کی کتاب "منطق الطیر" تصوف کا شاہکار ہے۔

مولانا رومی نے انکے اور سنائی کے بارے میں کہا ہے:

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پے سنائی و عطار می رویم

(عطار روح تھے اور سنائی ان کی آنکھیں۔ ہم سنائی اور عطار ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں)۔

مولانا رومی ہی نے کہا ہے:

ہفت شہرِ عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

(عطار نے عشق کے سات شہروں کی سیر کی ہے۔ ہم اب تک ایک گلی کے موڑ پہ ہی ہیں)۔

عشق کے سات شہروں سے مولانا رومی کی مراد ان سات وادیوں سے ہے جن کی تشریح خود عطار نے "منطق الطیر" میں کی ہے۔

محمود شبستری گلشنِ راز میں کہتے ہیں:

مرا از شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن چوں عطار ناید

(مجھے اپنی شاعری پر اس لیے شرم نہیں آتی کہ عطار جیسے باکمال تو

کہیں ہزاروں برس میں پیدا ہوتے ہیں)۔

عطار، مجدالدین بغدادی کے شاگرد اور مرید تھے۔ مجدالدین، شیخ نجم الدین کبریٰ کے متوسلین میں سے تھے۔ وہ قطب الدین حیدر کی صحبت سے بھی مستفیض ہوئے تھے جو اس زمانے کے مشائخ میں سے تھے اور تربت حیدریہ نامی شہر میں مدفون ہیں۔ یہ شہر انھیں کے نام سے منسوب ہے۔

عطار، منگول فتنہ کے زمانے میں فوت ہوئے۔ ایک قول کے مطابق ۶۲۶ھ اور ۶۲۳ھ ہجری کی درمیانی مدت میں منگولوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی زنجانی: تصوف کی مشہور اور بلند پایہ کتاب "عوارف المعارف" کے مصنف ہیں۔ نسباً حضرت ابوبکر کی اولاد سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہر سال مکہ اور مدینہ کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ شیخ عبدالقادر گیلانی سے ملاقات تھی اور ان کے ہم نشین تھے۔

شیخ سعدی شیرازی اور مشہور شاعر کمال الدین اصفہانی ان کے مریدوں میں سے تھے۔ سعدی ان کے متعلق کہتے ہیں:

مرا شیخ دانائے مرشد شہاب
دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکی اینکہ در نفس خود بیں مباش
دگر آنکہ در جمع بدبیں مباش

(مجھے میرے دانائے راز مرشد شیخ شہاب الدین نے کشتی میں سفر کرتے ہوئے دو نصیحتیں کیں۔ ایک تو یہ کہ خود بیں مت بنو، دوسرے یہ کہ اوروں کے عیوب مت دیکھو)۔

یہ سہروردی، مشہور فلسفی شیخ شہاب الدین سہروردی سے مختلف ہیں جو شیخ اشراق کے لقب سے مشہور ہیں اور ۵۸۱ھ اور ۵۹۰ھ ہجری کی درمیانی مدت میں حلب میں قتل کر دیے گئے تھے۔

عارف باللہ سہروردی نے ۶۳۲ھ ہجری کے لگ بھگ وفات پائی۔

ابن الفارض مصری: ان کا شمار درجۂ اول کے صوفیوں میں ہوتا ہے۔ ان کے صوفیانہ اشعار عربی زبان میں نہایت اعلیٰ پائے کے ہیں۔ دیوان متعدد بار چھپ چکا ہے۔ فضلاء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ جن لوگوں نے انکے دیوان کی شرح کی ہے ان میں سے ایک عبدالرحمٰن جامی ہیں جو نویں صدی کے مشہور صوفی ہیں۔

عربی زبان میں ان کے عارفانہ اشعار کا فارسی میں حافظؔ کے کلام سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ محی الدین ابن عربی نے ابن فارضؔ سے کہا کہ تم خود اپنے کلام کی شرح لکھو۔ ابن فارض نے جواب دیا کہ آپ کی کتاب فتوحاتِ مکیہ میرے اشعار کی شرح ہے۔

ابن فارض ان لوگوں میں سے ہیں جن کے روحانی حالات غیر معمولی تھے۔ غالباً ان پر جذب کی حالت طاری تھی اور اپنے بیشتر اشعار اسی عالم میں کہے۔

ابن فارضؔ نے ۶۳۲ھ ہجری میں آخرت کا سفر کیا۔

محی الدین ابن عربی طائی اندلسی: حاتم طائی کی اولاد میں سے ہیں۔ اصل میں اندلس کے رہنے والے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کا بڑا حصہ مکہ اور شام میں گزرا۔ چھٹی صدی کے صوفی شیخ ابو مدین مغربی اندلسی کے شاگرد

تھے۔ ان کا سلسلۂ طریقت ایک واسطے سے شیخ عبدالقادر گیلانی تک پہنچتا ہے جن کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے۔

محی الدین جن کو اکثر ابنِ عربی بھی کہا جاتا ہے، بلاشبہ اسلام میں سب سے بڑے عارف باللہ گزرے ہیں۔ نہ ان سے پہلے کوئی ان کے پایہ کو پہنچا اور نہ ان کے بعد۔ اسی وجہ سے ان کا لقب "شیخ اکبر" ہے۔

اسلامی تصوف نے صدی بہ صدی ترقی کی ہے اور ہر صدی میں ایسے بزرگ اہل عرفان پیدا ہوئے جنھوں نے عرفان و تصوف کو ترقی دی اور اس کے سرمایہ میں اضافہ کیا۔ یہ تدریجی ترقی تھی لیکن ساتویں صدی میں محی الدین عربی کے ہاتھوں تو انقلاب آ گیا اور ایک ہی جست میں عرفان و تصوف اوجِ کمال تک پہنچ گیا۔

شیخ محی الدین نے عرفان کو ایک نئی منزل سے روشناس کرایا جس کی سابق میں کوئی نظیر نہیں تھی۔ تصوف کے علمی اور فلسفی پہلو کی بنیاد انھوں نے ہی رکھی۔ بعد کے اہل عرفان عموماً انھیں کے دسترخوان کے زلہ ربا ہیں۔ علاوہ اس کے کہ انھوں نے تصوف کو ایک نئی منزل میں داخل کیا۔ ان کی شخصیت بھی عجائبِ زمانہ میں سے تھی۔ ان کی حیرت انگیز شخصیت ہی کی وجہ سے ان کے بارے میں متضاد رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔

کچھ لوگ ان کو ولیِ کامل اور قطب الاقطاب کہتے ہیں اور کچھ دوسرے اس درجہ گراتے ہیں کہ ان کو کافر قرار دیتے ہیں۔ ان کا نام بگاڑ کر کبھی ممیت الدین اور کبھی ماحی الدین کہتے ہیں۔ عظیم مسلمان فلسفی صدرالمتالہین (ملا صدرا) انکے بہت قائل تھے۔ انکی نظر میں محی الدین کا درجہ بوعلی سینا اور فارابی سے بہت زیادہ تھا۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

محی الدین کی تصانیف کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ ان کی بہت سی کتابیں اور شاید وہ سب کتابیں جن کے نسخے موجود ہیں، چھپ چکی ہیں۔ ان مطبوعات کی تعداد تقریباً بتیس ہے۔ ان کی سب سے اہم کتاب فتوحاتِ مکیہ ہے جو بہت بڑی کتاب ہے اور حقیقت میں تصوف کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

ایک اور کتاب فصوص الحکم ہے جو اگرچہ چھوٹی ہے لیکن تصوف کی بڑی دقیق اور عمیق کتاب ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں اور شاید کسی زمانے میں بھی دو تین آدمیوں سے زیادہ ایسے نہیں ہوئے جو اسکا متن سمجھ سکیں۔

محی الدین نے ۶۳۸ھ ہجری میں دمشق میں رحلت کی اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کی قبر ملک شام میں اب بھی مشہور ہے۔

صدر الدین محمد قونوی: محی الدین ابن عربی کے شاگرد، مرید اور سوتیلے بیٹے تھے۔ خواجہ نصیر الدین طوسی اور مولانا رومی کے ہمعصر تھے۔ ان میں اور خواجہ طوسی میں خط وکتابت رہتی تھی اور خواجہ نصیر الدین ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ مولانا رومی کے ساتھ بھی ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ قونوی امامت کراتے تھے اور مولانا رومی ان کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولانا رومی ان کے شاگرد تھے۔

کہتے ہیں کہ ایک دن مولانا رومی، قونوی کی مجلس میں آئے۔ قونوی اپنی مسند سے اٹھے اور مولانا رومی کو اس پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ مولانا رومی نے کہا کہ اگر میں آپ کی مسند پر بیٹھا تو خدا کو کیا جواب دونگا؟ قونوی نے مسند اٹھا کر دور پھینک دی اور کہا کہ اگر یہ تمہارے لائق نہیں تو ہمارے لیے بھی مناسب نہیں۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

محی الدین ابن عربی کے افکار کے بہترین شارح قونوی ہیں۔ شاید اگر قونوی نہ ہوتے تو ابن عربی کا سمجھنا ناممکن تھا۔ مولانا رومی بھی قونوی ہی کے توسط سے ابن عربی کے مدرسۂ فکر سے آشنا ہوتے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ مولانا رومی قونوی کے شاگرد تھے۔ بظاہر اس کا تعلق بھی محی الدین ابن عربی کے افکار و خیالات سیکھنے ہی سے ہے۔ محی الدین کے خیالات کا پرتو مولانا رومی کی مثنوی اور ان کے دیوان شمس میں موجود ہے: پچھلی چھ صدیوں سے قونوی کی کتابیں اسلامی فلسفہ اور تصوف کی تدریس کے مرکزوں میں نصاب میں شامل رہی ہیں۔

قونوی کی مشہور کتابیں مفتاح الغیب، نصوص اور فکوک ہیں۔ قونوی ۶۷۲ھ یا ۶۷۳ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ ۶۷۲ھ ہجری ہی مولانا رومی اور خواجہ نصیر الدین طوسی کی وفات کا سال ہے۔

مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی: مولوی کے لقب سے مشہور ہیں عالمی شہرت کی مثنوی کے مصنف ہیں۔ مسلمان عارفوں میں بہت ہی غیر معمولی ذہانت کے انسان اور عجائب روزگار میں سے تھے۔ نسب ان کا ابوبکرؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کی مثنوی حکمت و معرفت کا ایک دریا ہے جو دقیق روحانی، اجتماعی اور عرفانی نکات سے سرشار ہے۔ ان کا شمار ایران کے درجۂ اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ اصل میں بلخ کے رہنے والے تھے۔ لڑکپن میں اپنے باپ کے ہمراہ بلخ سے زیارت بیت اللہ کے لیے گئے، نیشاپور میں شیخ فرید الدین عطار سے ملاقات کی۔

مکہ سے واپسی پر اپنے والد کے ہمراہ قونیہ چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔

مولوی ابتداء میں مذہبی عالم تھے اور اپنی قسم کے دوسرے علماء کی طرح درس وتدریس کا شغل رکھتے اور عزت کی زندگی گزارتے تھے۔ پھر مشہور عارف شمس تبریزؒ سے ملاقات ہوئی تو ان کے شیدائی ہو گئے اور سب کچھ چھوڑ دیا۔

ان کی غزلوں کا دیوان' دیوانِ شمس تبریزؒ کہلاتا ہے۔مثنوی میں جگہ جگہ سوز وگداز سے شمس تبریزؒ کا ذکر کیا ہے۔ ۶۷۲ھ ہجری میں وفات پائی۔

فخر الدین عراقی ہمدانی: مشہور صوفی شاعر اور غزل گو ہیں۔صدر الدین قونوی کے شاگرد اور سابق الذکر شہاب الدین سہروردی کے مرید اور تربیت یافتہ تھے۔ ۶۸۸ھ ہجری میں عالمِ آخرت کا سفر کیا۔

آٹھویں صدی کے عارف

علاءالدولہ سمنانی: پہلے دیوانی کا شغل رکھتے تھے بعد میں اس سے کنارہ کش ہو کر عارفوں کے گروہ میں شامل ہو گئے اور اپنی تمام دولت راہِ خدا میں لٹادی۔بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔نظری عرفان میں ان کا ایک خاص مسلک ہے جس سے عرفان کی کتابوں میں بحث کی گئی ہے۔ ۷۳۶ھ ہجری میں فوت ہوئے۔مشہور شاعر خواجوی کرمانی ان کے مریدوں میں سے تھے۔انھوں نے ان کی مدح لکھی ہے۔

عبد الرزاق کاشانی: اس صدی کے محقق عارفوں میں سے تھے۔ محی الدین عربی کی فصوص اور خواجہ عبد اللہ کی منازل السائرین کی شرح لکھی ہے۔دونوں شرحیں چھپ گئی ہیں اور اہل تحقیق ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ شیخ عبد الرزاق لاہیجی کے حالات میں صاحب روضات الجنات نے

لکھا ہے کہ شہید ثانی نے عبدالرزاق کاشانی کی بہت تعریف کی ہے نظری عرفان کے جو مسائل محی الدین ابن عربی نے پیش کیے ہیں ان کے بارے میں کاشانی اور علاءالدولہ سمنانی کے درمیان بڑی گرما گرم بحثیں رہیں۔ عبدالرزاق کاشانی نے ۷۳۵ھ ہجری میں دنیا سے کوچ کیا۔

خواجہ حافظ شیرازی: اگرچہ عالمی شہرت کے مالک ہیں لیکن انکی زندگی کے حالات کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ اتنا مسلم ہے کہ عالم 'عارف' حافظ اور مفسرِ قرآن تھے۔ خود انھوں نے کئی جگہ اس طرف اشارہ کیا ہے۔

ندیدم خوشتر از شعرِ تو حافظ
بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

زحافظانِ جہاں کس چو بندہ جمع نکرد
لطائفِ حکمی با نکاتِ قرآنی

اس کے باوجود کہ اپنے اشعار میں اکثر جگہ انھوں نے پیرِ طریقت اور مرشد کی بات کہی ہے، یہ معلوم نہیں کہ ان کے مرشد کون تھے۔ حافظؒ کے اشعار معرفت کی انتہائی بلندیوں پر ہیں اور ان کے لطائف کو سمجھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ ان تمام عارفوں نے جو ان کے بعد ہوئے اس کا اعتراف کیا ہے کہ حافظؒ نے معرفت کے مقاماتِ عالیہ خود عملاً طے کیے تھے۔

کچھ بزرگوں نے حافظؒ کے بعض اشعار کی شرح لکھی ہے مثلاً نویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی محقق جلال الدین دوانی نے اس شعر کی شرح

میں پورا ایک رسالہ لکھا ہے:

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت

آفریں بر نظرِ پاک خطا پوشش باد

خواجہ حافظ نے ۷۹۱ھ ہجری میں وفات پائی۔[1]

شیخ محمود شبستری: انھوں نے معرفت میں ایک نہایت بلند پایہ مثنوی لکھی ہے جس کا نام گلشن راز ہے۔ اس کا شمار تصوف کی نہایت ہی بلند پایہ کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب نے محمود شبستری کے نام کو بقائے دوام بخش دیا ہے۔ اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ شاید سب سے بہتر شرح شیخ محمد لاہیجی کی ہے جو چھپ گئی ہے اور مل سکتی ہے۔ شبستری کی وفات ۷۲۰ھ ہجری کے لگ بھگ ہوئی۔

سید حیدر آملی: محقق عارفوں میں سے ہیں۔ ان کی ایک کتاب جامع الاسرار ہے جو محی الدین ابن عربی کے نظری عرفان کی ایک دقیق کتاب ہے۔ حال میں عمدہ طور پہ چھپی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب نص النصوص ہے جو فصوص کی شرح ہے۔ یہ مشہور فقیہ فخر المحققین علامہ حلی کے ہم عصر تھے۔ وفات کا سال صحیح طور پہ معلوم نہیں۔

عبدالکریم جیلی: مشہور کتاب الانسان الکامل کے مصنف ہیں۔ انسانِ کامل کی بحث پہلی بار محی الدین ابن عربی نے اٹھائی تھی۔ بعد میں اس نے اسلامی عرفان میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔

---

[1] حافظ دورِ حاضر میں ایرانیوں کے محبوب ترین شاعر ہیں۔ اس زمانے میں بعض موقع شناس مادہ پرستوں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ کسی طرح حافظ کو بھی (جاری ہے)

محی الدین ابن عربی کے شاگرد اور مرید صدر الدین قونوی نے اپنی کتاب مفتاح الغیب کی ایک فصل میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے عارفوں میں سے دو اشخاص نے الانسان الکامل کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے، ایک عزیز الدین نسفی نے جو ساتویں صدی کے عارفوں میں سے ہیں اور دوسرے ہیں عبد الکریم جیلی۔ دونوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ عبد الکریم جیلی نے ۸۰۵ھ ہجری میں ۳۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

نویں صدی کے عارف

شاہ نعمت اللہ ولی: ان کا نسب آلِ علی علیہ السلام سے ملتا ہے مشاہیر عرفاء و صوفیہ میں سے ہیں۔ عصر حاضر میں نعمت اللٰہی سلسلۂ تصوف کا مشہور ترین سلسلہ ہے۔ شاہ نعمت اللہ کی قبر کرمان کے علاقے ماہان میں صوفیوں کی زیارت گاہ ہے۔

کہتے ہیں کہ انہوں نے ۹۵ سال کی عمر پائی اور ۸۲۰ھ یا ۸۲۷ھ یا ۸۳۴ھ میں فوت ہوئے۔ معرفت کے بہت سے شعر ان کی یادگار ہیں۔

صائن الدین علی ترکہ اصفہانی: محقق عارفوں میں سے ہیں۔ نظری عرفان کے محی الدینی مکتب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انکی کتاب تمہید القواعد جو چھپ گئی ہے علم عرفان میں ان کے تبحر کی گواہ ہے۔ ان کے بعد سے محققین اس کتاب سے برابر استفادہ کرتے اور اسے سند سمجھتے رہے ہیں۔

محمد بن حمزہ فناری رومی: عثمانی سلطنت کے علماء میں سے ہیں۔

مادہ پرست یا کم از کم ارتیابی ثابت کریں۔ ہم نے "علل گرائش" میں اس خیال کو رد کیا ہے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

متعدد علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ عرفان و تصوف میں ان کی شہرت ان کی کتاب "مصباح الانس" کی وجہ سے ہے جو صدر الدین قونوی کی کتاب مفتاح الغیب کی شرح ہے۔

محی الدین ابن عربی یا صدر الدین قونوی کی کتابوں کی شرح لکھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ فناری نے یہ کام کیا ہے اور بعد میں آنیوالے محقق عارفوں نے ان کے اس کام کو درست قرار دیا ہے۔ یہ کتاب تہران میں پتھر کے چھاپے پر مرحوم آقا میرزا رشتی کے حواشی کے ساتھ چھپی ہے۔ میرزا رشتی پچھلی صدی کے محقق عارف تھے۔ بدقسمتی سے خراب چھپائی کی وجہ سے حواشی کا کچھ حصہ صاف پڑھا نہیں جاتا۔

شمس الدین محمد لاہیجی نور بخشی: محمود شبستری کی گلشن راز کے شارح ہیں۔ میر صدر الدین دشتکی اور علامہ دوانی کے ہم عصر تھے۔ شیراز میں رہتے تھے۔ قاضی نور اللہ نے مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ صدر الدین دشتکی اور علامہ دوانی جو دونوں اپنے زمانے کے بہت ممتاز فلسفی تھے، محمد لاہیجی کی بہت عزت کرتے تھے۔

سید محمد نور بخش کے مرید تھے اور سید محمد نور بخش ابن فہد حلی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے شرح گلشن راز میں اپنی بیعت کا جو سلسلہ بیان کیا ہے وہ سید محمد نور بخش سے شروع ہو کر معروف کرخی تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد اسے حضرت امام رضا علیہ السلام اور ان سے پہلے ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کے واسطے سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچایا ہے اور اس سلسلہ کا نام سلسلۃ الذہب رکھا ہے۔

جامع تعلیمات اسلامی

لاہیجی کی شہرت زیادہ تر گلشن راز ہی کی شرح کی وجہ سے ہے۔ یہ کتاب تصوف کی اعلیٰ کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے، لاہیجی نے اس کتاب کی تالیف کا آغاز ۸۷۷ھ میں کیا۔ لاہیجی کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ بظاہر ۹۰۰ ہجری سے پہلے فوت ہوئے۔

نورالدین عبدالرحمٰن جامی: ان کا نسب دوسری صدی کے مشہور فقیہ محمد بن حسن شیبانی سے ملتا ہے۔ جامی زبردست شاعر تھے۔ فارسی زبان کے آخری بڑے صوفی شاعر سمجھے جاتے ہیں۔

ابتداء میں دشتی تخلص کرتے تھے لیکن چونکہ صوبہ مشہد کے شہر جام میں پیدا ہوئے تھے اور احمد جامی (ژندہ پیل) کے مرید تھے اس لیے یہ تخلص بدل کر اپنا تخلص جامی رکھ لیا۔ وہ خود کہتے ہیں:

مولدم جام و رشحۂ قلمم
جرعۂ جام شیخ الاسلامی است
زیں سبب در جریدۂ اشعار
بہ دو معنی تخلصم جامی است

(میری جائے پیدائش جام اور میری تحریریں شیخ الاسلام (احمد جامی) کا فیضان ہیں۔ ان دو وجہوں سے اشعار میں میرا تخلص جامی ہے)۔

جامی جامع علوم تھے۔ وہ مختلف علوم جیسے نحو، صرف، فقہ، اصول، منطق، فلسفہ اور تصوف میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ انہوں نے کثیر تعداد میں کتابیں لکھی تھیں۔

ان کی تصانیف میں محی الدین کی فصوص الحکم کی شرح، فخرالدین

جامع تعلیمات اسلامی

جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی

عراقی کی لمعات کی شرح، ابنِ فارض کے قصیدہ تائیہ کی شرح، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں قصیدہ بردہ کی شرح، فرزدق نے جو قصیدہ میمیہ حضرت امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام کی مدح میں کہا تھا اس کی شرح، لوائح، بہارستان جس میں گلستانِ سعدی کے طرز کی پیروی کی ہے اور صوفیہ کے حالات میں نفحات الانس وغیرہ شامل ہیں۔

جامی طریقۂ نقشبندیہ کے بانی بہاء الدین نقشبند کے مرید تھے لیکن جیسا کہ محمد لاہیجی سید محمد نور بخش کے مرید تھے تاہم علمی اور تاریخی لحاظ سے لاہیجی کی شخصیت اپنے پیر سے بہت بلند تر تھی اسی طرح جامی بھی اپنے پیر بہاء الدین نقشبند سے علمی لحاظ سے بہت زیادہ ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ چونکہ یہاں ہم عرفان کے علمی پہلو سے بحث کر رہے ہیں اور ہمیں طریقت کے سلسلوں سے سروکار نہیں اس لیے ہم نے محمد لاہیجی اور عبدالرحمٰن جامی کا ذکر کیا ہے اور ان کے پیروؤں کا نہیں۔ جامی نے ۸۸ سال کی عمر میں ۸۹۸ ہجری میں آخرت کا سفر کیا۔

یہ ابتداء سے نویں صدی کے آخر تک تصوف کی مختصر تاریخ تھی۔ اس کے بعد ہماری رائے میں عرفان و تصوف نے کچھ اور شکل اختیار کر لی۔ اب تک عرفان و تصوف کی علمی شخصیتیں باضابطہ طریقت کے سلسلوں کا جزو تھیں اور انہیں علمی شخصیتوں کا شمار نامور صوفی پیشواؤں میں ہوتا تھا۔ انھیں کی تصانیف عرفان کی اعلیٰ کتابیں ہیں لیکن بعد میں یہ صورت کچھ اور ہو گئی۔

اوّلاً تو یہ کہ بڑے بڑے قطب اور صوفی عموماً وہ علمی دستگاہ نہیں

جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی

جامع تعلیمات اسلامی

رکھتے تھے جو ان کے پیشروؤں کو حاصل تھی۔ شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نویں صدی ہجری کے بعد سے تصوف رسوم میں بلکہ اکثر و بیشتر خود ساختہ بدعات میں غرق ہو کر رہ گیا ہے۔

ثانیاً کچھ لوگوں نے جو تصوف کے سلسلے سے وابستہ نہیں تھے محی الدینی عرفان کے نظریوں میں وہ مہارت پیدا کر لی کہ اس کی باضابطہ صوفیوں میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

مثلاً صدر المتالہین شیرازی متوفی ۱۰۵۰ھ ہجری اور ان کے شاگرد فیض کاشانی متوفی ۱۰۹۱ھ ہجری اور ان کے شاگرد قاضی سعید قمی متوفی ۱۱۰۳ھ ہجری' ان سب کی واقفیت محی الدینی افکار سے اس زمانے کے بڑے بڑے صوفیوں سے زیادہ تھی' حالانکہ ان میں سے کوئی بھی تصوف کے کسی سلسلے سے وابستہ نہیں تھا۔ یہ روش ہمارے زمانے تک جاری ہے۔

مثلاً مرحوم آقا رضا قمشہ ای اور مرحوم آقا مرزا ہاشم رشتی پچھلے سو سال کے ان علماء و حکماء میں سے ہیں جو نظری عرفان کے ماہر تھے گو وہ عملاً تصوف کے سلسلہ سے وابستہ نہیں تھے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ محی الدین ابن عربی کے زمانے سے جب نظری عرفان کی بنیاد رکھی گئی اور عرفان نے فلسفہ کی شکل اختیار کی اسی وقت سے اس روش کا بھی بیج بو یا گیا۔

مثلاً محمد بن حمزہ فناری جن کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں شاید انہیں لوگوں میں سے ہیں لیکن دسویں صدی اور اس کے بعد سے تو یہ روش بہت ہی واضح ہو گئی یعنی ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جس کے افراد

جامعہ تعلیمات اسلامی

نظری عرفان میں باکمال تھے لیکن یا تو وہ قطعاً عملی طور پر اہلِ عرفان اور اہلِ سیر و سلوک میں سے نہیں تھے اور اگر تھے بھی جیسا کہ ان میں سے اکثر افراد تھے جب بھی ان کا باضابطہ صوفی سلسلوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ثالثاً دسویں صدی اور اس کے بعد سے ہمیں بہت سے ایسے افراد اور ایسے گروہ ملتے ہیں جو واقعی اہل سیر و سلوک میں سے تھے۔ انہوں نے عرفان و تصوف کے مقامات بہترین طریقے سے طے کیے تھے لیکن اس کے باوجود نہ صرف ان کا تصوف کے باضابطہ سلسلوں سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ ان سلسلوں سے قطعاً بے اعتنائی برتتے تھے اور کلی یا جزوی طور پر ان پر نکتہ چینی بھی کرتے تھے۔

اس گروہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوگ فقیہ بھی تھے اور آداب سلوک اور فقہی آداب میں مکمل مطابقت کا خیال رکھتے تھے۔ اس قصے کی بھی اپنی الگ تاریخ ہے لیکن اس وقت اس کے بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

منازل و مقامات

اہلِ عرفان کہتے ہیں کہ عرفانِ حقیقی حاصل کرنے کے لیے مختلف منازل اور مقامات سے گزرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر عرفانِ حقیقی تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

عرفان اور حکمتِ الٰہی میں جہاں ایک بات مشترک ہے وہاں دونوں میں کئی لحاظ سے فرق بھی ہے۔ مشترک بات تو یہ ہے کہ دونوں کا

مقصد اللہ کی معرفت حاصل کرنا ہے اور فرق یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حکمتِ الٰہی کا بنیادی مقصد نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد کائنات کے نظام کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ حکماء یعنی فلاسفہ کا مقصد جو معرفت حاصل کرنا ہے اس کا اپنا ایک نظام ہے۔ اللہ کی معرفت بھی اس نظام کا ایک اہم جزو ضرور ہے لیکن اس کی معرفت اس کا واحد مقصد نہیں۔

اس کے برخلاف عرفاء کے نزدیک اللہ کی معرفت ہی سب کچھ ہے۔ ہر چیز کا صحیح ادراک اللہ ہی کی معرفت کی روشنی میں توحید ہی کے زاویہ سے ہوسکتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اشیاء کا ادراک اور ان کی معرفت اللہ کی معرفت پر موقوف ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ فلسفی یا حکیم کا مقصد ذہنی اور فکری معرفت حاصل کرنا ہے۔ اس کی مثال وہ معرفت ہے جو ایک ریاضی دان، ریاضی کے مسائل میں غور و فکر کر کے حاصل کرتا ہے لیکن ایک عارف حضوری اور شہودی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی مثال وہ معرفت ہے جو کوئی تحقیقی کام کرنے والا لیبارٹری میں تجربہ کر کے حاصل کرتا ہے۔ فلسفی علم الیقین کا طالب ہے اور عارف عین الیقین کا۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ فلسفی عقل، استدلال اور دلیل و برہان سے کام لیتا ہے۔ اس کے برعکس عارف تصفیۂ قلب اور تہذیبِ نفس کے ذریعے سے معرفت حاصل کرتا ہے۔ فلسفی چاہتا ہے کہ اپنے ذہن کی دوربین کو کام میں لاکر اس دوربین کی مدد سے نظامِ عالم کا مطالعہ کرے لیکن عارف چاہتا ہے کہ اپنے پورے وجود کو حرکت میں لاکر حقیقت تک رسائی حاصل

کرے اور جس طرح ایک قطرہ دریا میں مل کر فنا ہو جاتا ہے اسی طرح وہ حقیقت سے پیوستہ ہو کر اپنی ہستی کو فنا کر دے۔

فلسفی کے نقطۂ نگاہ سے انسان سے جو فطری کمال متوقع ہے وہ حقیقت کو سمجھنا ہے لیکن عارف کی نگاہ میں انسان کا کمال حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ فلسفی کے نزدیک ناقص انسان وہ ہے جو جاہل ہو جبکہ عارف کے نزدیک ناقص انسان وہ ہے جو اپنی اصل سے دور ہو اور جسے حقیقت تک رسائی حاصل نہ ہو۔

عارف وصول کو کمال سمجھتا ہے، جاننے اور سمجھنے کو نہیں۔ وہ مقصد اصلی تک رسائی اور عرفان حقیقی کے حصول کے لیے کئی مراحل اور منازل و مقامات سے گزرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ ان منازل سے گزرنے ہی کا نام **سیر و سلوک** رکھا گیا ہے۔

عرفان کی کتابوں میں ان منازل اور مقامات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے لیکن یہاں اجمالی بیان کے لیے ہم بوعلی سینا کی کتاب "اشارات" کے نمطِ نہم کا خلاصہ نقل کرتے ہیں۔

بوعلی سینا فلسفی ہے عارف نہیں۔ پھر بھی وہ کوئی خشک فلسفی نہیں خصوصاً اپنی عمر کے اواخر میں تو ان کا رجحان عرفان کی طرف ہو گیا تھا۔ اشارات میں جو بظاہر ان کی آخری کتاب ہے انھوں نے ایک فصل مقامات العارفین کے لیے مخصوص کی ہے۔

بجائے اس کے کہ ہم اہلِ عرفان کی کتابوں سے کچھ نقل کریں، ہم یہ

جامعہ تعلیمات اسلامی

بہتر سمجھتے ہیں کہ اس فصل نہم کا، جو غیر معمولی طور پر بلند پایہ اور خوبصورت ہے، خلاصہ بیان کردیں۔

تعریف

"جو شخص دنیا کے مال و اسباب اور ناز و نعم سے روگردانی کرے اس کو زاہد کہا جاتا ہے۔ جو شخص پابندی سے نماز، روزہ وغیرہ جیسی عبادات بجالائے وہ عابد کہلاتا ہے اور جو شخص اپنے خیالات کو غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھے اور اپنی توجہ عالم قدس کی طرف مرکوز کردے تاکہ اس کی روح نورِ الٰہی کی ضیاپاشیوں سے منور ہوسکے، اسے عارف کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات ان میں سے دو یا تینوں خصلتیں ایک ہی شخص میں جمع ہوسکتی ہیں۔"

اگرچہ یہاں بوعلی سینا نے زاہد، عابد اور عارف کی تعریف کی ہے لیکن ضمناً اس میں زہد، عبادت اور عرفان کی تعریف بھی آگئی ہے کیونکہ زاہد، عابد اور عارف کی ان خصوصیات کا ذکر جن کی بنا پر انھیں زاہد، عابد اور عارف کہا جاتا ہے درحقیقت زہد، عبادت اور عرفان ہی کی تعریف ہے۔

اس تعریف سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زہد کے معنی ہیں دنیوی خواہشات سے روگردانی، عبادت کے معنی ہیں نماز، روزہ، قرآن کی تلاوت اور اسی قبیل کے دوسرے مخصوص اعمال کا بجالانا اور عرفان کے معنی ہیں ذہن کو ماسوی اللہ سے ہٹا کر ذاتِ حق پر مرکوز کرنا تاکہ قلب نورِ حق کی تابانی سے فیضیاب ہوسکے۔ بوعلی سینا کے آخری فقرے میں ایک اہم نکتے کی طرف

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

اشارہ ہے یعنی یہ کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک ہی وقت میں زاہد بھی ہو اور عابد بھی یا عابد بھی ہو اور عارف بھی یا زاہد بھی ہو اور عارف بھی یا بیک وقت زاہد، عابد اور عارف بھی ہو۔ شیخ نے اس کی مزید وضاحت نہیں کی لیکن انکے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص زاہد و عابد ہو اور عارف نہ ہو لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص عارف ہو اور زاہد و عابد نہ ہو۔

مزید وضاحت کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زاہد اور عابد میں عموم و خصوص من وجہ کی نسبت ہے یعنی جیسا کہ ظاہر ہے یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص زاہد ہو اور عابد نہ ہو یا عابد ہو اور زاہد نہ ہو یا پھر زاہد بھی ہو اور عابد بھی لیکن زاہد اور عارف یا عابد اور عارف میں عموم و خصوص کی نسبت ہے یعنی ہر عارف زاہد و عابد ہوتا ہے لیکن ہر زاہد یا عابد، عارف نہیں ہوتا۔

آگے چل کر ابن سینا اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ عارف کا زہد غیر عارف کے زہد سے مختلف چیز ہے کیونکہ ان دونوں کے زہد کا فلسفہ الگ ہے۔ اسی طرح عارف کی عبادت کا فلسفہ بھی غیر عارف کی عبادت کے فلسفے سے مختلف ہے۔ عارف کے زہد اور اس کی عبادت کی روح اور ماہیت غیر عارف کے زہد اور اس کی عبادت کی روح اور ماہیت سے الگ ہے۔

ابن سینا کہتے ہیں: غیر عابد کا زہد ایک طرح کا لین دین اور کاروبار ہے۔ گویا وہ دنیوی مال و متاع کے بدلے آخرت کی نعمتیں خریدتا ہے۔ اس کے برخلاف عارف کے زہد کا مطلب دل کو ہر اس چیز سے پاک و صاف کرنا ہے جو خدا کی طرف توجہ میں مزاحم ہو۔ غیر عارف کی عبادت بھی ایک

جامعہ تعلیمات اسلامی

طرح کا کاروبار ہی ہے۔ غیر عارف گویا اجرت پر کام کرتا ہے۔ وہ دنیا میں عبادت اس لیے کرتا ہے تاکہ اسے آخرت میں اس کی مزدوری یعنی اجر و ثواب مل جائے لیکن عارف کی عبادت ایک طرح کی مشق اور روحانی ریاضت ہے۔ اس کی عبادت دنیا کی طرف سے بے توجہی اور ذاتِ حق کی طرف توجہ کی مشق ہے۔ عارف اس لیے عبادت کرتا ہے تاکہ اس مسلسل مشق کے نتیجے میں وہ ذاتِ حق کی طرف کھنچتا چلا جائے۔

عارف کا مقصد

ابن سینا کہتے ہیں:

عارف صرف خدا کا طالب ہے، اسے اور کسی چیز سے غرض نہیں۔ اس کی نظر میں معرفتِ الٰہی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ وہ اللہ کی عبادت اس لیے کرتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ عبادت کا مستحق ہے اور عبادت اس کی ذات پاک سے تعلق کی ایک مناسب اور شائستہ شکل ہے۔ عارف کی عبادت میں خوف یا لالچ کا کوئی عنصر نہیں ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ عارف اپنے مقصد کے لحاظ سے موحّد ہے۔ وہ فقط خدا کا طالب ہوتا ہے۔ اسے خدا کی طلب اس لیے نہیں ہوتی کہ اس طرح دنیا یا آخرت کی نعمتیں حاصل ہو سکیں گی کیونکہ ایسی صورت میں مقصود بالذات تو یہ نعمتیں ہوئیں اور خدا محض ان کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ رہ گیا۔ اس صورت میں تو درحقیقت معبود اور مطلوب حقیقی نفس ہوگا کیونکہ یہ نعمتیں نفس ہی کو خوش اور مطمئن کرنے کے لیے درکار ہیں۔

عارف جو کچھ چاہتا ہے خدا کے لیے چاہتا ہے۔ اگر اس کو خدا کی نعمتوں کی بھی طلب ہوتی ہے تو محض اس لیے کہ یہ نعمتیں خدا کی دین اور اس کا فضل و احسان ہیں۔ غیر عارف خدا کی نعمتوں کی خاطر خدا کا طالب ہے اور عارف خدا کی خاطر اس کی نعمتوں کا خواہاں ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ صحیح ہے کہ عارف خدا کے سوا کسی اور چیز کا طلبگار نہیں تو وہ خدا کی عبادت کیوں کرتا ہے۔ عبادت کا کوئی مقصد تو ضرور ہونا چاہیے۔ شیخ الرئیس (بوعلی بن سینا) اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ عارف کی عبادت کا مقصد اور اس کا محرک دو میں سے ایک چیز ہے۔ یا تو یہ کہ معبود خود عبادت کا مستحق ہے۔ عارف خدا کی عبادت اس لیے کرتا ہے کہ وہ عبادت کے لائق ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی آدمی جب کسی شخص یا کسی شئے میں کوئی نمایاں خوبی دیکھتا ہے تو اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ اگر اس تعریف کرنے والے سے پوچھا جائے کہ تم یہ تعریف کیوں کرتے ہو؟ اس تعریف سے کیا فائدہ ہے؟ تو وہ یہی جواب دے گا کہ میں نے اس شخص یا اس چیز کی تعریف کسی فائدے کے خیال سے نہیں کی۔ میں نے تو اس کی تعریف فقط اس لیے کی ہے کہ میں نے اسے تعریف کے قابل سمجھا۔ ہر شعبہ کی باکمال ہستیوں کی تعریف کی یہی صورت ہے۔

عارف کی عبادت کی ایک اور وجہ خود عبادت کی ذاتی خوبی ہے۔ عبادت چونکہ بندے اور خدا کے درمیان رشتہ اور تعلق ہے اس لیے یہ ایک ایسا کام ہے جو انجام دینے کے لائق ہے لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ عبادت کسی لالچ یا خوف ہی کی وجہ سے کی جائے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کا ایک مشہور قول ہے کہ :

"خدایا! میں نے تیری عبادت تیری دوزخ کے خوف سے یا تیری جنت کے لالچ میں نہیں کی بلکہ میں نے تیری عبادت اس لیے کی ہے کہ میں نے تجھے عبادت کے لائق پایا۔"

اس قول میں عبادت کی وجہ معبود کا عبادت کے لائق ہونا بیان کی گئی ہے۔

عرفاء اس نکتے پر بہت زور دیتے ہیں کہ اگر آدمی کا مقصد زندگی میں بالخصوص عبادات میں ذاتِ حق کے سوا کچھ اور ہو تو یہ ایک طرح کا شرک ہے۔ حق تعالیٰ کی معرفت قطعاً اس شرک کی ضد ہے۔ اس بات کو عرفاء نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اور دلکش مثالوں سے سمجھایا ہے۔ ہم یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں جو شیخ سعدی نے بوستان میں محمود وایاز کے قصے کے ضمن میں بیان کی ہے۔ سعدی کہتے ہیں:

کسی نے سلطان محمود غزنوی پر اعتراض کیا کہ ایاز تو حسین بالکل نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ سلطان اس پر عاشق ہے۔ جس پھول میں رنگ ہو نہ بُو اس پر بلبل کے فریفتہ ہونے کے کیا معنی؟ کسی نے یہ قصہ محمود کو جا سنایا۔ اس نے سوچ کر کہا: جناب! میں تو اس کی عادات و خصائل کا شیدائی ہوں۔ اس کی سرو قامتی پر فریفتہ نہیں۔ سعدی کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ ایک دفعہ ایک اونٹ راستا تنگ ہونے کے باعث گر گیا اور اس پر زر و جواہر کا جو صندوق لدا ہوا تھا وہ گر کر ٹوٹ گیا۔ سلطان نے مال کی ذرا پروا نہیں کی اور بعجلت تمام وہاں سے روانہ ہو گیا۔ جو سوار

اس کے ساتھ تھے وہ زرد جواہر سمیٹنے میں لگے رہے۔ سلطان کے ساتھ سوائے ایاز کے اور کوئی نہ آیا۔ سلطان اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور پوچھا: جانِ من! تم وہاں سے لوٹ کے مال میں سے کیا اٹھا کر لائے؟ ایاز نے جواب دیا میں تو آپ کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہوں۔ میں نے آپ کی خدمت چھوڑ کر دولت کی طرف توجہ نہیں کی۔

یہ قصہ بیان کرنے کے بعد سعدی اپنا اصل مقصد اس طرح بیان کرتے ہیں:

گر از دوست چشمت بہ احسان اوست
تو در بند خویشی نہ در بند دوست

(اگر تمہاری نظریں دوست پر نہیں، اس کی فیاضی پر ہیں، تو تم دوست سے نہیں اپنی ذات سے محبت کرتے ہو)۔

خلافِ طریقت بود کہ اولیاء
تمنا کنند از خدا جز خدا

(یہ طریقت کے خلاف ہے کہ اولیاء اللہ خدا سے خدا کے سوا کسی اور چیز کی تمنا کریں)۔

پہلی منزل

ابن سینا کہتے ہیں کہ:

سیر و سلوک کی پہلی منزل وہ ہے جسے اہل عرفان **ارادہ** کہتے ہیں۔ ارادہ اس شوق و رغبت کا نام ہے جو آدمی میں چاہے کسی دلیل سے یا محض

ایمان کی برکت سے اس طریقہ کو مضبوط پکڑنے کے لیے پیدا ہو جس سے حقیقت تک رسائی ہوتی ہے اور تبھی روح اور ضمیر میں حرکت پیدا ہوتی ہے تاکہ وہ مقصود حقیقی کو پالے۔

سیر و سلوک کی اس پہلی منزل کی جو ایک لحاظ سے پورے عرفان کی جان ہے کچھ وضاحت کی ضرورت ہے۔

اہلِ عرفان ایک اصول کے قائل ہیں جس کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ النِهایاتُ هِیَ الرُّجُوعُ اِلَی البدایات (یعنی آغاز کی طرف لوٹنا ہی انجام ہے)۔

یہ ظاہر ہے کہ انتہاء کا عینِ ابتداء یا انجام کا عینِ آغاز ہونا دو ہی طرح ممکن ہے۔ ایک تو یہ کہ حرکت خطِ مستقیم کے ساتھ ساتھ ہو اور متحرک چیز ایک خاص نقطہ پر پہنچنے کے بعد اپنی سمت بدل لے اور جس راستے سے آئی ہے اسی راستے سے واپس ہو جائے۔ فلسفہ میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سمت بدلنے کی صورت میں وقفہ ضرور ہوگا گو یہ وقفہ کتنا ہی غیر محسوس کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ دو حرکتیں دو متضاد سمتوں میں ہونگی۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ حرکت ایسے خطِ منحنی کے ساتھ ساتھ ہو جس کا فاصلہ ایک معین نقطہ سے ہر جگہ برابر ہو۔ بہ الفاظِ دیگر حرکت دائرے کی شکل میں ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر حرکت دائرے کی شکل میں ہوگی تو قدرتی طور پر جس نقطے سے شروع ہوئی ہے اسی پر ختم ہوگی۔ جو متحرک چیز دائرے کی شکل میں حرکت کرے گی وہ پہلے تو نقطۂ آغاز سے دور ہٹتی چلی جائے گی اور آخر ایک ایسے نقطے پر پہنچ جائے گی جو نقطۂ آغاز سے بعید ترین فاصلے پر ہوگا۔ یہ وہ

نقطہ ہوگا کہ اگر نقطۂ آغاز سے دائرے کا قطر کھینچا جائے تو اسی نقطے پر ختم ہوگا۔ اس نقطے پر پہنچنے کے بعد متحرک شے بغیر کسی وقفہ کے نقطۂ آغاز کی طرف لوٹنا شروع ہو جائے گی۔

اہلِ عرفان حرکت کے اس خط کو جو نقطۂ آغاز سے بعید ترین نقطہ تک جاتا ہے قوسِ نزول اور اس خط کو جو بعید ترین نقطہ سے نقطۂ آغاز تک آتا ہے قوسِ صعود کہتے ہیں۔ نقطۂ آغاز سے بعید ترین نقطہ تک اشیاء کی حرکت کا ایک خاص فلسفہ ہے جسے حکماء اصولِ علیت اور عرفاء اصولِ تجلی کہتے ہیں۔ قوسِ نزول کے ساتھ ساتھ حرکت کے وقت اشیاء کی حالت ایسی ہوتی ہے گویا وہ پیچھے سے دھکیلی جا رہی ہوں۔ اس فلسفہ کی بنیاد یہ ہے کہ ہر چیز اپنی اصل اور اپنے آغاز کی طرف لوٹنا چاہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر غریب الوطن اپنے اصل وطن کو واپس جانا چاہتا ہے۔ اہلِ عرفان کا خیال ہے کہ یہ رجحان انسان سمیت کائنات کے ہر ذرّے میں موجود ہے۔ گو بعض اوقات انسان میں یہ رجحان نمایاں نہیں ہوتا کیونکہ دوسرے چکروں میں پڑ کر انسان اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ بار بار کے توجہ دلانے پر یہ پوشیدہ رجحان ظاہر اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی رجحان کے ظہور کا نام ارادہ ہے۔

درحقیقت ارادہ ایک مخفی شعور کی بیداری کا نام ہے۔ عبدالرزاق کاشانی نے اپنے رسالہ "اصطلاحات" میں جو شرحِ منازل السائرین کے حاشیہ پر چھپا ہے، ارادہ کی تعریف یوں کی ہے:

"ارادہ آتشِ محبت کا ایک شعلہ ہے، جب وہ دل میں فروزاں ہوتا

ہے تو انسان حقیقت کی پکار پر لبیک کہنے لگتا ہے۔"

خواجہ عبداللہ انصاری "منازل السائرین" میں ارادہ کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"ارادہ اپنی خوشی سے حقیقت کی پکار پر لبیک کہنے کا نام ہے۔"

یہاں ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں ارادہ کو پہلی منزل کہا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ چند ابتدائی منازل کے بعد یہ پہلی منزل ہے۔ ان ابتدائی منازل کو بدایات، ابواب، معاملات اور اخلاق کہا جاتا ہے۔ عرفانِ حقیقی کی حالت شروع ہو جانے کے بعد ارادہ پہلی منزل ہے۔ ارادہ اور اس کے بعد کی منازل عارفین کی اصطلاح میں اصول کہلاتی ہیں۔

مولانا رومی النہایات ھی الرجوع الی البدایات کے اصول کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

جزءہا را رویہا سوئے کل است
بلبلاں را عشق با روئے گل است
آنچہ از دریا بہ دریا می رود
از ہما نجا کامد آنجا می رود

(اجزاء کا رخ کل کی طرف ہوتا ہے جیسے بلبل پھول کے لیے بیتاب ہوتی ہے، ایسے ہی جزو کل سے ملنے کے لیے مشتاق ہوتا ہے۔ جو چیز دریا سے نکل کر دریا میں جاتی ہے وہ دراصل اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے)۔

مولانا رومی نے اپنی مثنوی کے دیباچہ کے آغاز میں بانسری کی فریاد

سناکر عرفان کی پہلی منزل یعنی ارادہ کو عارفین کی اصطلاح میں بیان کیا ہے جو اپنی اصل کی طرف واپسی کا شوق رکھنے کے ساتھ ساتھ تنہائی اور جدائی کے احساس سے عبارت ہے۔

مولانا رومی فرماتے ہیں:

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائیہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق
ہر کہ او مہجور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

(سنو بانسری کیا کہہ رہی ہے۔ وہ جدائی کی شکایت کر رہی ہے۔ کہتی ہے کہ جب سے مجھے جنگل سے کاٹ کر لایا گیا ہے" میری فریاد سے مرد و زن نالاں ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ فراق سے میرا سینہ پھٹ جائے تاکہ میں اپنے دردِ شوق کا بیان کرسکوں جو اپنی اصل سے جدا ہو جاتا ہے۔ وہ پھر وصال کے زمانے کی تلاش میں رہتا ہے)۔

ابن سینا نے ارادہ کی جو تعریف بیان کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ارادہ اس شوق اور آرزو کا نام ہے جس کا احساس انسان میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو تنہا اور بے سہارا محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے

کہ اس حقیقت سے پیوستہ ہو جائے جس سے پیوستہ ہو کر نہ تنہائی کا احساس ہو اور نہ بے بسی کا۔

ریاضت

ابنِ سینا کہتے ہیں: ارادہ کے بعد عارف کے لیے ریاضت ضروری ہے۔ ریاضت کے تین مقصد ہیں: پہلا ماسوی اللہ کو راستے سے ہٹانا، دوسرا نفسِ امارہ کو نفسِ مطمئنہ کے تابع کرنا اور تیسرا باطن کو نرم بنانا تاکہ اس میں نورانیت کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو سکے۔

اس طرح پہلا مرحلہ تو ہوا ارادہ جو اس سفر کی ابتداء ہے۔ دوسرا مرحلہ ہے مشق اور تیاری کا۔ اس تیاری کو ریاضت کہا جاتا ہے بعض مکاتبِ فکر کے خیال میں ریاضت سے مراد اپنے اوپر سختی کرنا اور اپنے جسم کو تکلیف دینا ہے۔ اس کا نمونہ ہندوستان کے جوگیوں میں نظر آتا ہے لیکن ابنِ سینا نے ریاضت کا لفظ اپنے اصل مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

عربی زبان میں ریاضت کے اصلی معنی ہیں جوان اور نو کار گھوڑے کی تربیت کرنا۔ اس کو سدھانا اور خوش رفتاری سکھانا۔ بعد میں یہ لفظ جسمانی ورزش کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ آجکل بھی عربی زبان میں ورزش کو ریاضت کہتے ہیں۔ اہلِ عرفان کی اصطلاح میں ریاضت کا اطلاق اس مشق پر ہوتا ہے جو روح کو نورِ معرفت کی ضیا پاشی کے لیے تیار کرنے کی غرض سے کی جاتی ہے۔

بہرحال یہاں ریاضت سے مراد روح کی مشق اور تیاری ہے جس کے تین

مقصد ہیں۔ پہلے مقصد کا تعلق خارجی امور سے ہے یعنی ان تمام اسباب کو ختم کرکے جو موجبِ غفلت ہو سکتے ہیں یکسوئی حاصل کرنا، دوسرے مقصد کا تعلق باطنی قوتوں کے انتظام اور روحانی پریشان خیالی کو دور کرنے سے ہے۔ اسی چیز کو نفسِ امارہ کو نفسِ مطمئنہ کے تابع کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تیسرے مقصد کا تعلق روح کی باطنی کیفیت میں ایک طرح کی تبدیلی لانے سے ہے جس کو 'تلطیف سر' یا باطن کو نرم بنانا کہا گیا ہے۔

ابن سینا کہتے ہیں: زہدِ حقیقی سے پہلا مقصد حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے (یعنی زہد سے موانع و شواغل اور اسبابِ غفلت سے نجات مل جاتی ہے)۔ دوسرے مقصد (یعنی نفسِ امارہ کو نفسِ مطمئنہ کے تابع کرکے روح کی پریشان خیالی کو دُور کرنا) کے حصول میں کئی چیزوں سے مدد ملتی ہے: ایک تو عبادت سے بشرطیکہ حضورِ قلب سے ہو۔ دوسرے اچھی آواز سے جو ایسے روحانی کلام کی ادائیگی کے لیے استعمال کی جائے جو دل پر اثر کرے اور ذہن میں یکسوئی پیدا کرے (جیسے آیاتِ قرآنی، دعا و مناجات یا معرفت کے اشعار)۔ تیسرے وعظ و نصیحت سے بشرطیکہ واعظ یا ناصح پاک دل ہو، اس میں رہنمائی کی صلاحیت ہو، اس کا بیان فصیح و بلیغ ہو اور اس کی آواز نرم اور مؤثر ہو۔

تیسرے مقصد (یعنی باطن کو نرم بنانے اور روح کی کدورتوں کو دور کرنے) میں جن چیزوں سے مدد ملتی ہے۔ ان میں ایک تو ہے خیالات کا پاکیزہ ہونا اور دوسری ہے پاک محبت بشرطیکہ محبت ذہنی اور روحانی ہو، جسمانی اور شہوانی نہ ہو اور محبت کا سبب محبوب کے اخلاق و شمائل ہوں

جامع تعلیمات اسلامی

شہوت نہ ہو۔

پھر ابن سینا کہتے ہیں کہ جب عارف کا ارادہ اور اس کی ریاضت ایک خاص حد تک ترقی کر جاتے ہیں تو اسے نورِ حق کی جھلکیاں نظر آنے لگتی ہیں اور اس کے دل پر ایک نور نمودار ہوتا ہے جو بہت ہی لذّت بخش ہوتا ہے اور یہ نہایت تیزی سے گزر جاتا ہے گویا کہ بجلی چمکی اور غائب ہو گئی:

خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا الہ سے

اس حالت کو عرفاء اوقات کہتے ہیں۔ عارف جتنی زیادہ ریاضت کرتا ہے اتنی ہی کثرت سے یہ حالت پیش آتی ہے۔ جب وہ اور ترقی کرتا ہے تو یہ کیفیت بغیر ریاضت کے بھی طاری ہونے لگتی ہے۔ جب وہ ذرا بھی کوئی جھلک دیکھتا ہے تو اس کا خیال عالمِ قدس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس پر ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ اسے ہر چیز میں خدا کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر اس پر بسا اوقات ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ بے چین ہو جاتا ہے اور اس کی بے چینی کا احساس پاس بیٹھے ہوئے شخص کو بھی ہوتا ہے۔ پھر ریاضت کی کثرت سے یہ صورت ہو جاتی ہے کہ وہ وقتی کیفیت سکون (سکینہ) میں بدل جاتی ہے (یعنی جو بات پہلے کبھی کبھی ہوتی تھی اور پریشانی کا باعث بنتی تھی اب بار بار ہونے کے بعد آہستہ آہستہ عارف اس سے مانوس ہو جاتا ہے) اجنبی حالت جانی پہچانی کیفیت میں بدل جاتی ہے اور عارف اس سے مستقل

جامعہ تعلیمات اسلامی

طور پہ مانوس ہو جاتا ہے۔ گویا اسے حق تعالےٰ کی مسلسل ہم نشینی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اس حالت سے خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ جب کبھی یہ کیفیت باقی نہیں رہتی، وہ افسردہ و غمگین ہو جاتا ہے۔ شاید اس مرحلے تک تو عارف پر اس کی اندرونی کیفیت (خوشی اور رنج) کے آثار نظر آتے ہیں (کہ پاس بیٹھے ہوئے شخص کو بھی ان کا احساس ہو جاتا ہے) لیکن جب عارف اس حالت سے اور زیادہ آشنا ہو جاتا ہے تو اس کی اندرونی کیفیت کے آثار کا ظاہر ہونا کم ہو جاتا ہے۔ اب یہ کیفیت ہوتی ہے کہ گو وہ نظر آتا ہے لیکن درحقیقت غائب ہوتا ہے (کیونکہ اس کی روح کسی اور ہی دنیا میں ہوتی ہے) اور گو وہ کہیں اور گیا ہوا ہوتا ہے لیکن پھر بھی سب کے درمیان موجود ہوتا ہے۔

یہ فقرہ ہمیں حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے اس قول کی یاد دلاتا ہے جو آپ نے جناب کمیل بن زیاد نخعی رض کو مخاطب کر کے اولیائے حق کے بارے میں فرمایا تھا۔ ایسے اولیائے حق ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"علم و معرفت اور حقیقی بصیرت کے چشمے ان کے دل سے پھوٹنے لگتے ہیں۔ عیش و عشرت کے دلدادہ جس بات کو مشکل سمجھتے ہیں، وہ انہیں آسان معلوم ہوتی ہے۔ جس چیز سے جاہل گھبراتے ہیں، وہ اس سے مانوس ہوتے ہیں۔ ان کے جسم لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن انکی روحیں ملاءِ اعلیٰ میں رہتی ہیں۔"

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

ابن سینا کہتے ہیں: جب تک عارف اس منزل میں رہتا ہے شاید یہ حالت صرف کبھی کبھی ممکن ہوتی ہے مگر پھر آہستہ آہستہ یہ حالت اس کے اپنے اختیار میں ہو جاتی ہے۔ وہ جب چاہتا ہے یہ کیفیت پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک درجہ اور آگے بڑھ جاتا ہے تو حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جلوہ اس کی خواہش پر موقوف نہیں رہتا۔ وہ جب جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اسے خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے ماسوی اللہ کے بجائے اس کی توجہ کلی طور پر ذاتِ حق کی طرف ہو جاتی ہے۔ اس کی یہ حالت مستقل طور پر قائم رہتی ہے، گو اس کے گرد و پیش کے لوگ اسکی اس حالت سے بے خبر رہتے ہیں اور انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اب تک تو عارف کی حالت کا تعلق ریاضت اور مجاہدہ سے تھا۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد عارف مجاہدہ کے بغیر بھی اپنے ضمیر کو صیقل شدہ آئینے کی مانند پاتا ہے جس میں اسے ہر وقت حق تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس حالت میں اس پر روحانی لذتوں کی بارش ہوتی ہے اور وہ اپنا تعلق حق تعالیٰ سے دیکھ کر جوشِ مسرت سے پھولا نہیں سماتا۔ اس کی ایک نظر خدا کی طرف ہوتی ہے اور ایک اپنی طرف (جس طرح آئینہ دیکھنے والا کبھی آئینہ کو دیکھتا ہے اور کبھی اس میں اپنے عکس کو)۔ اس سے اگلے مرحلے میں خود عارف کا وجود بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کی نظریں فقط ذاتِ حق پر ہوتی ہیں۔ وہ اگر اپنے آپ کو دیکھتا بھی ہے تو اس لحاظ سے کہ ہر مشاہدہ میں دیکھنے والا بھی کسی نہ کسی طرح نظر آتا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے آئینہ دیکھنے میں توجہ تو عکس کی طرف ہوتی ہے"

جامعہ تعلیمات اسلامی

آئینہ کی طرف نہیں لیکن عکس کی طرف دیکھتے ہیں آئینہ پر بھی لامحالہ نگاہ پڑتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ آئینہ کی خوبصورتی کی طرف بھی توجہ ہو۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر عارف واصل بحق ہو جاتا ہے اور اس کا خلقت سے حق تک سفر اختتام کو پہنچتا ہے۔

یہ تھا خلاصہ "اشارات" کے نمط نہم کے ایک حصہ کا۔ یہاں یہ نکتہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ عارفانِ ربانی چار سیروں کے قائل ہیں:

(۱) سیر من الخلق الیٰ الحق (۲) سیر بالحق فی الحق (۳) سیر من الحق الیٰ الخلق (۴) اور سیر فی الخلق بالحق۔

پہلی سیر مخلوق سے خالق کی طرف ہے، دوسری سیر خود خالق میں ہے یعنی اس مرحلہ میں سالک یا عارف اسماء و صفاتِ الٰہی سے آشنا اور صفاتِ الٰہی سے متصف ہوتا ہے۔ تیسرے سفر میں وہ دوبارہ مخلوق کی طرف لوٹتا ہے مگر خدا سے جدا نہیں ہوتا یعنی وہ خدا سے جدا ہوئے بغیر مخلوق کی ہدایت اور دستگیری کے لیے مخلوق کی طرف واپس آتا ہے۔ چوتھی سیر مخلوق کے درمیان سفر ہے مگر حق تعالیٰ کی معیت میں۔

اس آخری سیر میں عارف لوگوں کے ساتھ اور ان کے درمیان ہوتا ہے ان کی حاجت روائی کرتا ہے تاکہ ان کو خدا تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکے۔

ہم نے بو علی ابن سینا کی کتاب "اشارات" سے جو خلاصہ پیش کیا ہے وہ ان چار سفروں میں سے پہلے سفر سے متعلق تھا۔ انہوں نے دوسرے سفر کے متعلق بھی کچھ بحث کی ہے مگر اس کے بیان کرنے کی ہم چنداں

ضرورت نہیں سمجھتے۔

جیسا کہ خواجہ نصیر الدین طوسی علیہ الرحمۃ نے "شرح اشارات" میں کہا ہے، ابو علی ابن سینا نے پہلے روحانی سفر کو نو مرحلوں میں بیان کیا ہے۔ تین مرحلوں کا تعلق سفر کی ابتداء سے ہے، تین مرحلوں کا تعلق سفر کے آغاز سے انجام تک ہے اور تین مرحلے منزلِ مقصود پر پہنچنے کے ہیں۔ شیخ کے کلام پر غور کرنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔

ریاضت سے جس کا لفظی ترجمہ ورزش ہے۔ ابن سینا کی مراد وہ اعمال و اشغال اور مجاہدات ہیں جو عارف انجام دیتا ہے۔ یہ مجاہدے بہت سے ہیں اور عارف کے لیے ضروری ہے کہ وہ انھیں مجاہدوں کے دوران میں مختلف منزلیں طے کرے۔ ابن سینا نے یہاں اجمال سے کام لیا ہے لیکن اہلِ عرفان نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے جو عرفان کی کتابوں میں مثلاً ملا صدرا کی "اسفار اربعہ" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سیر و سلوک

علامہ محمد حسین طباطبائی

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَصَلَّى اللهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّاهِرِيْنَ وَلَعْنَةُ اللهِ عَلٰى اَعْدَائِهِمْ اَجْمَعِيْنَ . قَالَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ :

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ؕ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىْءٍ مُّحِيْطٌ ۝

(سورۂ حٰمٓ سجدہ آیات ۵۳۔۵۴)

مادی انسان مادیت کے تاریک صحرا میں زندگی بسر کرتا ہے اور خواہشاتِ نفسانی کے بحرِ بیکراں میں غوطے کھاتا رہتا ہے۔ ہر لمحہ مادی تعلقات کی ایک موج اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیتی ہے اور ابھی وہ دم بھی لینے نہیں پاتا کہ پہلے سے بھی زیادہ ایک خوفناک موج جس کا

جامعہ تعلیمات اسلامی

سرچشمہ دھن دولت اور بیوی بچوں میں دلچسپی ہوتا ہے جو اسے ایسے تھپیڑے دیتی ہے کہ وہ اس گہرے اور ہولناک سمندر کی تہ میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس کی چیخ و پکار موجوں کے شور میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ جس طرف بھی نظر اٹھاتا ہے، حسرت و یاس جو فساد پذیر مادے کا لازمی نتیجہ ہے اسے ڈراتی اور دھمکاتی ہے۔

اسی دریا میں کبھی کبھی نسیمِ جاں بخش و روح پرور کا ایک جھونکا جس کو جذبہ کہا جاتا ہے اسے تھپکتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادِ مراد اسے ساحلِ مقصود تک پہنچا دے لیکن یہ بادِ مراد مستقل نہیں ہوتی صرف کبھی کبھی چلتی ہے۔

وَاِنَّ لِرَبِّكُمْ فِیْ اَیَّامِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٍ اَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَهَا وَلَا تَعَرَّضُوْا عَنْهَا۔

تمہاری زندگی میں تمہارے پروردگار کی طرف سے کچھ خوشگوار جھونکے آتے ہیں۔ ان سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو اور ان سے روگردانی ہرگز نہ کرو۔

اس موقع پر سالکِ راہِ خدا اسی جذبۂ الٰہی کے اثر سے یہ عزم کرتا ہے کہ اس عالمِ کثرت کو پار کر جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو رختِ سفر باندھ کر اس پُرخطر اور پُرپیچ وادی سے کوچ کر جائے۔ اسی سفر کو عارفوں کی اصطلاح میں سیر و سلوک کہتے ہیں۔

سلوک کے معنی ہیں راستا طے کرنا اور سیر کے معنی ہیں راستے میں جو منزلیں اور مقامات آئیں ان کی خصوصیات اور آثار کا مشاہدہ کرنا۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

اس روحانی سفر کا توشہ اور زادِ راہ مجاہدہ اور ریاضت ہے کیونکہ مادی تعلقات کو ترک کرنا کوئی آسان بات نہیں اس لیے سالک آہستہ آہستہ اس عالمِ کثرت کے پھندوں کو توڑ کر مادی دنیا سے سفر کرتا ہے۔

ابھی راستے کی تھکن دور بھی نہیں ہوتی کہ وہ عالمِ برزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی نفسانی خواہشات اور اندرونی خیالات کی دنیا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ دیکھتا ہے کہ خارجی اور مادی تعلقات کی کثرت نے خود اس کے قلب میں کتنا مواد جمع کر دیا ہے۔ یہ مواد دراصل اس کے وہ نفسانی خیالات اور خواہشات ہیں جو خارجی تعلقات کی کثرت کے نتیجے میں نمودار ہوتے ہیں جو انہیں کا ایک حصہ اور انہیں کے برگ و بار ہیں۔

سالک کے سفر میں یہ خیالات رکاوٹ بنتے ہیں جس سے اس کے دل کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ سالک چاہتا ہے کہ کچھ دیر ذکرِ خدا کا مزہ لے لیکن یہ خیالات اچانک اس پر سیلِ بلا بن کر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اسکی ہلاکت کے درپے ہو جاتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے کہ:

جان ہمہ روز از لگد کوب خیال
وز زیان و سود و وزیم زوال
نی صفا می ماندش و نی لطف و فر
نی بہ سوی آسمان راہ سفر

یعنی آدمی ہمیشہ خیالات کی ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ نفع ونقصان کا تصور اور زوال کا خوف اس کے سر پہ سوار رہتا ہے۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے نہ صرف اس کا چین و آرام ختم ہو جاتا ہے بلکہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف

سفر کی راہ بھی مسدود ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ذہنی خیالات کی کثرت کا نقصان اور تکلیف، بیرونی تعلقات کی کثرت کے نقصان اور تکلیف سے زیادہ قوی اور طاقتور ہوتی ہے کیونکہ یہ تو ممکن ہے کہ آدمی اپنی ذرا سی کوشش سے بیرونی تعلقات اور دلچسپیوں سے الگ تھلگ رہ کر ان کے تصادم سے محفوظ ہو جائے لیکن اس طرح وہ نفسیاتی خیالات کی تکلیف اور نقصان سے چھٹکارا نہیں پا سکتا کیونکہ یہ خیالات مستقل طور پر اسکے ساتھ ہیں۔

لیکن راہِ خدا کا مسافر اور بندگیٔ حق کا خلوصِ دل سے طالب ان دشمنوں سے ہراساں نہیں ہوتا بلکہ وہ کمرِ ہمت کو باندھ کر جذبۂ الٰہی کی مدد سے اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں رہتا ہے، یہاں تک کہ عالمِ خیالات سے جسے برزخ کہا جاتا ہے باہر نکل جاتا ہے۔ سالک کو ہمیشہ بہت ہوشیار اور بیدار رہنا چاہیے تاکہ اس کے دل کے کسی خفیہ گوشہ میں کوئی فاسد خیال چھپا ہوا نہ رہ جائے۔

ان خیالات کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ان کو باہر نکالا جاتا ہے تو یہ دل کے کسی مخفی کونے میں جا چھپتے ہیں۔ بیچارہ سالک دھوکے میں آ کر یہ سمجھتا ہے کہ اسے ان کے شر سے خلاصی مل گئی اور عالمِ برزخ کی باقیات میں سے اب کچھ اس کے ساتھ نہیں لیکن جب اس کو چشمۂ حیات کا راستہ مل جاتا ہے اور وہ آبِ حیات سے سیراب ہونا چاہتا ہے تو یہ خیالات اس پر اچانک حملہ کر دیتے ہیں اور تیغِ بلا بنکر اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔

اس سالک کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے اپنے گھر میں پانی کا حوض بنوایا ہو اور ایک مدت تک اس کو استعمال نہ کیا ہو۔ اس دوران

میں تمام آلودگیاں اور کثافتیں تہ نشین ہو گئی ہوں اور اوپر سے پانی بظاہر صاف ہو گیا ہو اور وہ یہ سمجھنے لگا ہو کہ پانی ہمیشہ کے لیے پاک و صاف ہو گیا لیکن جونہی وہ شخص حوض میں اترے یا کوئی چیز حوض میں دھوئے تو یہ تہ نشین کثافتیں پانی کو گندہ کر دیں اور ان کے سیاہ ٹکڑے پانی کی سطح پر نمودار ہو جائیں اس لیے سالک کے لیے ضروری ہے کہ مجاہدہ اور ریاضت کی مدد سے خیالات کو یکسو کرے تاکہ جو خیالی پیکر اس کے ذہن میں جم گئے ہیں وہ بار بار ابھر کر معبود کی طرف اس کی توجہ میں خلل انداز نہ ہو سکیں۔ آخر جب سالک عالمِ طبیعت یا عالمِ برزخ سے گزر کر روحانی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو اس کے بعد کچھ اور مراحل طے کرتا ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ آگے بیان کی جائے گی۔

مختصراً یوں سمجھیے کہ سالک توفیق الٰہی سے اپنے نفس اور صفات و اسمائے خداوندی کا مشاہدہ کرتا ہوا آہستہ آہستہ فنائے کلّی کے مرحلے تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد مقامِ بقاء تک پہنچتا ہے جہاں پہنچ کر وہ فانی فی اللہ کے بعد باقی باللہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہیں اس پر حیاتِ ابدی کا راز منکشف ہوتا ہے۔

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق
ثبت است در جریدهٔ عالم دوامِ ما

قرآن مجید کی آیاتِ کریمہ میں غور و تدبر کرنے سے بھی یہ اصول ثابت ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ

قُتِلُوا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ ۔

"جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ان کو مردہ مت سمجھو، وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس سے روزی پاتے ہیں۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۶۹)۔

سلوک کا آخری درجہ ذاتِ احدیت میں فنا ہو جانا اور وجہُ اللہ کے ساتھ باقی رہنا ہے۔

کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ[1]۔

"پروردگار کے وجہ کے سوا ہر چیز فانی ہے۔" (سورۂ قصص۔ آیت ۸۸)۔

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ ۔

"جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔" (سورۂ نحل۔ آیت ۹۶)۔

ان آیات کو باہم ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس سے رزق پاتے ہیں وہ 'وجہ اللہ' ہیں اور نصِ قرآنی کے مطابق وہ زوال اور ہلاکت سے کبھی دوچار نہیں ہوتے بعض

---

[1] "وجہ خدا" کے سوا ۔۔۔ جو اسمائے خداوندی ہے اور جس سے خداوند تعالےٰ تمام موجودات میں متجلّی اور ظاہر ہوتا ہے ۔۔۔ تمام موجودات فنا ہو جائیں گے بالفاظ دیگر "وجہ اشیاء یا وجہ موجودات" باقی رہے گا کہ وہی مظہریت خدا ہے۔ سادہ اور آسان الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اصلِ اشیاء کہ جس سے وہ قائم ہیں باقی رہتی ہے۔

دوسری قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہ اللہ سے مراد اسمائے الٰہی ہیں جو زوال ناپذیر ہیں۔

تفصیل اس کی یوں ہے کہ ایک اور آیت میں خود قرآن نے وجہ اللہ کی تفسیر اسمائے الٰہی سے کی ہے اور وجہ اللہ کی صفت عزت وجلال بیان کی ہے۔

سورۂ رحمٰن کی ۲۷ ویں آیت میں ارشاد ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

روئے زمین پر جتنے ذی روح ہیں سب فنا ہو جائیں گے، صرف آپ کے پروردگار کا 'وجہ' عظمت والا اور احسان والا باقی رہ جائے گا۔

اس پر سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں "ذو" کا لفظ وجہ کی صفت ہے۔ یعنی آپ کے پروردگار کا "وجہ" جو عظمت اور احسان والا ہے، باقی رہے گا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے ہر چیز کا وجہ (چہرہ) وہ ہوتا ہے جس سے اس کا سامنا ہو۔ اس بنا پر ہر چیز کا وجہ یا چہرہ اس چیز کا مظہر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مظاہر اس کے اسماء و صفات ہیں۔ انہیں کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کا تمام مخلوقات سے آمنا سامنا ہوتا ہے۔ اس وضاحت سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تمام موجودات فانی اور زوال پذیر ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے اسمائے جلالیہ اور جمالیہ کے۔ معلوم ہوا کہ جو سالکانِ راہ بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ کی سعادت سے فیضیاب ہوئے ہیں وہ درحقیقت حق تعالیٰ شانہٗ کے اسمائے جلالیہ و جمالیہ کے مظہر ہیں۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ائمہ طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین نے جو فرمایا ہے کہ نَحْنُ اَسْمَاءُ اللّٰہِ۔ اس سے کیا مراد ہے۔ اجتماعی حکومت یا امورِ شرعیہ و احکامِ دینیہ میں وساطت تو ایسا مرتبہ نہیں ہے جس کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جا سکے بلکہ اس کلمہ سے مراد وہی ذات احدیت میں فنا ہو جانا، وجہ اللہ کے ساتھ مستقل رہنا اور اللہ تعالےٰ کی صفاتِ جلالیہ و جمالیہ کا مظہر اتم بن جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رتبہ ایسا ہے کہ کسی مقام اور منصب کا اس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

سیر و سلوک سے متعلق ایک اہم اور ضروری چیز مراقبہ ہے۔ سالک کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ اس راہ میں قدم رکھے، اس وقت سے آخر تک مراقبہ سے غافل نہ رہے۔ یہ سالک کے لیے بہت ضروری چیز ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ مراقبہ کے بھی مختلف درجات اور مراتب ہیں۔ سالک ابتدائی مراحل میں ایک طرح کا مراقبہ کرتا ہے اور بعد میں ایک اور طرح کا۔ سالک جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی اس کا مراقبہ زیادہ دقیق اور عمیق ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا مراقبہ اس درجے کو پہنچ جاتا ہے کہ اگر وہی مراقبہ کسی مبتدی سے کرایا جائے تو وہ اس کو ہرگز نہ سہار سکے بلکہ یا تو سلوک کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دے یا پھر مجنوں یا ہلاک ہو جائے لیکن مراقبہ کے ابتدائی درجے طے کرنے اور سلوک کی راہ میں آگے بڑھنے کے بعد وہ، بعد کے مراقبہ کے اعلیٰ مراتب رفتہ رفتہ بجا لانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس وقت کے لیے بہت سی ایسی چیزیں ممنوع اور حرام ہو جاتی ہیں جو ابتدائی مراحل میں جائز اور مباح تھیں۔

اہتمام کے ساتھ سخت مراقبہ کے نتیجے میں سالک کے دل میں عشق و محبت کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں کیونکہ جمال و کمالِ مطلق سے عشق انسان کی فطرت میں داخل اور اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے لیکن مادیت کی محبت کا حجاب اس فطری عشق پر غالب آجاتا ہے اور اسے ظاہر نہیں ہونے دیتا:

حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب، کوئی پردہ نہ دیکھا

مراقبہ کے ذریعے آہستہ آہستہ یہ پردہ کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر بالکل اٹھ جاتا ہے۔ اس وقت وہ فطری عشق پوری آب و تاب سے ظاہر ہو کر انسان کے ضمیر کی رہنمائی مبداءِ کمال و جمال کی طرف کرتا ہے عارفوں کی اصطلاح میں اس مراقبہ کو مے یا شراب سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ بقول غالبؔ:

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

حافظؔ کہتا ہے:

ز پیرِ میکدہ گفتم کہ چیست راہ نجات
بخواست جامِ مے و گفت راز پوشیدن

عارفوں کے کلام میں:

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

جب عارف اس مراقبہ میں دوام پیدا کر لیتا ہے تو حق تعالیٰ کے فضل و کرم

سے اس پر انوار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ابتداء میں یہ انوار بجلی کی طرح چمکتے اور ایک دم غائب ہو جاتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ انوار قوی ہوتے جاتے ہیں اور چھوٹے ستاروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ پھر مزید قوی ہو کر پہلے چاند اور پھر سورج کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی روشن چراغ یا قندیل کی شکل میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان انوار کو عارفوں کی اصطلاح میں "نوم عرفانی" کہا جاتا ہے اور یہ **موجوداتِ برزخیہ** ہیں۔

جب سالک اس مرحلے سے گزر جاتا ہے اور اس کا مراقبہ مزید قوی ہو جاتا ہے اور وہ مراقبہ کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتا ہے تو اسے زمین و آسمان اور مشرق و مغرب سب روشن اور نورانی نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ **نورِ نفس کا نور** ہے جو عالمِ برزخ سے گزرنے پر نظر آتا ہے۔ عالمِ برزخ سے نکلنے کے ابتدائی مرحلے میں جب نفس کی تجلیات شروع ہوتی ہیں تو سالک اپنے آپ کو مادی صورت میں مشاہدہ کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسے بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے برابر کھڑا ہے۔ یہ مرحلہ تجردِ نفسی کی ابتداء ہے۔

علامہ الحاج مرزا علی قاضی رضوان اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک دن میں کمرہ سے دالان میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میں خود اپنے برابر ساکت و صامت کھڑا ہوا ہوں۔ میں نے غور سے دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ میرے چہرے پر گوشت پوست نہیں ہے۔ میں پھر کمرے میں گیا اور آئینے میں دیکھا تو میرا چہرہ ایسا خالی نظر آیا کہ ایسا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کا کہیں وجود ہی نہیں۔ وہ کوشش کرتا ہے لیکن اسے اپنا پتا نہیں ملتا لیکن یہ سب مشاہدات تجردِ نفس کے ابتدائی مرحلوں میں پیش آتے

ہیں اور زمان و مکان کی قیود سے آزاد نہیں ہوتے۔ اس کے بعد اگر توفیق الٰہی سالک کے شامل حال ہوئی تو وہ اگلے مرحلے میں زمان و مکان کی قیود سے آزاد اور بالاتر ہو کر اپنے نفس کی حقیقت کا مکمل مشاہدہ کر سکتا ہے۔

الحاج مرزا جواد ملکی تبریزی رضوان اللہ علیہ کے متعلق منقول ہے کہ چودہ سال تک دن رات آخوند ملا حسین قلی ہمدانی رضوان اللہ علیہ کی صحبت میں رہے اور ان سے حقیقت و معرفت کا درس لیتے رہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ایک دن استاد نے مجھ سے ایک شاگرد کا نام لیکر فرمایا کہ آج سے اس کی تربیت تمہارے ذمہ ہے۔ یہ شاگرد بڑا باہمت اور ارادے کا پکا تھا۔ چھ سال تک مراقبہ اور مجاہدہ کرتا رہا یہاں تک کہ وہ اس قابل ہو گیا کہ ادراکِ نفس و تجرد نفس کے مقام پر فائز ہو جائے۔ میں نے چاہا کہ اس شاگرد کو یہ سعادت خود استاد کے ہاتھ سے حاصل ہو چنانچہ میں اس کو اپنے ساتھ استاد کے دولت کدہ پر لے گیا اور استاد سے اپنا مدعا بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا: یہ کوئی بات نہیں۔ ساتھ ہی اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرمایا: تجرّد ایسا ہوتا ہے۔ وہ شاگرد کہتے تھے کہ میں نے فوراً دیکھا کہ میں اپنے بدن سے جدا ہو گیا ہوں اور ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا کہ میرے برابر میرے ہی جیسا ایک اور شخص موجود ہے۔

یاد رہے کہ برزخی موجودات کا مشاہدہ کچھ ایسا کمال نہیں ہے بلکہ نفس کا مکمل تجرد کی حالت میں مشاہدہ زیادہ بڑی بات ہے کیونکہ اس موقع پر نفس ایک مجرّد حقیقت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر مشرق و مغرب کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اس سے پہلے مراحل کا

جامعہ تعلیمات اسلامی

مشاہدہ ابتدائی اور جزئی مشاہدہ ہے اور یہ مشاہدہ گویا کہ کُل کا ادراک ہے۔

اخوندمرحوم کے مشہور اور ممتاز شاگرد مرحوم آغا سید احمد کربلائی رضوان اللہ علیہ ناقل ہیں کہ:

"ایک روز میں کسی جگہ آرام کر رہا تھا۔ اچانک کسی نے مجھے جگا کر کہا کہ اگر اسفہبدی نور دیکھنا چاہتے ہو تو فوراً اٹھ جاؤ۔ میں نے آنکھ کھولکر دیکھا تو مشرق و مغرب میں ہر طرف بے حد و حساب روشنی چھائی ہوئی تھی۔"

یہ تجلی نفس کا وہ مرحلہ ہے جو غیر محدود نور اور لامتناہی روشنی کی صورت میں نظر آتا ہے۔

جب خوش قسمت سالک اس مرحلے سے بھی گزر جاتا ہے تو وہ مراقبہ کا جس قدر اہتمام کرتا ہے اس کی مناسبت سے دوسری منزلیں طے کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ صفاتِ باری تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے یا اسمائے الٰہی کا بطور ایک صفتِ کلی کے احساس کرنے لگتا ہے۔ اس موقع پر سالک کو بسا اوقات یکایک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام موجودات علم کی ایک اکائی ہیں یا ایک طاقت کے سوا کسی دوسری طاقت کا قطعی کوئی وجود نہیں۔ یہ تو شہودِ صفات کا مرحلہ ہے۔ شہودِ اسماء کا مرحلہ اس سے بھی ارفع و اعلے ہے۔ اس مرحلے میں سالک یہ دیکھتا ہے کہ تمام جہانوں میں فقط ایک عالم ایک قادر اور ایک حیّ (زندہ) ہے۔ یہ مرتبہ صفات کے ادراک کے مرتبہ سے جو قلب میں پیدا ہوتا ہے بہت برتر اور کامل تر ہے (لِاَنَّ السَّالِكَ يُصْبِحُ وَلَا يَرٰى قَادِرًا وَّلَا عَالِمًا وَّلَا حَيًّا سِوَى اللّٰهِ تَعَالٰى) کیونکہ اس مرحلے میں سالک سوائے اللہ کے کسی کو عالم، قادر اور حیّ نہیں دیکھتا۔ شہود کا یہ درجہ عموماً قرآن مجید کی

جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی

تلاوت کے دوران حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کی تلاوت وہ خود نہیں بلکہ کوئی اور کر رہا ہے کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اور سن بھی رہا ہے۔

جاننا چاہیے کہ اس امر کے حصول میں قرآن مجید کی تلاوت کا بڑا اثر ہے۔ سالک کے لیے مناسب ہے کہ نمازِ شب پڑھے اور سورِ عزائم[1] کی تلاوت کرے کیونکہ سورہ پڑھتے ہوئے ایک دم سجدہ کرنا لطف سے خالی نہیں۔ تجربے سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ تیرۂ شبِ جمعہ، نماز میں سورۂ صٓ کی تلاوت اس مقصد کے لیے بہت ہی مؤثر ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کی یہ خصوصیت اس روایت سے بھی معلوم ہوتی ہے جو اس سورت کی تلاوت کے ثواب کے بارے میں آئی ہے۔

جب سالک توفیقِ الٰہی سے یہ مدارج طے کر لیتا ہے اور ان مشاہدات میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر جذباتِ الٰہی اس کا احاطہ کر لیتے ہیں اور ہر لمحہ وہ فنائے حقیقی سے نزدیک ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ جذبۂ الٰہی اس پر اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ وہ محبوبِ حقیقی کے جمال و کمال میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور جمالِ روئے یار کے مقابلے میں اس کو نہ اپنی ہستی کی طرف التفات باقی رہتا ہے اور نہ کسی اور ہستی کی طرف۔ اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ:

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهُ شَيْءٌ۔ "خدا ہی خدا تھا اور کچھ نہ تھا۔"

---

[1] سورۂ سجدہ، سورۂ حٰمٓ سجدہ، سورۂ نجم اور سورۂ علق۔

جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی

ایسی حالت میں سالک وحشتِ فرقت سے نکل کر مشاہدۂ ربانی کے دریائے بے پایاں میں غرق ہو جاتا ہے۔

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ سالک کے سلوک کے یہ معنی نہیں کہ عالم مادہ میں کسی چیز کا وجود باقی نہیں رہتا بلکہ سالک عین کثرت میں وحدت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ خارج میں کثرت علیٰ حالہٖ باقی رہتی ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے: میں تیس سال تک لوگوں کے درمیان رہا۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ میں ہر کام میں ان کا شریک اور ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوں حالانکہ میں نے اس مدت میں بجز خدا کے کسی کو جانا نہ پہچانا۔

اس حالت کا پیدا ہو جانا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ابتداء میں تو ممکن ہے کہ یہ حالت صرف ایک لمحے کے لیے پیدا ہو لیکن آہستہ آہستہ یہ وقفہ طویل ہوتا جاتا ہے۔ پہلے دس منٹ یا کچھ زیادہ' پھر گھنٹہ' پھر اس سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر خدا کا فضل شاملِ حال ہو تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اسی حالت کو دوام و قیام حاصل ہو جائے۔

اس حالت کو اخیار اور بزرگوں کے اقوال میں "بقاء بہ معبود" یا بقاء باللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آدمی' کمال کا یہ مرتبہ اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اپنی ہستی کو ذاتِ احدیت میں بالکل فنا نہ کر دے۔ اس مرتبہ پہ پہنچ کر سالک کو ذاتِ الٰہی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

کہتے ہیں کہ ایک مجذوب تھے جن کا نام تھا بابا فَرَجُ اللہ۔ وہ جذبۂ الٰہی کی تاثیر سے مجذوب ہو گئے تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ کچھ حال دنیا کا بھی بیان کیجیے۔ کہنے لگے کہ جب سے میں نے آنکھ کھولی ہے آج تک

دنیا دیکھی ہی نہیں۔ تمہیں کیا بتلاؤں ۱؎

ابتداء میں جب یہ شہود ابھی کمزور ہوتا ہے، اسے حال کہتے ہیں اور یہ سالک کے اختیار سے باہر ہوتا ہے مگر جب مراقبہ کی مداومت و مواظبت اور اللہ کی مدد سے یہ شہود حال سے گزر کر مقام بن جاتا ہے یعنی یہ کیفیت عارضی کے بجائے دائمی ہو جاتی ہے تو اس پر سالک کا اختیار ہو جاتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ قوی سالک وہی ہے جس کی توجہ ان احوال کے مشاہدہ کے ساتھ ساتھ عالم کثرت کی طرف بھی باقی رہے اور جو عالم کثرت اور

۱؎ بابا فرج مجذوب کے حالات "تاریخ حشری" نامی کتاب میں دستیاب ہیں۔ اس کتاب میں تبریز کے عارفوں اور بزرگوں کے احوال جمع کیے گئے ہیں۔ اسی کتاب میں بابا فرج کا یہ قول نظم میں بیان کیا گیا ہے کہ "جب سے فرج نے آنکھ کھولی ہے دنیا پر اس کی نگاہ ہی نہیں پڑی۔"

ایسا ہی ایک شعر حافظ کا ہے:

منم کہ شہرۂ شہرم بہ عشق ورزیدن
منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

(میں عاشقی میں تو شہر بھر میں مشہور ہوں لیکن میں نے کبھی بری نگاہ نہیں ڈالی)۔

ابنِ فارض کا شعر ہے:

وَحَیَاۃِ اَشْوَاقِیْ اِلَیْکَ وَتُرْبَۃِ الصَّبْرِ الْجَمِیْلِ
مَا اسْتَحْسَنَتْ عَیْنِیْ سِوَاکَ وَلَا صَبَوْتُ اِلٰی خَلِیْلِ

(تیرے وصال کی آرزو اور اپنے صبرِ جمیل کی قسم! تیرے سوا نہ کوئی میری نظروں میں سمایا اور نہ میں کسی محبوب پر فریفتہ ہوا)۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

عالمِ وحدت دونوں سے تعلق کو بحسن وخوبی نبھائے۔ یہ بہت ہی اونچا مرتبہ ہے اور بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے بلکہ شاید انبیاء و اولیاء اور ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جن پر اللہ تعالیٰ کی خاص نظرِ عنایت ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو لِیْ مَعَ اللہِ حَالَاتٌ لَایَسَعُهَا مَلَکٌ مُقَرَّبٌ[1] کی نعمت سے بھی بہرہ ور ہیں اور اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ[2] کا جلوہ بھی ان کی شان سے ہویدا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ معارفِ الٰہیہ کے ان اعلیٰ مناصب تک صرف انبیائے عظامؑ اور ائمہ کرامؑ ہی پہنچ سکتے ہیں، دوسروں کی وہاں تک رسائی کہاں؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ نبوت و امامت تو واقعی مخصوص منصب ہیں جن تک کسی دوسرے کی رسائی نہیں، لیکن توحیدِ مطلق اور فنا فی اللہ کے مقام تک رسائی جسے ولایت بھی کہا جاتا ہے قطعاً نبیوں اور اماموں سے مخصوص نہیں بلکہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام نے خود امت کو مرتبۂ کمال تک پہنچنے کی دعوت دی ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت سے فرمایا ہے کہ میرے قدم بقدم چلو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس منزل تک سیر ممکن ہے، ورنہ اس ہدایت کا لغو ہونا لازم آئے گا۔ قرآن مجید میں ہے: لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ

---

[1] "اللہ کے ساتھ میرے تعلق کے جو حالات ہیں، مقرب ترین فرشتہ بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔" یہ حدیثِ امام ہے۔

[2] "میں تم جیسا ہی ایک بشر ہوں۔" قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا حضور رسالتمآبؐ کو ارشاد ہے کہ مشرکین سے کہہ دیجیے کہ میں بھی تم جیسا ہی ایک انسان ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ میرے پاس وحی آتی ہے۔"

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامع تعلیمات اسلامی

لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔

"تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ کی پیروی ہی اچھا طریقہ ہے۔ ان کے لیے جن کو اللہ سے ملنے اور یوم آخرت کی توقع ہے اور جو اللہ کو خوب یاد کرتے ہیں۔" (سورہ احزاب۔ آیت ۲۱)

کتب عامہ میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَوْلَا تَكْثِيْرٌ فِيْ كَلَامِكُمْ وَتَمْرِيْجٌ فِيْ قُلُوْبِكُمْ لَرَاَيْتُمْ مَا اَرٰى وَلَسَمِعْتُمْ مَا اَسْمَعُ۔

"اگر تم بہت زیادہ باتیں نہ کیا کرتے اور تمہارے دلوں میں گھبراہٹ نہ ہوتی تو تم بھی وہی دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں اور وہی سنتے جو میں سنتا ہوں۔" اس روایت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کمالات حاصل نہ کرسکنے کا اصل سبب باطل شیطانی خیالات اور لغو اور بیہودہ حرکات ہیں۔ شیعہ طرق سے بھی ایک روایت آئی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

لَوْلَا اَنَّ الشَّيَاطِيْنَ يَحُوْمُوْنَ حَوْلَ قُلُوْبِ بَنِيْ اٰدَمَ لَرَاَوْا مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

اگر بنی آدم کے دلوں کے گرد شیطان گردش نہ کرتے ہوتے تو وہ ضرور زمین و آسمان کی ساری بادشاہت دیکھتے۔

اس بلند انسانی رتبے کے اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ اس مرتبۂ عالیہ پر فائز شخص اپنی صلاحیت اور طاقت کے مطابق عوالم الغیبہ کا احاطہ کرلیتا ہے۔ نتیجتاً وہ کائنات کے ماضی و مستقبل پر آگاہی اور اس میں

تصرف کرنے لگتا ہے کیونکہ جس چیز پر وہ محیط ہوتا ہے اس پر اُسے پورا تسلط ہوتا ہے' ہر ایک کے ساتھ اور ہر جگہ۔

مشہور عارف شیخ عبدالکریم جیلی اپنی کتاب "الانسان الکامل" میں لکھتے ہیں: مجھے خوب یاد ہے کہ ایک بار مجھ پر ایک خاص حالت طاری ہوئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا میں تمام موجودات کے ساتھ مل کر ایک ہو گیا ہوں اور ہر چیز میری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ حالت ایک لمحے سے زیادہ دیر قائم نہیں رہی۔

ظاہر ہے کہ اس حالت کے برقرار نہ رہنے کی وجہ جسمانی ضرورتوں میں مشغولیت ہے۔ اس مرتبہ میں کمال اس وقت حاصل ہوتا ہے جب جسمانی امور کو کلیتہً ترک کر دیا جائے۔ ایک مشہور صوفی بزرگ کا قول ہے کہ: مادی ارتقاء کے آثار سے مکمل فراغ اس مادی دنیا سے گزرنے اور موت کے پانچ سو سال بعد حاصل ہوتا ہے۔ یہ مدت ایام الٰہی کے آدھے دن کے برابر ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے:

وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

"آپ کے پروردگار کے نزدیک ایک دن برابر ہے ہزار سال کے جس طرح کہ تم حساب لگاتے ہو"

جیسا کہ ظاہر ہے' اس جہان کے درجات اور فیوض کی کوئی حد نہیں ہے اور چونکہ الفاظ' انسانی ضرورتوں کی بنیاد پر وضع کیے گئے ہیں اور ان ضرورتوں کے دائرے کی وسعت کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ وضع ہوتے رہتے ہیں اس لیے ربانی حقائق اور انوار کو الفاظ سے ادا کرنا ناممکن ہے۔ جو کچھ

جامعہ تعلیمات اسلامی

کہا گیا ہے' یہ صرف اشارہ اور کنایہ تک محدود ہے۔ حقائق عالیہ کو اس طرح بیان کرنا کہ وہ پوری طرح سمجھ میں آجائیں غیر ممکن ہے۔

اَنْتَ فِیْ اَظْلَمِ الْعَوَالِمِ۔ (تم تاریک ترین عالم میں ہو) کے نقش کے مطابق مادی انسان خدا کے بنائے ہوئے جہانوں میں سے تاریک ترین جہان یعنی اس تیرہ خاکدان میں زندگی بسر کرتا ہے۔

بقول اقبالؔ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

انسان مادی دنیا میں جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اس کی بنیاد پر اپنی روزمرہ کی ضرورت کے مطابق الفاظ وضع کرتا ہے۔ اسے دوسرے جہانوں' ان کے تعلقات' وہاں کے انوار اور ارواح کا کوئی علم نہیں اس لیے وہ ان کے لیے الفاظ بھی وضع نہیں کرسکتا۔ اس وجہ سے دنیا کی کسی زبان میں ایسے الفاظ موجود نہیں جو بلند تر حقائق اور معانی کو بیان کرسکیں۔ جب ہمارا علم محدود اور ہماری فکر ناقص ہے تو پھر یہ مسئلہ حل ہو تو کیونکر ہو؟

دو گروہوں نے ان حقائق کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ پہلا گروہ تو انبیائے کرام علیہم السلام کا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا رابطہ ان جہانوں سے رہا ہے جو ماورائے مادہ ہیں لیکن وہ بھی نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِیَاءِ اُمِرْنَا اَنْ نُکَلِّمَ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ (ہم پیغمبروں کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں سے اس طرح بات کریں جو ان کی عقل میں آسکے) کے مطابق مجبور تھے کہ حقائق کی اس طرح تعبیر کریں جو عوام الناس کے لیے قابل فہم ہو لہٰذا

جامعہ تعلیمات اسلامی

انہوں نے بھی انوار کی حقیقت کے اور ان کی درخشندگی و تابانی کے بیان سے صرفِ نظر کیا اور ان حقائق کو بیان نہیں کیا جو انسان کے لیے قطعاً ناقابل فہم تھے۔ اس حقیقت کو کہ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ۔ (نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی انسان کے ذہن میں آئی) جنت اور حور و قصور وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرنے پر اکتفا کی، بلکہ تو د آخر میں اعتراف کیا کہ ان جہانوں کے حقائق ناقابل بیان ہیں۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو انبیاء کی راہ پر چل کر اپنے اپنے ظرف اور استعداد کے مطابق ان حقائق کے ادراک سے مشرف ہوئے۔ ان لوگوں نے بھی استعارہ اور تمثیل کے پردے میں بات کی ہے۔

خلوص و اخلاص

یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ ان مقامات اور درجات تک پہنچنا راہِ حق میں خلوص کے بغیر ممکن نہیں۔ جب تک سالک مخلصین کے درجے پر نہ پہنچ جائے اس پر حقیقت کا انکشاف نہیں ہوتا۔

پھر اخلاص کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اخلاص تو یہ ہے کہ دینی احکام کی بجا آوری اور طاعت صرف اللہ کے لیے ہو اور اخلاص کی دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی خود اپنی ذات کو اللہ کے لیے خالص کر دے۔ پہلی صورت پر یہ آیتِ کریمہ دلالت کرتی ہے۔ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ

جامعہ تعلیمات اسلامی

الدِّیْنَ یعنی ان کو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور انکی عبادت صرف اس کے لیے ہو (سورۂ بیّنہ - آیت ۵)۔

دوسرے معنی پر یہ آیۂ مبارکہ دلالت کرتی ہے اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الْمُخْلَصِیْنَ یعنی بجز اللہ کے منتخب اور خاص الخاص بندوں کے (سورۂ صافات - آیت

اسی طرح مشہور حدیث نبوی ہے .مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا ظَھَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَۃِ مِنْ قَلْبِہٖ اِلٰی لِسَانِہٖ۔

یعنی جو شخص اس مقام پر پہنچ جائے کہ اپنے آپ کو اللہ کے لیے خالص کردے" الخ دوسرے معنی پر دلالت کرتی ہے۔ توضیح اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے قرآن کریم میں کہیں تو صالح کو عمل کی صفت کے طور پہ بیان کیا گیا ہے جیسے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا (جس نے نیکی کی) یا مَنْ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (جس نے کوئی نیک کام کیا) اور کہیں صالح خود انسان کو کہا گیا ہے جیسے اِنَّہٗ مِنَ الصَّالِحِیْنَ یا وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اسی طرح خلوص اور اخلاص کو کہیں تو عمل سے منسوب کیا گیا ہے اور کہیں انسان کی ذات سے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اخلاص کا تحقق بہر صورت انسان کے اپنے اعمال پہ ہی موقوف ہے۔ جب تک کوئی شخص اپنے ہر فعل و عمل، حرکت و سکون اور گفتار و کردار میں اخلاص پر عمل نہیں کرے گا، وہ ذاتی طور پہ مخلص نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ۔

اگر "یرفع" کی ضمیر فاعلی کا مرجع 'العمل الصالح' کو قرار دیا جائے تو تقدیر عبارت یوں ہوگی اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُ الْکَلِمَ الطَّیِّبَ۔

یعنی "عمل صالح ہی بلند کرتا ہے اچھی بات کو۔"

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب کوئی شخص ذاتی اخلاص کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے اور اس عظیم نعمت اور موہبتِ الٰہی کو حاصل کر لیتا ہے تو وہ ایسی خصوصیات سے مشرف اور بہرہ ور ہو جاتا ہے جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتیں۔

ان خصوصیات میں سے پہلی تو یہ ہے کہ نصِ قرآنی کے مطابق پھر شیطان کو کسی طور بھی اس پر تسلط اور اقتدار حاصل نہیں رہتا۔ قرآن کریم میں شیطان کا قول نقل کیا گیا ہے۔ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ "قسم ہے تیری عزت و جلال کی کہ میں ضرور بہکاؤں گا سب انسانوں کو سوائے تیرے ان بندوں کے جو خالص کر لیے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مخلص بندوں کا استثناء اس لیے نہیں ہے کہ شیطان خدا کے کسی حکم کی وجہ سے مجبور ہے بلکہ استثناء کا سبب یہ ہے کہ مقامِ توحید میں ان بندوں کے رسوخ کی وجہ سے شیطان اب ان پر حاوی نہیں ہو سکتا اور ان کے اس مقام پہ پہنچ جانے کے بعد خود اس کی اپنی کمزوری کے باعث اس کا ان پر بس نہیں چلتا۔ چونکہ مخلصین نے اپنے آپ کو خدا کے لیے خالص کر لیا ہے' اس لیے وہ جدھر بھی نظر ڈالتے ہیں ان کو خدا ہی نظر آتا ہے۔ شیطان جس شکل و صورت میں بھی ان کے سامنے آئے وہ اس شکل میں خدا ہی کا جلوہ دیکھتے ہیں اور اس جلوہ سے استفادہ کرتے ہیں اس لیے شیطان نے شروع ہی سے ان کے مقابلے میں اپنے عجز و بیچارگی کا اعتراف کر لیا ہے" ورنہ شیطان کا تو کام ہی بنی آدم کو بہکانا ہے اور کوئی اس کو گمراہی پھیلانے سے باز نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی وہ کسی پر رحم کرتا ہے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامع تعلیمات اسلامی

دوسری بات یہ ہے کہ یہ گروہ محشر کے عالمگیر محاسبہ اور محشر میں موجودگی سے مستثنیٰ ہے۔ قرآن مجید میں ہے :

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ۔

"جب صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین میں ہر ایک کے ہوش اڑ جائیں گے بجز اس کے کہ جس کو اللہ چاہے"

(سورۂ زمر۔ آیت ۶۸)

یہ آیت حتمی طور پر یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایک جماعت جس کی تصریح نہیں کی گئی قیامت کی گھبراہٹ اور جزع و فزع سے محفوظ و مامون رہے گی۔ جب اس آیت کو ایک دوسری آیت فَإِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ إِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِينَ۔ لوگ ضرور (روزِ محشر) حاضر کیے جائیں گے مگر ہاں جو اللہ کے خالص کیے ہوئے بندے ہیں (سورۂ صافات۔ آیت ۱۲۸) کے ساتھ ملایا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ جماعت عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِينَ کی ہے۔ اللہ کے مخلص بندوں کے اعمال کی ماہیت ایسی نہیں ہوتی کہ انہیں میدانِ حشر میں حساب و کتاب کے لیے حاضر کیا جائے۔ یہ لوگ پہلے ہی مراقبہ، شرعی ریاضت اور جہادِ نفس کے نتیجے میں مقتول ہو کر حیاتِ ابدی حاصل کر لیتے ہیں۔ ان پر پہلے ہی قیامت گزر چکی ہوگی اور مجاہدوں کے دوران ہی ان کا حساب ہو چکا ہوگا۔ یہ تو مقتول فی سبیل اللہ ہونے کی بنا پر حیاتِ ابدی کی خلعت سے ممتاز اور اپنے پروردگار کے خزانۂ غیب سے روزی پانے والے ہیں۔

جامع تعلیمات اسلامی

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ۔

"جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں ان کو مردہ مت سمجھو۔ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس روزی پاتے ہیں"۔

اس کے علاوہ حاضر تو اس کو کیا جاتا ہے جو موجود نہ ہو۔ یہ تو قیامت کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے ہی موجود اور مطلع ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے پاس روزی پاتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو ثواب کسی کو ملتا ہے اور قیامت میں جو اجر کسی کو ملے گا وہ اس کے اعمال کا بدلہ ہوگا لیکن بندگانِ خدا کی اس جماعت پر جو رحمتیں نازل ہوں گی وہ اعمال کی جزا سے ماوراء ہوں گی۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ۔

"تم کو اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو عمل تم کرتے تھے، مگر ہاں جو اللہ کے خالص کیے ہوئے بندے ہیں"۔ (سورۂ صافات۔ آیات ۳۹-۴۰)۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں کو عذاب دیا جائے گا وہ ان کے گناہوں کی پاداش ہوگی۔ مگر خدا کے نیک بندوں کو جو اجر ملے گا وہ ان کے اعمال کی جزا نہیں بلکہ خداوند منان کا لطف و کرم ہوگا۔

اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ آیت اپنے مفہوم میں مطلق ہے۔ اس کے مخاطب خاص اہلِ عذاب نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں بندوں پر اللہ کے فضل و کرم اور اعمال کی جزا میں کوئی منافات نہیں۔ اللہ کے فضل کا تو یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ چھوٹے سے عمل کے بدلے میں بہت سا ثواب عنایت فرمائے

جامع تعلیمات اسلامی

اور چھوٹے عمل کو بڑا عمل قرار دیدے مگر جزا رہی عمل ہی کے بدلے میں جبکہ مذکورہ بالا آیت سے کچھ اور مستفاد ہوتا ہے۔ آیت کریمہ کا مفہوم تو یہ ہے کہ خدائے متعال اپنے مخلص بندوں کو جو جزا عطا فرمائے گا وہ قطعاً کسی عمل کے بدلے میں نہیں ہوگی۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

لَهُم مَّا يَشَاۤءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ۔

"ان کے لیے جنت میں وہ سب ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس کے سوا ابھی بہت کچھ ہے۔" (سورۂ قٓ۔ آیت ۳۵)

یعنی اہل جنت کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جس کا انسان ارادہ یا خواہش کرسکتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی خواہش اور ارادے سے بڑھ کر بھی ان کے لیے ہمارے پاس موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کا فضل اور احسان اہل جنت کی خواہش بلکہ ان کے تخیل کی پرواز سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ نکتہ توجہ اور غور کے قابل ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس جماعت کا مرتبہ اتنا اونچا اور حیثیت اتنی بلند ہے کہ یہ جناب باری تعالیٰ کی حمد و سپاس اس کی ذاتِ اقدس کے شایانِ شان طریقے پر بجا لاسکتی ہے۔ خود حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُونَ إِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِينَ۔

"اللہ پاک ہے اس سے جو یہ بیان کرتے ہیں مگر ہاں جو اللہ کے خالص کیے ہوئے بندے ہیں۔" (سورۂ صافات۔ آیت ۱۶۰)

یہ وہ انتہائی بلند مقام اور اعلیٰ ترین منصب ہے جو کسی انسان کو مل سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ سلوک کے آخری مرحلے یعنی مُخلَصِین کے مقام کے کیا فیوض و برکات ہیں لیکن یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان فیوض و برکات کا ظہور اسی وقت ممکن ہے جبکہ سالک کا مجاہدہ اس قدر بڑھا ہوا ہو کہ اسے مقتول فی سبیل اللہ کہا جا سکے اور وہ اس طرح درجۂ شہادت پر فائز ہو جائے جس طرح میدانِ جنگ میں شہید کی روح اور اس کے بدن کے تعلق کو ظاہری تلوار کاٹ دیتی ہے۔ اسی طرح سالکِ راہِ خدا بھی اپنی روح کا تعلق جسم اور اس کے متعلقات سے نفسِ امارہ سے جنگ کے نتیجے میں باطنی تلوار سے منقطع کر لیتا ہے اور اس سلسلے میں اپنی جسمانی قوت کے بجائے رحمانی قوت اور مدد کا استعمال کرتا ہے۔

ابتدائے سلوک میں سالک کو چاہیے کہ وہ زہد و قناعت کی زندگی اختیار کرے۔ دنیا کی بے وقعتی اور اس سے وابستگی کے بے فائدہ ہونے پر غور کرتا رہے اور اس طرح اس عالمِ کثرت سے اپنا تعلق منقطع کرے کیونکہ زہد و قناعت اور امورِ دنیا سے بے رغبتی کے نتیجہ میں اسے نہ کسی مادّی فائدے سے کوئی خوشی ہو گی اور نہ کسی ایسے واقعے سے جو کسی مادّی نقصان کا باعث ہو، کوئی رنج ہو گا۔

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ.

"تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے اس پر رنج نہ کرو اور جو کچھ تمہیں عطا ہو اس پر اتراؤ نہیں۔" (سورۂ حدید۔ آیت ۲۳)

خوشی اور رنج کی طرف سے بے توجہی اور بے التفاتی کا یہ مطلب نہیں کہ سالک، اللہ کے انعام و احسان سے بھی خوش نہیں ہوتا اور کسی ایسی

جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی

بات سے بھی رنجور نہیں ہوتا جس سے اللہ کی ناراضگی کا احتمال ہو کیونکہ اللہ کے انعام واکرام پر خوشی دنیا کے مال ومنال اور اعتباریات (مثلاً منصب عزت، شہرت، انانیت وغیرہ) کی محبت کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے دریائے رحمت میں غرق دیکھتا ہے۔

اس مرحلے سے گزر جانے پر سالک کو احساس ہو گا کہ اس کی اپنی ذات میں دلچسپی، عشق کی حد تک ہے۔ وہ جو مجاہدہ کرتا ہے وہ بھی اسی لیے کرتا ہے کیونکہ اس کو اپنی ذات سے محبت ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے وہ بڑی حد تک خود غرض ہوتا ہے اور ہر چیز کو اپنی ذات پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اپنے وجود کی بقاء کے لیے وہ کسی چیز کو بھی فنا کے گھاٹ اتارنے سے دریغ نہیں کرتا۔ انسان کی اس جبلت کو ختم کرنا بہت ہی مشکل ہے اور اسی لیے آدمی کا اپنی خود غرضی اور خود خواہی پر قابو پانا سب سے زیادہ دقت طلب بات ہے۔ ادھر جب تک خود غرضی کا احساس ختم نہ ہو، دل میں نورِ الٰہی کی تجلی کا ظہور نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر جب تک سالک اپنی ذات کو فنا نہ کر دے، خدا سے اسکا تعلق قائم نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ ضروری ہے کہ خدا کے لطف وکرم کی مدد سے سالک حبِّ ذات کو رفتہ رفتہ کمزور اور بالآخر بالکل فنا کر دے۔ اس اندرونی بت کو جو تمام فساد کی جڑ ہے پاش پاش کر کے طاق نسیاں پر رکھ دے تاکہ وہ جو کام بھی کرے وہ خالص اللہ کے لیے ہو جائے اور حبِّ ذات، حبِّ الٰہی میں تبدیل ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مجاہدہ ضروری ہے۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد سالک کی وابستگی اس کے جسم اور

جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی

اس کے آثار سے بلکہ روح سے بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اب وہ جو کام بھی کرتا ہے، وہ خدا کے لیے ہوتا ہے۔ اگر وہ بھوک مٹانے کے لیے کھانا کھاتا ہے یا بقدرِ ضرورت سامانِ زندگی فراہم کرتا ہے، تو وہ محض اس لیے کہ اس کا محبوب ازلی یہ چاہتا ہے کہ وہ زندہ رہے، ورنہ وہ تو اس دنیاوی بقاء کے لیے ہرگز کوئی قدم نہ اٹھاتا۔ اس کی خواہش خدا کی مرضی کے عین مطابق ہوتی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسی وجہ سے سالک کشف وکرامات کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اسے کوئی حق نہیں کہ وہ کوئی ایسا عمل، ریاضت یا ذکر کرے جس کا مقصد غیب کی باتیں معلوم کرنا، زمین کے فاصلے طے کرنا، لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کرنا، کائنات میں کسی طرح کا تصرف کرنا یا قوائے نفسانی کو کسی طرح کی تقویت پہنچانا ہو۔ اس لیے کہ ایسا کوئی بھی عمل رضائے محبوب کے لیے نہیں ہوگا۔ نہ وہ خدا کی پُرخلوص عبادت ہوگی بلکہ ایسے اعمال کا مطلب خود اپنے نفس کی پرستش اور نفسانی خواہشات کو پورا کرنا ہوگا۔ گو متعلقہ شخص اس قباحت کا اعتراف نہ کرے اور گو بظاہر اس کی تمام عبادت خدا ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص بموجب نصِ قرآنی أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ کیا آپ نے اس شخص کی حالت نہیں دیکھی جس نے اپنی خواہشِ نفسانی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ (سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۳) گویا وہ اپنی خواہشِ نفسانی کی پرستش کرتا ہے۔ سالک کو چاہیے کہ وہ اس منزل سے دامن بچا کر گزر جائے اور اپنے نفس کی انانیت پر قابو پالے۔ اس بارے میں ہم انشاء اللہ مزید گفتگو کریں گے۔

جب سالک اس منزل پر پہنچتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کی وہ دلچسپی جو اس کی اپنی ذات میں تھی گو وہ خدا ہی کے لیے تھی ختم ہونے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ اپنے آپ کو بالکل بھول جاتا ہے۔ اب اسے جمال ازلی وابدی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور آخر کار وہ اس بحرِ بیکراں میں غرق ہو جاتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ سالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کیساتھ جنگ میں شیطانی لشکر پر مکمل غلبہ حاصل کرے۔ کوئی نفسانی خواہش دل کے کسی مخفی گوشے میں چھپی ہوئی نہ رہ جائے۔ مال و جاہ اور منصب کی محبت، تکبر، عزت و شہرت کی خواہش اور اپنی ذات سے محبت کا اگر کوئی شائبہ بھی باقی رہ گیا تو کمال حاصل نہیں ہو سکتا اسی لیے دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے صاحبانِ فضل و کرامت برسوں کے مجاہدہ اور ریاضت کے بعد بھی سلوک میں کمال حاصل نہ کر سکے اور نفس سے جنگ میں شکست کھا گئے۔ وجہ یہی تھی کہ ان کے دلوں کی صفائی پوری طرح نہیں ہوئی تھی اور خواہشاتِ نفسانی کی جڑیں ابھی ان کے دل کے کسی گوشے میں باقی تھیں لیکن انہوں نے سمجھ لیا کہ تمام صفاتِ ذمیمہ و اخلاق قبیحہ کی جڑیں بالکل کٹ چکی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب امتحان کا وقت آیا اور نفس کو ابھرنے کا موقع ملا تو ان دبی ہوئی خواہشات نے پھر سر اٹھا لیا اور لگے ان میں کلّے پھوٹنے اور پھول کھلنے، اور اسی میں سالک بیچارے کا کام تمام ہو گیا۔

نفس اور اس کے لشکر پر غلبہ کی توفیق پروردگار عالم کی عنایتِ خاص پر موقوف ہے کیونکہ یہ مرحلہ اس کی توفیق اور دستگیری کے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔

کہتے ہیں کہ ایک دن مرحوم سید بحر العلوم رضوان اللہ علیہ کو لوگوں نے دیکھا تو بہت ہشاش بشاش پایا۔ وجہ پوچھی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ آج ۲۵ سال کے مجاہدہ کے بعد میں نے غور کیا تو دیکھا کہ اب میرے اعمال میں ریا کا اثر باقی نہیں رہا اور اب میں ریا کو پورے طور پر ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اس قصے میں جو سبق موجود ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کو خوب ذہن نشین کر لیا جائے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ سلوک کی ابتداء سے اس کی انتہا تک سالک کے لیے تمام امور میں شریعت کی پابندی لازمی اور ضروری ہے۔ ظاہری شریعت سے سرمو تفاوت بھی جائز نہیں۔ اگر کسی کو دیکھو کہ سلوک کے دعوے کے باوجود تقوٰی و ورع کے اصولوں کا پابند نہیں اور شریعت کے تمام احکام کی مکمل پیروی نہیں کرتا اور شریعتِ حقہ کی بتلائی ہوئی صراطِ مستقیم سے سرمو بھی تفاوت کرتا ہے تو اس کو منافق سمجھو۔ ہاں اگر کسی عذر کی وجہ سے یا بھولے سے کوئی غلطی ہو جائے تو دوسری بات ہے۔ یہ جو سننے میں آتا ہے کہ بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ مقاماتِ عالیہ تک وصول اور فیوضاتِ ربانی سے سرفرازی کے بعد سالک احکامِ شریعت کا مکلف نہیں رہتا (یعنی اس کے لیے احکام شرعی مثلاً عبادات و معاملات ساقط ہو جاتے ہیں)۔ بالکل جھوٹ اور بہت بڑا بہتان ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اشرفِ موجودات اور اکرم خلائق تھے، اس کے باوجود زندگی کے آخری لمحے تک تمام احکامِ شریعت کی پابندی کرتے رہے لہٰذا مکلف نہ رہنے کی بات اس معنی میں تو بالکل جھوٹ اور بہتان ہے البتہ اس قول کے ایک اور معنی

جامعہ تعلیمات اسلامی

لیے جا سکتے ہیں، گو وہ معنی ان لوگوں کا مقصود نہیں ہیں جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ معنی یہ ہیں کہ عبادت سے متعلق احکام آدمی اپنی ذات کی تکمیل اور اس مقصد سے بجالاتا ہے کہ وہ بالفعل اس مرتبہ تک پہنچ سکے جس تک پہنچنے کی استعداد اس کے اندر بالقوہ موجود ہے۔ اس بنا پر جو لوگ ہر لحاظ سے ابھی تک وہ مرتبۂ واقعی حاصل نہیں کر سکے جس کی ان میں صلاحیت اور استعداد ہے۔ ان کی عبادت تکمیلِ ذات کے لیے ہوتی ہے لیکن جو لوگ بالفعل اس مرتبہ تک پہنچ چکے ہیں ان کے لیے تکمیلِ ذات کی کوشش اور مقامِ قرب کی تحصیل کے کوئی معنی نہیں۔ ایسے شخص کے لیے عبادت کا مقصد کچھ اور ہوگا۔ وہ اصل میں اس لیے عبادت کریگا کہ اس نے جو کمال پیدا کیا ہے اس کا مقتضیٰ یہی ہے اسی لیے جب بی بی عائشہ نے حضرت رسول اکرمؐ سے پوچھا کہ جب خداوند تعالیٰ نے آپ کی شان میں فرمایا ہے:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔

"تاکہ خداوند تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے (سورۂ فتح۔ آیت ۲) تو پھر آپ عبادات میں اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بعض نفوسِ بشریہ کے لیے عبادات کی بجاآوری تکمیلِ ذات کے لیے نہیں بلکہ خدائے منعم کی شکر گزاری کے لیے ہوتی ہے۔

مراقبہ اور مجاہدہ کے نتیجہ میں سالک کو جو احوال پیش آتے ہیں یا جو انوار نظر آتے ہیں ضروری ہے کہ وہ سب ایک خاص ملکہ کے حصول کا پیش خیمہ ہوں ورنہ سالک کی حالت میں محض تغیر کا پیدا ہونا کافی نہیں۔ سالک کو

لازم ہے کہ مجاہدہ کے ذریعے سے کوشش کرے کہ عالمِ سفلی کی تمام باقیات کو جو اس کی ذات میں مخفی اور پوشیدہ ہوں بالکلیہ زائل کر دے۔ جب تک دنیا کے پاک لوگوں کے ساتھ مناسبت اور مشابہت پیدا نہ ہو جائے انکے مراتب تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں بلکہ سلوک و مجاہدہ میں ذراسی لغزش سے تنزل اور عالمِ سفلی کی طرف رجعت کا اندیشہ ہے۔

آیت کریمہ: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ۔

(نہیں ہیں محمدؐ مگر ایک رسول۔ ان سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں۔ اب اگر وہ مرگئے یا قتل ہو گئے، تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (سورۃ آل عمران۔ آیت ۱۴۴) سے بھی اس نکتہ پر روشنی پڑتی ہے۔

لہذا سالک کو چاہیے کہ اپنا ظاہر و باطن پوری طرح پاکیزہ بنائے اور اپنے دل کے تمام گوشوں کو پاک کرے تاکہ اس کو ارواح طیبہ کی صحبت اور ملاءِ اعلیٰ کے پاکیزہ نفوس کی ہمنشینی کی سعادت حاصل ہو سکے۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ "چھوڑ دو ظاہری گناہوں کو بھی اور باطنی گناہوں کو بھی" (سورۃ انعام۔ آیت ۱۲۰)۔ اس آیت کی بنا پر سالک کو چاہیے کہ وہ ان تمام عالموں کو طے کرے جن کا طے کرنا عالمِ خلوص تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔

خداوندِ تبارک و تعالیٰ نے اس کا اجمالی بیان اس آیت میں فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الْفَائِزُوْنَ ۔ یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔

"وہ لوگ جو ایمان لائے، اللہ کے واسطے ترکِ وطن کیا، اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کیا، اللہ کے نزدیک ان کا درجہ بہت بلند ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا پروردگار ان کو بشارت دیتا ہے اپنی طرف سے رحمت کی، اپنی رضا کی اور جنت کے ایسے باغوں کی جن میں انکے لیے دائمی نعمتیں ہیں، ان میں یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔" (سورۂ توبہ آیت ۲۰)

اس آیت کی بنا پر عالمِ خلوص سے پہلے چار عالم ہیں: اول عالمِ اسلام، دوم عالمِ ایمان، سوم عالمِ ہجرت، چہارم عالمِ جہاد فی سبیل اللہ۔ چونکہ اس حدیثِ نبوی کی بنا پر کہ رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ سلوک کے مسافر کا جہاد، جہادِ اکبر ہے، اس لیے اس مجاہد کا اسلام اور ایمان بھی اسلامِ اکبر اور ایمانِ اکبر ہونا چاہیے۔ اسلام اور ایمان کے مراحل سے گزرنے کے بعد طالب کے لیے مناسب ہے کہ کمرِ ہمت باندھ کر رسولِ باطن کے ساتھ رسولِ ظاہر یا اس کے خلیفہ کی معاونت سے ہجرت کرے اور پھر مجاہدہ کے میدان میں قدم رکھے تاکہ مقتول فی سبیل اللہ کے درجے پر فائز ہو جائے۔

لیکن سالک کو یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ سلوک کی ابتداء سے جہاد کے مرحلے تک اس کو انسان اور شیطان کی طرف سے بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مقتول فی سبیل اللہ کے درجے پر فائز ہونے سے پہلے اس کو

عالمِ اسلام اکبر اور عالمِ ایمان اکبر کو عبور کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے مجاہدہ میں کامیاب ہوسکے گا اور خدا کی راہ میں جان دینے کا مرحلہ آئے گا۔ عالمِ اسلام اعظم، ایمانِ اعظم، ہجرتِ عظمیٰ اور جہادِ اعظم اس راہ میں منزلِ مقصود سے پہلے کے مراحل ہیں۔ ان کے موانع کفرِ اعظم اور نفاقِ اعظم کہلاتے ہیں۔ اس میدان میں شیطان کے چیلوں چانٹوں کی تو رسائی نہیں اور وہ سالک پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتے لیکن خود شیطان جو ان کا سرغنہ اور رئیسِ ابالسہ ہے، یہاں بھی سالک کا راستا روکتا ہے اس لیے سالک کو ان عالموں سے گزرتے ہوئے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ خطرے سے باہر ہوگیا ہے اور اب گوہرِ مقصود اس کے سامنے ہے۔ ان سے پہلے کے عالموں سے گزرنے کے بعد سالک جب تک 'اعظم' عالموں کو طے نہیں کریگا، شیطان اسے منزلِ مقصود پر پہنچنے سے برابر روکتا رہے گا لیکن سالک کو اپنا حوصلہ بلند رکھنا چاہیئے اور ابلیس کے دامِ تزویر سے بچنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے تاکہ ابلیس اس کو کفرِ اعظم یا نفاقِ اعظم میں مبتلا نہ کرسکے۔ اسلامِ اعظم اور ایمانِ اعظم کے بعد سالک ہجرتِ عظمیٰ کر کے مجاہدۂ اعظم کے ذریعے قیامتِ انفسیۂ عظمیٰ سے گزر کر وادئ مخلصین میں داخل ہو جاتا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس کی توفیق دے۔

۲

پہلے جو کچھ بیان کیا گیا، اس کی بنا پر سالک جو راہِ خدا کا مسافر ہے، عالمِ خلوص سے قبل بارہ عالم طے کرتا ہے ان کے نام یہ ہیں: اسلامِ اصغر، اسلامِ اکبر، اسلامِ اعظم، ایمانِ اصغر، ایمانِ اکبر، ایمانِ اعظم، ہجرتِ صغریٰ، ہجرتِ کبریٰ، ہجرتِ عظمیٰ، جہادِ اصغر، جہادِ اکبر، جہادِ اعظم۔ اس لیے ان عالموں کی خصوصیات، ان کے آثار و علامات اور ان میں جو رکاوٹیں اور موانع پیش آتے ہیں ان کا جاننا ضروری ہے۔ مطلب واضح کرنے کے لیے یہاں پر ان کا مجمل طور پہ تذکرہ کیا جائے گا۔

اسلامِ اکبر سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی ایسی مکمل اطاعت کہ اس کے کسی قول و فعل پر کسی طرح کا اعتراض نہ کیا جائے اور اس کا دل سے یقین

رکھا جائے اور زبان سے اعتراف کیا جائے کہ جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے خالی از حکمت و مصلحت نہیں اور جو کچھ نہیں ہے وہ مناسب ہی نہیں تھا۔ حضرت رب العزت کے کسی کام پر چون و چرانہ کیا جائے اور نہ کسی بات کی شکایت کی جائے۔ مولیٰ الموحدین امیر المومنینؑ کی یہ حدیث مرفوع اسی منزل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اِنَّ الْاِسْلَامَ هُوَ التَّسْلِيْمُ وَالتَّسْلِيْمُ هُوَ الْيَقِيْنُ اسلام کے معنی ہیں تسلیم و رضا اور تسلیم کے معنی ہیں پختہ یقین۔ ترکِ اعتراض کے ساتھ ساتھ قلب میں تشریعی اور تکوینی احکامِ الٰہی کے بارے میں کسی طرح کی دل گرفتگی نہیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

"آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ مومن نہیں سمجھے جائیں گے جب تک یہ اپنے آپس کے جھگڑوں میں آپ سے فیصلہ نہ کرائیں اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو دل و جان سے تسلیم نہ کر لیں۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۶۵) یہی ایمانِ اکبر کی منزل ہے کہ اسلامِ اکبر روح میں سرایت کر جائے اور دل و جان پر واقعی چھا جائے۔

جب سالک کا دل اسلامِ اکبر کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو کبھی کبھی اس پر ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ نہ صرف اس کا دل اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے بلکہ وہ اس حقیقت کا مشاہدہ بھی کرنے لگتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر وہ اکثر مشاہدہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں حاضر و ناظر ہے۔ یہی مرحلہ شہود اور اسلامِ اکبر کہلاتا ہے

لیکن چونکہ اس مرحلہ میں سالک بہ حدِ کمال تک نہیں پہنچتا کہ اس کی یہ حالت تمام اعضائے بدن میں سرایت کر جائے، اس لیے مادی رکاوٹیں پیش آتی رہتی ہیں خصوصاً جب سالک طبعی ضروریات میں مشغول ہوتا ہے اس وقت یہ حالتِ شہود باقی نہیں رہتی اور شہود کی جگہ غفلت لے لیتی ہے اس لیے سالک کے لیے ضروری ہے کہ پختہ عزم سے کام لے اور اس کو اس مقام تک پہنچا دے جہاں یہ ایک دائمی عبادت اور ایک ملکہ کی شکل اختیار کرلے تاکہ خارجی اشغال اس حالت پر غالب نہ آسکیں اور حالتِ شہود میں کبھی بھی کوئی تغیر پیدا نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اسلامِ اکبر کو دل کے مقام سے روح کے مقام تک پہنچایا جائے تاکہ یہ حالت جو ایک طرح سے اجمالی حالت ہے تفصیل میں بدل جائے، روح کے حکم سے تمام قوائے ظاہری اور باطنی پر محیط ہو جائے اور حال کے بجائے ملکہ بن جائے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو عرفاء احسان سے تعبیر کرتے ہیں۔ خداوندِ کریم قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جو ہماری راہ میں مشقت برداشت کرتے ہیں (مجاہدہ کرتے ہیں) ہم ان کو اپنے (قرب کے) راستے ضرور دکھلائیں گے"۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۶۹) اسی پر اکتفا نہ کر کے اس کے فوراً بعد ارشاد ہے: وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۶۹) "اور بے شک اللہ اہلِ احسان کے ساتھ ہے"۔ اسی بنا پر مجاہد فی سبیل اللہ جب تک مرتبۂ احسان تک نہیں پہنچ جاتا، راہِ ہدایت اور راہِ قرب و رضا نہیں پا سکتا۔ صحابی بزرگ جناب ابوذر غفاریؓ نے حضرت رسول اکرم ص

سے پوچھا کہ احسان کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ وَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔

یعنی انسان کو چاہیے کہ خدا کی اس طرح عبادت کرے گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے لیکن اگر اس کیفیت کے ساتھ عبادت کرنے پر قادر نہ ہو تو پھر ایک نچلا درجہ یہ ہے کہ خدا کی اس طرح عبادت کرے گویا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ جب تک سالک ایمانِ اکبر کے درجے تک نہیں پہنچتا یہ احسان کی کیفیت صرف کبھی کبھی میسر آتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ عبادات کو خاص ذوق وشوق اور میل ورغبت سے انجام دیتا ہے لیکن جب سالک ایمانِ اکبر کے درجے پر پہنچ جاتا ہے، تو یہ احسان کی کیفیت مستقل عادت اور ملکہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اب اس کو ہر چھوٹی بڑی عبادت میں لطف آنے لگتا ہے اور وہ ہر عبادت کو بصد شوق اور برضا ورغبت انجام دینے لگتا ہے کیونکہ اب ایمان اس کی روح میں سرایت کر چکا ہوتا ہے اور چونکہ روح تمام اعضاء وجوارح کی حاکم اور فرمانروا ہے اس لیے وہ سب اعضاء کو ان کے اپنے اپنے صحیح کام پر لگا دیتی ہے۔ اس طرح سب کام سہولت اور آسانی سے ہونے لگتے ہیں۔ اعضاء وجوارح روح کے مطیع وفرمانبردار ہونے کے باعث کسی لمحے بھی اس کے حکم سے روگردانی نہیں کرتے۔ ان سالکین کے بارے میں جو ایمانِ اکبر کے درجے پر پہنچ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۔

"بالتحقیق ان اہلِ ایمان نے فلاح پائی جو خشوع سے نماز پڑھتے ہیں اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔" (سورۂ مومنون۔ آیت ۱)

لغویات میں تو وہی شخص مشغول ہوگا جس کا ایسی باتوں کی طرف میلان اور رجحان ہوگا۔ سالک جو ایمانِ اکبر کے درجے پہ پہنچ چکا ہو اور جس کو احسان کا ملکہ حاصل ہو گیا ہو اس کو کبھی لغویات کا شوق نہیں ہو سکتا اس لیے کہ دو متضاد چیزوں کی محبت کسی کے دل میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتی جیسا کہ خود ارشادِ باری ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ "اللہ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے۔" (سورۂ احزاب آیت ۴)

اگر کسی سالک کو لہو و لعب سے دلچسپی ہے تو ہم "دلیلِ انّی"[۱] سے معلوم کر سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی توجہ اللہ کی طرف نہیں ہو سکتی۔ اس کے دل میں نفاق ہے اس لیے وہ دینی امور میں تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی طبیعت کا رجحان اللہ کی طرف ہے مگر ساتھ ہی لہو و لعب اور دیگر لغویات کا بھی شوق رکھتا ہے۔ یہ نفاق، نفاقِ اکبر ہے جو ایمانِ اکبر کی ضد ہے۔ اس میں باطنی شوق و ذوق کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ عقل، مصلحت اندیشی اور خوف کے زیرِ اثر انسانی اعمال انجام پاتے ہیں۔ اس آیۂ کریمہ میں اسی نفاق کی طرف اشارہ ہے: وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى۔ "یہ لوگ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ہارے جی کے ساتھ۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۱۴۲)

سالک جب ایمانِ اکبر کے درجے پر پہنچ جاتا ہے تو اس میں نفاق

---

[۱] فلسفہ کی اصطلاح میں "معلول" سے "علت" کو معلوم کرنا۔

کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا اور اس کے افعال و اعمال کا منشا نہ عقلی تیر تکے ہوتے ہیں، نہ کسی قسم کا خوف اور نہ مصلحت اندیشی یا قدامت پسندی بلکہ اس کے اعمال کی بنیاد ذوق و شوق، رجحانِ قلبی اور عشقِ حقیقی پر ہوتی ہے۔ جب سالک ایمانِ اکبر کے درجے پر پہنچ جائے تو اب اسے ہجرتِ کبریٰ کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس ہجرت کے دو شعبے ہیں: ایک شعبہ جسم کی ہجرت ہے جس کے معنی ہیں اہلِ عصیان و طغیان سے میل جول اور معاشرت و مجالست کا ترک کرنا۔ دوسرا شعبہ دل کی ہجرت ہے جس کا مطلب ہے اہلِ عصیان و طغیان سے ترکِ محبت و مودت۔ سالک کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ صرف ان تمام عادات اور رسم و رواج کو عملاً ترک کر دے جو اسے راہِ خدا سے باز رکھیں اور اس کے راستے میں رکاوٹ بنیں بلکہ دل سے بھی ان کو بُرا سمجھے۔ ایسی عادات اور رسم و رواج کا خاص تعلق بلادِ کفر سے ہے۔

مادی معاشرے میں انسان بہت سی ایسی خیالی رسوم و عادات کا اسیر بن جاتا ہے جو اہلِ دنیا میں رواج پاگئی ہیں اور معاشرت اور آپس میں لین دین کی بنیاد بن گئی ہیں۔ اب ان ہی کی بنیاد پر نفع و نقصان کا حساب لگایا جاتا ہے مثلاً یہ عادت بن گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی علمی مباحثے کی مجلس میں خاموشی اختیار کرے اور بحث میں شریک نہ ہو تو اسے جاہل تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی رواج ہے کہ صدرِ مجلس میں بیٹھنے کو اکثر لوگ اپنی بڑائی کی علامت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مجلس میں آتے جاتے وقت آگے ہونے کو بھی بزرگی اور عظمت کی نشانی سمجھا

جامع تعلیمات اسلامی

جاتا ہے۔ چرب زبانی اور خوشامد کو حسنِ اخلاق تصور کیا جاتا ہے اور ان کے برعکس افعال کو بداخلاقی اور گھٹیا پن۔ سالک کو چاہیے کہ اللہ کی امداد کے بھروسے پر ان باتوں کو نظر انداز کر دے۔ خیال اور وہم کی دنیا کو ترک کر دے اور اس بڑھیا کو تین طلاقیں دیدے۔ سالک اس بارے میں کسی خوف کا شکار نہ ہو، لوگوں کی ملامت سے نہ ڈرے اور ایسے افراد کی مذمت کی بھی پروا نہ کرے جو اپنے آپ کو اہل علم و فضل ظاہر کرتے ہیں۔ جامع کلینی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَرْکَانُ الْکُفْرِ اَرْبَعَۃٌ: اَلرَّغْبَۃُ وَالرَّهْبَۃُ وَالسَّخَطُ وَالْغَضَبُ. کفر کے ستون چار ہیں: لالچ، خوف، آزردگی اور غصہ۔ اس حدیث میں خوف سے مراد یہ اندیشہ ہے کہ اگر لوگوں کے غلط رسم و رواج اور غلط خیالات کی مخالفت کی گئی تو وہ ناراض ہوں گے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ سالک کو معاشرے کی ان تمام عادات، روایات اور رسم و رواج کو خیرباد کہہ دینا چاہیے جو راہِ خدا میں رکاوٹ پیدا کریں۔ عارفین اس کو جنون سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ مجنوں بھی لوگوں کی عادات اور رسوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور ان کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کوئی اچھا کہے گا یا برا۔ وہ اپنی روش پر قائم رہتا ہے اور لوگوں کی مخالفت سے بالکل نہیں ڈرتا۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زر و گنج بہ صد حشمت قاروں باشی

جامع تعلیمات اسلامی

در مقامے کہ صدارت بہ فقیراں بخشند
چشم دارم کہ بہ جاہ از ہمہ افزوں باشی

اے دل بہتر یہی ہے کہ مستِ مئے الست ہو جا۔ دولت و ثروت کے بغیر بھی تیری شان و شوکت سیکڑوں قارون صفت رئیسوں سے زیادہ ہوگی۔ بارگاہِ ایزدی میں جہاں فقیروں کو عزت و مرتبہ بخشا جاتا ہے، امید ہے کہ تیرا مرتبہ سب سے بڑھ کر ہوگا۔

جب سالک اللہ کے فضل و کرم سے ہجرت میں کامیاب ہو جائے اور دنیا کے رسم و رواج سے اپنا دامن چھڑا لے تو پھر وہ جہادِ اکبر کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ جہادِ اکبر سے مراد ہے شیطانی لشکروں سے جنگ۔ ابھی تک سالک نفس کے پنجے میں اسیر ہے۔ وہم غصے اور شہوت میں گرفتار اور خواہشاتِ نفسانی سے مغلوب، امیدوں اور آرزوؤں میں چہار طرف سے گھرا ہوا اور رنج اور پریشانیوں کے باعث پراگندہ خاطر۔ طبیعت کے خلاف اگر کوئی بات ہو تو اسے تکلیف پہنچتی ہے۔ طرح طرح کے وہم ستاتے ہیں کہ کہیں یوں نہ ہو جائے اور کہیں ووں نہ ہو جائے۔ غرض سینہ ہر وقت پڑا دہکتا رہتا ہے۔ کبھی فقر و احتیاج کی پریشانی، کبھی آلام و خواہشِ انتقام کی سوزش، کبھی اہل و عیال کی کشاکش، کبھی مال و منال کی تباہی کا خوف، کبھی جاہ و مرتبہ کے حصول کی خواہش جو میسر نہیں آتے، کبھی منصب کے حصول کی کوشش جو ہاتھ نہیں لگتا، حسد، غیظ و غضب اور بڑھی ہوئی آرزوؤں کے کانٹوں کی چبھن، مادی دنیا کے سانپ، بچھوؤں کے سامنے بیچارگی کا احساس۔ دل، وہم کے

جامعہ تعلیمات اسلامی

اندھیروں سے اس طرح تیرہ و تار کہ جس کی کوئی حد نہ شمار۔ جدھر منہ کرو زمانے کے تھپیڑے اور جہاں پاؤں رکھو وہیں کانٹوں سے واسطہ۔ یہ سب تکالیف اور تفکرات سالک کو پریشان کیے رہتے ہیں۔ ان کی کثرت کو دیکھتے ہوئے سالک کو چاہیے کہ توفیق الٰہی سے وہم، غضب اور شہوت کی قوتوں کو زیر کرے اور مجاہدہ کبریٰ میں کامیابی حاصل کر کے دنیا کے جھمیلوں سے چھٹکارا حاصل کرے۔ اس منزل پر پہنچ کر وہ اسلامِ اعظم کی دنیا میں داخل ہو جائے گا۔ اب وہ گوہر یگانہ بن گیا۔ وہ خود دیکھے گا اور محسوس کرے گا کہ وہ تمام عالم پر چھایا ہوا ہے۔ موت اور فنا سے محفوظ ہو گیا ہے۔ ہر طرح کی کشمکش سے آزاد ہے۔ اسے اپنے اندر ایک ایسی پاکیزگی، چمک دمک اور رونق کا احساس ہوگا جس کا تعلق اس دنیائے دنی سے نہیں۔

جہاں تک اس دنیائے فانی کا تعلق ہے سالک اس منزل پر پہنچ کر اس سے اس طرح بے تعلق ہو جاتا ہے گویا کہ مر چکا۔ اب اس کی ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ وہ رہتا عالمِ ناسوت ہی میں ہے لیکن وہ یہاں کی ہر چیز کو عالمِ ملکوت کی صورت میں دیکھتا ہے۔ اب مادی اشیاء جو اس کے سامنے آتی ہیں اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتیں۔ چونکہ وہ قیامتِ انفسیہ وسطیٰ تک پہنچ گیا ہے اس لیے اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور بہت سے مخفی امور اس پر ظاہر ہونے لگتے ہیں اور عجیب احوال حاصل ہوتے ہیں۔ یہ مقام اسلامِ اعظم کا ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر واضح طور پر موجود ہے:

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا

يَمْشِي بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

"کیا ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور اس کو ایسا نور دیدیا کہ وہ اس کو لیے ہوئے لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ تاریکیوں میں سے نکلنے نہیں پاتا۔ اسی طرح کافروں کو اپنے اعمال اچھے معلوم ہوا کرتے ہیں۔" (سورۃ انعام۔ آیت ۱۲۲)

اسی طرح ایک دوسری آیت ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔

"جس شخص نے کوئی نیک کام کیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو ہم اس کو خوشگوار زندگی عطا کرتے ہیں اور ہم ایسے لوگوں کو انکے بہترین اعمال کے مطابق بدلہ عطا کرتے ہیں۔" (سورۃ نحل۔ آیت ۹۷)

یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس حالت میں سالک جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے اس کی وجہ سے ممکن ہے اس میں انانیت اور غرور پیدا ہو جائے اور اس کا سب سے بڑا جانی دشمن یعنی اس کا نفس اس کا مقابلہ کرنے لگے۔

حدیث شریف میں آیا ہے:

اَعْدٰى عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِيْ بَيْنَ جَنْبَيْكَ "تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا اپنا نفس ہے جو تیرے پہلو میں ہے۔"

جامع تعلیمات اسلامی

اس حال میں اگر خدا کی عنایت دستگیری نہ کرے تو کفرِ اعظم میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس حدیث میں اسی کفر کی طرف اشارہ ہے:
اَلنَّفْسُ هِيَ الصَّنَمُ الْاَكْبَرُ. نفس ہی سب سے بڑا بت ہے۔
یہی وہ بت پرستی تھی جس سے محفوظ رکھنے کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی تھی۔ وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ اے اللہ مجھے اور میرے بیٹوں کو بت پرستی سے بچا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت خلیل اللہ کے حق میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ گھڑے ہوئے بتوں کی پرستش کریں۔ یہی شرک ہے جس سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی پناہ مانگی ہے۔ آپ نے خداوند تعالیٰ سے عرض کیا:
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشِّرْكِ الْخَفِیِّ۔ "یا الٰہی میں شرکِ خفی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

لہٰذا سالک کو چاہیے کہ اپنے کچھ نہ ہونے کا دل سے اقرار کرے، اپنے عجز اور عبودیت کا یقین رکھے اور انانیت کے خیال کو قطعاً دل سے نکال دے تاکہ کفرِ اعظم کا ارتکاب نہ ہونے پائے اور اسلامِ اعظم کے درجے پر فائز ہونے میں کامیاب ہو جائے۔ بعض بزرگ عارفوں نے عمر بھر کبھی اپنے لیے لفظِ "میں" یا "ہم" استعمال نہیں کیا بلکہ ہمیشہ یہی کہا کہ بندہ آیا اور بندہ گیا۔ بعض دوسروں نے یہ تفصیل روا رکھی کہ جو اچھی بات ذاتِ حق سے منسوب ہو سکتی تھی، اس کو ذاتِ حق سے نسبت دی اور جس کو ذاتِ اقدس سے منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا اس کو خود اپنی ذات سے منسوب کیا اور جو بات خود ان سے منسوب ہو سکتی تھی اور خدا سے بھی

اس کے لیے جمع کا صیغہ جیسے ہم، وغیرہ استعمال کیا۔ یہ طریقہ حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے قصہ سے ماخوذ ہے۔

حضرت خضرؑ نے فرمایا تھا: اَمَّا السَّفِیْنَةُ فَکَانَتْ لِمَسٰکِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا۔ "وہ کشتی جو تھی وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو اس کے ذریعے سے دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ سو میں نے چاہا کہ اس میں سوراخ ڈال کر معیوب بنا دوں۔" (سورۂ کہف۔ آیت ۷۹)

چونکہ عیب کی نسبت ذاتِ الٰہی کی طرف نہیں ہو سکتی، اس لیے مفرد کا صیغہ استعمال کیا اور اسے اپنے سے منسوب کیا۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَکَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَیْنِ فَخَشِیْنَآ اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّکُفْرًا فَاَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَکٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا۔ "اور رہا وہ لڑکا، اس کے ماں باپ مومن تھے سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ یہ ان کو سرکشی اور کفر میں مبتلا نہ کر دے لہٰذا ہمیں یہ منظور ہوا کہ اس کے بجائے ان کا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو اور ماں باپ سے محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر۔" (سورۂ کہف۔ آیات ۸۰-۸۱) چونکہ مار ڈالنے کی نسبت حضرت خضرؑ اور خدا دونوں کی طرف ممکن تھی اس لیے جمع کا صیغہ لایا گیا۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَکَانَ لِغُلٰمَیْنِ یَتِیْمَیْنِ فِی الْمَدِیْنَةِ وَکَانَ تَحْتَهٗ کَنْزٌ لَّهُمَا وَکَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنْ یَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَیَسْتَخْرِجَا کَنْزَهُمَا[1] "رہی دیوار تو وہ دو یتیم لڑکوں

---

[1] یہ آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ وہابی ابھی تک قرآن کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکے ہیں۔

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

کی تھی جو اس شہر میں رہتے ہیں اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ مال تھا اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ چنانچہ آپ کے پروردگار نے یہ چاہا کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں تو اپنا دفینہ نکال لیں" (سورہ کہف آیت ۸۲) چونکہ بھلائی اور نفع رسانی کا ارادہ ذاتِ باری سے منسوب ہونے کے قابل ہے اس لیے یہاں اس کو پروردگار سے منسوب کیا گیا۔

"کشتیِ مسکین" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"
علمِ موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
اقبال

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام میں بھی یہی طرزِ تکلم نظر آتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ. "جس نے مجھے پیدا کیا" پھر وہی میری رہنمائی کرتا ہے، وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو شفا دیتا ہے۔" (سورۂ شعراء: آیت ۷۵)

یہاں حضرت خلیل اللہؑ نے بیماری کی نسبت اپنی طرف دی اور شفاء دینے کی اللہ کی طرف۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اسلامِ اعظم کے مقام تک رسائی اور انانیت کا استرداد توفیق الٰہی سے نصیب ہو جائے۔

حاج امام قلی نخجوانی نے جو مرحوم آغا حاج مرزا علی آغا قاضی کے والد مرحوم آغا سید حسین آغا قاضی رضوان اللہ علیہ کے معارف میں استاد تھے، مرحوم آغا سید قریش قزوینی رضوان اللہ علیہ سے اخلاقیات اور معارف الٰہیہ

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

کے مدارج کی تکمیل کی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں بڈھا ہو گیا تو ایک دن میں نے دیکھا کہ میں اور شیطان ایک پہاڑ پر کھڑے ہیں۔ میں نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر اس سے کہا کہ اب تو میں بڈھا ہو گیا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے چھوڑ دے۔ شیطان نے کہا: ذرا اِدھر دیکھو۔ میں نے اُدھر دیکھا تو ایک ایسی گہری کھائی نظر پڑی کہ خوف کے مارے آدمی کی عقل چکرا جائے۔ شیطان نے کہا کہ میرے دل میں ذرا بھی، رحم، ترس اور مروت نہیں ہے۔ اگر تو میرے پنجے میں ایک دفعہ آگیا تو اس کھائی کی تہ میں ایسا جا گرے گا کہ بس دیکھا ہی کرے گا۔

اسلامِ اعظم سے اگلا مرحلہ ایمانِ اعظم کا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلامِ اعظم کا ظہور اس شدت سے ہو کہ علم و یقین کے مرتبے سے گزر کر صاف اور واضح مشاہدہ کی منزل تک پہنچ جائے۔ اس دوران میں سالک عالمِ ملکوت سے کوچ کر کے عالمِ جبروت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے قیامتِ انفسیہ کبریٰ آچکتی ہے اور وہ عالمِ ملکوت کے بعد عالمِ جبروت کے مشاہدات سے سرفراز ہونے لگتا ہے۔

اس کے بعد سالک کو خود اپنے وجود سے ہجرت کرنی چاہیے اور اپنے وجود کو بالکل مسترد کر دینا چاہیے۔ سالک کا یہ سفر اپنے وجود سے عالمِ وجودِ مطلق کی طرف ہو گا۔ اسی بات کو بعض بزرگوں نے اس طرح ادا کیا ہے: دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالِ اپنے نفس کو چھوڑ اور آجا۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں بھی اسی مقام کی طرف اشارہ ہے: فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي کیونکہ وَادْخُلِي جَنَّتِي اس آیت میں فَادْخُلِي فِي عِبَادِي

جامعہ نعیمیات اسلامی

کے بعد آیا ہے۔ اس سے پہلے یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ کہہ کر نفس سے خطاب کیا گیا ہے یعنی "اے اطمینان والے نفس میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور جنت میں داخل ہو جا۔" چونکہ اب تو جہادِ اکبر سے فارغ ہو کر عالمِ فتح وظفر میں جو اطمینان کا صدر مقام ہے داخل ہو گیا ہے لیکن ابھی تو نے مجاہدۂ عظمیٰ مکمل نہیں کیا اور ابھی تیرے وجود کے کچھ آثار باقی ہیں۔ ان آثار کو بھی نیست و نابود کرنے کے لیے جہادِ اعظم کی ضرورت ہے۔ اسی کمی کے باعث تو ابھی روک ٹوک سے آزاد نہیں ہوا۔ تیری جگہ ابھی اسی احاطے میں ہے جو "ملیک" و "مقتدر" کا احاطہ کہلاتا ہے۔ ملیک اور مقتدر اللہ تعالیٰ کے دو نام ہیں: فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ {پرہیزگار ہوں گے) ایک خوشگوار اور پسندیدہ مقام میں ایک با اختیار بادشاہ کے پاس}۔ اس مرحلہ کے بعد سالک کو چاہیے کہ اس کے اپنے وجود کے جو ضعیف سے ضعیف تر آثار باقی رہ گئے ہوں ان کے خلاف جہاد کرے اور تمام بچے کھچے ڈھکے چھپے آثار یک قلم نیست و نابود کر دے تاکہ توحیدِ مطلق کے میدان میں قدم رکھ سکے۔ یہ عالم عالمِ فتح وظفر کہلاتا ہے۔ اس طرح سالک بارہ عالم طے کرے گا۔ جو شخص ہجرتِ عظمیٰ اور جہادِ اعظم کے مرحلوں سے گزرنے میں کامیاب ہو کر میدانِ خلوص میں داخل ہو جائے وہ فاتح و مظفر کہلائے گا اور عالمِ خلوص اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ کے احاطہ میں داخل ہو جائے گا۔ ایسے شخص کے لیے قیامتِ انفسیہ عظمیٰ آ چکی ہو گی یعنی وہ اجسام، ارواح اور تمام تعینات کے حجاب سے گزر کر مکمل فنا کی منزل میں داخل ہو جائے گا۔ اس کا قدم عالمِ لاہوت میں ہو گا اور

جامعہ نعیمیات اسلامی

وہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ کی منزل کو پار کر چکا ہوگا۔ ایسا شخص فنا کی منزل میں ہونے کی بنا پر شعوری طور پہ خود اپنے ارادے سے بظاہر زندہ مگر ایک لحاظ سے مردہ ہوگا۔ اسی وجہ سے حضرت امیرالمومنین علیؑ کے بارے میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی مَیِّتٍ یَمْشِیْ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ۔

"جو کسی مردے کو چلتے پھرتے دیکھنا چاہے' وہ علی بن ابی طالبؑ کو دیکھ لے"۔

توضیح: اب تک جن کمالات کا ذکر کیا گیا ہے اور کم و بیش جن کی علامتیں اور نتائج بیان کیے گئے ہیں یہ سب حضرت رب العزت کے وہ الطاف اور احسانات ہیں جو خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے ساتھ مخصوص ہیں پچھلی امتوں کے سالک جو کمالات حاصل کر سکتے تھے وہ محدود نوعیت کے تھے۔ فنا کی منزل پر پہنچنے کے بعد وہ اسماء و صفاتِ الٰہی کا مشاہدہ تو کر سکتے تھے لیکن اس سے اوپر کسی مقام کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں راز یہ تھا کہ ان کی معرفت کی انتہاء کلمہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ پر تھی جس کا حاصل خدا کی تمام کمالی و جمالی صفات کا شہود تھا، لیکن امتِ محمدیہ کے سالکین نے اس سے بہت اوپر کی منزلیں بھی طے کی ہیں اور بعد کے مراحل سے واقفیت پیدا کی ہے۔ ان کی رسائی ان مقامات تک ہوتی ہے جن کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ تمام اسلامی احکام کا مرجع کلمہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ مِنْ اَنْ یُّوْصَفُ (اللہ اس سے بالاتر ہے کہ اسکی توصیف کی جا سکے) ہے اس لیے ایک مسلمان سالک جو مراحل طے کرتا ہے وہ

اس قدر اعلیٰ و ارفع ہیں کہ ان کی تشریح ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کے سلوک کو کلمۂ اللہ اکبر کے ساتھ ربط اور مناسبت ہے۔ اسی وجہ سے خود انبیائے سلف بھی اسماء و صفاتِ الٰہی کے شہود سے بلند کسی مقام کا تصور نہیں کر سکتے تھے تا کہ وہاں تک پہنچنے کی کوشش کریں اسی لیے اس دنیا میں انھیں طرح طرح کی مشکلات اور ابتلائات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان ابتلائات سے ان کی نجات رسول اللہ ص، امیر المومنین ع، صدیقہ کبریٰ فاطمہ زہرا ع اور ان کی اولادِ طاہرین ع کی روحانی ولایت کے توسل سے ہوئی۔ ان حضرات کی ولایتِ کبریٰ ہی وہ مقام تھا جس نے انبیائے سابقین کی پریشانیوں اور غموں کو دور کیا۔ گو اس مقام کا مجملاً انبیائے سابقین کو احساس اور شعور تھا اور اسی لیے انھوں نے ائمۂ طاہرین ع کے مقاماتِ عالیہ کو وسیلہ بنایا لیکن اس کی پوری خصوصیت اور کیفیت کا انھیں علم نہیں تھا اور یہ کیفیت اور خصوصیت آخر عمر تک ان کے لیے غیر معلوم رہی۔ بعض قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فقط حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک دوبار حقائقِ عالیہ اور فیوضِ کاملہ کا مشاہدہ ہوا لیکن یہ مشاہدہ صرف عارضی تھا اور اس کیفیت کو دوام حاصل نہیں ہو سکا کہ اس کا مقام آخرت ہے جہاں وہ اس کا مشاہدہ کریں گے۔

اس نکتے کے ثبوت میں قرآنی آیات نقل کرنے سے پہلے یہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ مقامِ اخلاص کے بھی مختلف مدارج ہیں کیونکہ نصِ قرآنی سے ثابت ہے کہ متعدد انبیاء، مقامِ اخلاص پر فی الجملہ فائز تھے لیکن اس مقام کے اونچے درجے تک نہیں پہنچ سکے تھے اسی لیے وہ دعا کرتے تھے تا کہ

آخرت میں اس درجے پر فائز ہو سکیں۔ مثلاً حضرت یوسف علیٰ نبینا و آلہٖ وعلیہ السلام نصِ قرآنی کے مطابق مخلصین میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (سورۂ یوسف۔ آیت ۲۴) لیکن دعا کے وقت وہ اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ انہیں صالحین کے مقام تک پہنچا دیا جائے۔

اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۔ (اے اللہ) تو ہی میرا کارساز ہے دنیا اور آخرت میں۔ مجھے ایک مسلمان کی حیثیت سے موت دے اور مجھے صالحین میں شامل فرما۔ (سورۂ یوسف۔ آیت ۱۰۱) اس دعا سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ صُلوح کے مقام تک نہیں پہنچے تھے۔ اسی لیے انہوں نے دعا کی تھی کہ مرنے کے بعد ان کو یہ مقام حاصل ہو جائے۔ رہی یہ بات کہ آیا ان کی دعا قبول ہوئی یا نہیں اور وہ آخرت میں مقامِ صُلوح تک پہنچ جائیں گے، اس کے بارے میں قرآن مجید بالکل خاموش ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام گو مقامِ خلوص میں ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے پھر بھی دعا کرتے ہیں:

رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِيْنَ "اے میرے پروردگار مجھے حکمت عطا فرما اور مجھے صالحین کی جماعت میں شامل فرما" (سورۂ شعراء۔ آیت ۸۳)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقامِ صُلوح، مقامِ خلوص سے بھی بلند تر ہے۔ جب ہی تو جناب خلیل اللہ اس مرتبہ کے لوگوں میں شامل کیے جانے کی اپنے رب سے درخواست اور التجا کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے

جامعہ تعلیمات اسلامی

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا اس دنیا میں قبول نہیں کی لیکن آخرت میں قبولیت کا وعدہ فرمایا:

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ

"ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کرلیا اور آخرت میں تو بلاشبہ وہ صالحین میں سے ہیں۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۳۰)

جاننا چاہیے کہ مقام صُلوح جس کی انبیا نے سلف آرزو کرتے تھے صالحیت کے اس مرتبے سے مختلف ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کو اس قرآنی آیت کے مطابق عطا کیا گیا تھا۔

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ۔

"اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ (بیٹا) اور یعقوبؑ (پوتا) عطا کیے اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا۔" (سورۂ انبیاء۔ آیت ۷۲)

یہ صالحیت تو ان سب کو حاصل تھی۔ خود حضرت ابراہیمؑ کو بھی، لیکن اس کے باوجود آپ صالحین میں شامل کیے جانے کے لیے دعا کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ صُلوح جس کے وہ متمنی تھے اس سے بہت بلند تر کوئی چیز تھی۔

رہی یہ بات کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے زمانے میں بعض دوسرے حضرات اس درجۂ صُلوح پر فائز تھے تو اس کے لیے یہ آیت کریمہ دلیل ناطق ہے:

إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ

"میرا ولی اور نگہبان وہ اللہ ہے جس نے کتاب نازل فرمائی اور وہی صالحین کا ساتھ دیتا ہے۔" (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۹۶)

اولاً : یہ کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی اس بات کا اعتراف ہے کہ خدائے واحد آپ کا ولی مطلق ہے۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ میرا ولی وہ ہے جو صالحین کا ساتھ دیتا اور ان کے کام بناتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں ایسے مخلص افراد موجود تھے جو صُلُوح کے مقام تک پہنچ چکے تھے اور پروردگار ان کے کاموں کی نگرانی کرتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے انبیائے سابقین کی پنجتن پاکؑ یا ائمہؑ طاہرینؑ کے توسل سے دعا کا راز کیا تھا اور ان صالحین کا کیا مرتبہ تھا جن میں شامل کیے جانے کی حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے تھے۔

رہی اس بات کی دلیل کہ انبیائے عظام مقامِ اخلاص تک پہنچے ہیں تو یہ نتیجہ متعدد قرآنی آیات سے مختلف طریقوں سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اولاً تو انبیاءؑ کے حمدِ باری کرنے کے طریقے سے۔ نصِ قرآنی سے ثابت ہے کہ خدائے واحد کی حمد و ثنا' جیسا کہ اس کا حق ہے' سوائے بندگانِ اخلاص کے کوئی نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ . اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ . " اللہ ان اوصاف سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں مگر ہاں جو اللہ کے صاحبِ اخلاص بندے ہیں (ان کی اور بات ہے)" (سورۂ صافات - آیت ۱۶۰)

اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو حمد و ثناء کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ؕ آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ " آپ کہیے کہ تمام تحمید و تمجید اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے اور

جامع تعلیمات اسلامی

سلام ہو اس کے ان بندوں پر جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے۔ اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں؟" (سورۂ نمل۔ آیت ۵۹)

حضرت ابراہیم علیٰ نبیّنا و آلہٖ و علیہ السلام کی حمد قرآنِ کریم میں اس طرح نقل کی گئی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ "سب تعریف کا مستحق وہ اللہ ہے جس نے میرے بڑھاپے کے باوجود مجھے اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔ بلاشبہ میرا پروردگار دعا کا سننے والا ہے۔"

حضرت نوح علیٰ نبیّنا و آلہٖ و علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ اس طرح حمدِ الٰہی کریں:

فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔

"یوں کہو کہ سب تعریف اس اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی۔" (سورۂ مومنون۔ آیت ۲۸)

ثانیاً: انبیائے عظام کے متعلق خود قرآن میں تصریح ہے کہ وہ مقامِ اخلاص پر فائز تھے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کے بارے میں ارشاد ہے: اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ "بلاشبہ وہ ہمارے صاحبِ اخلاص بندوں میں سے ہیں۔"

حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مُوْسٰی اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا "اس کتاب میں موسیٰؑ کو بھی یاد کیجیے کہ وہ اللہ کے مخلص بندے تھے اور رسول و نبی بھی۔" (سورۂ مریم۔ آیت ۵۱)

حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے بارے میں ہے: وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ. إِنَّا أَخْلَصْنَاهُم بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ۔

"اور ہمارے بندوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کیجیے جو طاقت والے اور بصیرت والے تھے۔ ہم نے انھیں خالص کر لیا ایک خاص بات کے ساتھ جو آخرت کی یاد ہے۔" (سورۂ صٓ۔ آیت ۴۵)

ثالثاً: ایک طرف اس آیت فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ "آپ کی عزت و جلال کی قسم، میں ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں سے خالص کر لیے گئے ہیں۔" (سورۂ صٓ۔ آیت ۸۳) کے مطابق مخلص بندوں تک شیطان کی دسترس نہیں اور اس کا ان پر بس نہیں چلتا۔ جن لوگوں پر شیطان کا بس چلتا ہے وہ شکر گزار بندے نہیں ہوتے۔ جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے:

ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ "پھر میں ان کو جا لوں گا ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے داہنے سے اور ان کے بائیں سے، اور آپ نہیں پائیں گے ان میں سے اکثر کو شکر گزار۔" (سورۂ اعراف آیت ۱۷)

قرآن مجید میں متعدد انبیاء کے متعلق ارشاد ہے کہ اللہ نے ان کو برگزیدہ فرمایا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا

مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۔ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

"اور ہم نے ابراہیمؑ کو (ایک بیٹا) اسحاقؑ اور (ایک پوتا) یعقوبؑ دیا۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت کی اور ان سے پہلے نوحؑ کو بھی ہم ہدایت کر چکے تھے اور ان کی اولاد میں سے داوٗدؑ و سلیمانؑ و ایوبؑ و یوسفؑ و موسیٰؑ و ہارونؑ کو بھی ہم نے ہدایت کی۔ ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں۔ (اور ہم نے ہدایت دی) زکریاؑ و یحییٰؑ و عیسیٰؑ والیاسؑ کو۔ یہ سب صالحین میں سے تھے (اور ہم نے ہدایت دی) اسمٰعیلؑ والیسعؑ و یونسؑ اور لوطؑ کو۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام جہانوں پر فضیلت دی۔ ان کے کچھ آباء کو اور کچھ اولاد کو اور ان کے کچھ بھائیوں کو ہم نے چن لیا اور ہم نے ان سب کو راہِ راست کی ہدایت کی تھی۔"

(سورۂ انعام۔ آیات ۸۴ تا ۸۷)

اس آیتِ کریمہ سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاءؑ مقامِ اخلاص پر فائز تھے۔ اس کے برخلاف گزشتہ دلائل سے صرف ان چند انبیاءؑ کا اس مقام پر فائز ہونا ثابت کیا جا سکتا تھا جن کا وہاں تذکرہ ہے۔ یہاں ہمارا استدلال دو باتوں پر موقوف ہے پہلی تو یہ کہ اس آیت

میں اِجْتَبَیْنَا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی ملتی جلتی چیزوں میں سے کسی چیز کو چھانٹنے اور چن لینے کے ہیں مثلاً سیبوں کی پیٹی میں سے کوئی شخص چند دانے اپنے لیے چھانٹ کر اٹھالے۔

جن بندگانِ خدا کو شیطان ورغلاتا ہے، وہ شاکرین یعنی شکرگزار بندے نہیں ہوتے۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاکرین جن پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا وہ وہی صاحب اخلاص بندے ہیں۔ اب اگر ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند متعال نے قرآن مجید میں کچھ بندوں کو شاکر کہا ہے تو ہم بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ عِبَادَ اللّٰہِ الْمُخْلَصِیْنَ میں سے ہیں مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا "بلاشبہ نوحؑ ایک شکرگزار بندے تھے"۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۳)

حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَیْہِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ نَجَّیْنٰہُمْ بِسَحَرٍ نِعْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا کَذٰلِکَ نَجْزِیْ مَنْ شَکَرَ۔ "ہم نے ان پر پتھروں کا مینہ برسایا، لوطؑ کے متعلقین کو چھوڑ کر جن کو ہم نے اپنے فضل سے اخیر شب بچا لیا۔ جو شکر کرتا ہے ہم اسے ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں"۔ (سورۂ قمر۔ آیت ۳۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

اِنَّ اِبْرٰہِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا وَلَمْ یَکُ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ شَاکِرًا لِّاَنْعُمِہٖ۔ "بیشک ابراہیمؑ بڑے مقتدا، اللہ کے فرمانبردار

اوراس کی طرف یک رخ رہنے والے تھے۔ وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ اللہ کی نعمتوں کے بڑے شکر گزار تھے۔" (سورۃ نحل۔ آیت ۱۲۰)

بقیہ انبیاءؑ میں سے جن کی صفت شکر گزاری بیان کی گئی ہے وہ سب بھی اصولی طور پر صاحبانِ اخلاص ہیں۔

رابعاً: اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاجْتَبَيْنَاهُمْ یعنی ہم نے تمام مخلوقات اور تمام انسانوں میں سے ان کو چن لیا۔ گویا خاص اپنے لیے کسی صندوقچے یا جیب خاص میں رکھ لیا۔ اس بنا پر جن افراد کے لیے وَاجْتَبَيْنَاهُمْ استعمال ہوا ہے' ان کا معاملہ باقی انسانوں سے مختلف ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں سے بالکل الگ ہو کر خالص خدا کے ہو گئے ہیں اور ان پر اللہ کی خاص نظرِ عنایت ہے۔ اللہ کا یہ اجتباء صاحبانِ اخلاص پر ہی صادق آتا ہے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو خالص خدا کے ہو گئے ہیں اور جنھوں نے تمام موجودات سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے اور ذاتِ اقدسِ الٰہی سے پیوستہ ہو گئے ہیں۔ پھر اس آیتِ کریمہ میں اجتباء کا تعلق محض کچھ افراد سے نہیں ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نوحؑ' ابراہیمؑ اور سولہ دوسرے پیغمبروںؑ کے آباء' اولاد اور بھائیوں کے تذکرے کے بعد فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو چن لیا ہے۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے یہاں بھائیوں سے مراد وہ روحانی اور اخلاقی بھائی ہیں جو معارفِ الٰہیہ میں انبیاءؑ کے شریک ہیں' اس لیے اس آیت کا حکم مطلق اور عام معلوم ہوتا ہے اور اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاءؑ مقامِ اخلاص پر فائز ہیں۔

۳

پہلی چیز جو سالک کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے متعلق حتی الوسع پوری تحقیق اور جستجو کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی وحدت و یگانگی اور اس کی رہنمائی سے آشنا ہو سکے، خواہ اس کا علم محض ظنی ہو یا اس حقیقت کی طرف اس کا صرف رجحان ہو۔ توحید و رسالت کی علمی یا اطمینان بخش تحقیق کے بعد وہ کفر کے دائرے سے نکل کر اسلامِ اصغر اور ایمانِ اصغر کے دائرے میں داخل ہو جائے گا۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس کے متعلق اجماع ہے کہ ہر مکلّف کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان امور کی تصدیق دلیل کے ساتھ کرے۔ اگر سعی و کوشش کے باوجود کسی مکلّف کو کسی طرف رجحان پیدا نہ ہو تو ہمت نہ ہارے بلکہ گریہ وزاری اور تواضع اور انکساری کے ساتھ کوشش کرتا رہے، اور تضرع والحاح اور دعا کا

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے تاکہ بالآخر اس کے لیے راستا کھل جائے۔ حضرت ادریس علیہ وعلیٰ نبیّنا و آلہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے متبعین کے حالات میں یہی طریقہ مروی ہے۔

دعا و زاری سے مراد یہ ہے کہ سالک اپنے عجز و قصور سے واقف ہو کر صمیمِ قلب سے اپنی ہدایت کا طالب ہو۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اپنے عاجز بندے کو جو حق کا طالب اور حقیقت کی جستجو میں ہو کبھی بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا "جو ہماری راہ میں کوشش کریں گے ہم ضرور ان کو اپنا راستا دکھائینگے"

مجھے یاد ہے کہ جب میں نجف اشرف میں حاجی مرزا علی قاضی رضوان اللہ علیہ سے اخلاقی اور روحانی تربیت حاصل کر رہا تھا، ایک دن صبح کے وقت میں چھت پر مصلّیٰ عبادت پر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے اونگھ آگئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دو آدمی میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک ان میں سے حضرت ادریس علیٰ نبیّنا و آلہ وعلیہ السلام ہیں، دوسرے میرے اپنے عزیز بھائی جناب محمد حسن طباطبائیؒ ہیں۔ حضرت ادریسؑ نے مجھ سے گفتگو شروع کی لیکن اس طرح کہ بات تو وہ کر رہے تھے مگر ان کی بات میرے بھائی کے ذریعے سے سنائی دیتی تھی۔ آپ نے فرمایا:

"میری زندگی میں ایسے ہولناک واقعات اور مسائل پیش آئے جن کا حل معمول کے مطابق ناممکن نظر آتا تھا لیکن وہ اچانک حل ہو گئے جس سے معلوم ہوا کہ عالمِ غیب سے کسی مافوق الفطرت ہاتھ نے ان عقدوں کو

حل کردیا اور ان مشکلوں کو دُور کردیا۔" یہیں سے پہلی بار مجھ پر اس دنیا کا ماورائے طبیعت سے تعلق منکشف ہوا اور یہیں سے ہمارا ماوراء سے رابطہ قائم ہوگیا۔

اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جن حوادث کا حضرت ادریسؑ نے حوالہ دیا تھا وہ ان کے بچپن کی وہ مشکلات اور تکالیف تھیں جو ان کو پیش آئی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی واقعی اللہ سے ہدایت کا طالب ہو تو پروردگارِ عالم ضرور اس کی مدد کرے گا۔ اللہ سے مدد مانگتے وقت ان آیات کی تلاوت جو اس کے حسب حال ہوں بہت مفید ثابت ہو گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے: اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یاد رکھو اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اسی طرح یَا فَتَّاحُ وَیَا دَلِیْلَ الْمُتَحَیِّرِیْنَ وغیرہ کا ورد کرنا بھی فائدہ مند ہوگا لیکن اس کا خیال رہے کہ حضورِ قلب اور پوری توجہ سے ورد کیا جائے۔

میرے ایک دوست بیان کرتے تھے کہ وہ ایران سے بس میں کربلائے معلیٰ کی زیارت کے لیے جا رہے تھے۔ ان کی نشست کے قریب ایک تنومند جوان بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی کہ اس جوان نے بلند آواز سے رونا شروع کردیا۔ انہیں بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟ کہا: اگر تمہیں نہیں بتاؤں گا تو کسے بتاؤں گا۔ پھر کہنے لگا: "میں ایک سول انجینئر ہوں۔ بچپن سے میری تربیت کچھ اس طرح ہوئی کہ میں لامذہب ہوگیا۔ مجھے مر کر زندہ ہونے اور قیامت پر یقین نہیں تھا البتہ دیندار لوگوں کی محبت کا احساس میرے دل میں ضرور موجود تھا، خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی

رہوں یا یہودی۔ ایک رات میں دوستوں کی محفل میں تھا جہاں بہت سے بہائی[1] بھی موجود تھے۔ کچھ دیر تو ہم ناچ گانے اور کھیل کود میں مصروف رہے۔ اس کے بعد خود بخود مجھے شرمندگی کا احساس ہوا اور مجھے اپنی حرکتیں بری لگنے لگیں۔ مجبوراً میں کمرے سے نکل کر اوپر کی منزل میں چلا گیا۔ وہاں میں تنہائی میں رونے لگا، میں نے کہا: اے وہ ذات کہ اگر کوئی خدا ہے تو تُو ہی ہے، میری دستگیری کر۔ چند لمحوں کے بعد میں نیچے آ گیا۔ آخر رات ختم ہو گئی اور سب حاضرینِ محفل منتشر ہو گئے۔ اگلی رات میں اتفاق سے اپنی ٹیم کے انچارج اور چند دوسرے افسروں کے ساتھ ایک پیشہ ورانہ کام کے لیے کہیں جا رہا تھا کہ اچانک دور سے میں نے ایک عالم کو دیکھا جن کا چہرہ نورانی تھا۔ وہ میرے پاس آئے، مجھے سلام کیا اور فرمایا: مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ کل ظہر کے بعد آپ سے ملوں گا۔ ان کے جانے کے بعد کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ یہ تو بہت بزرگ آدمی ہیں۔ تم نے ان کے سلام کا اتنی بے رخی سے جواب کیوں دیا؟ بات یہ تھی کہ جب ان صاحب نے مجھے سلام کیا تھا تو مجھے خیال ہوا تھا کہ کوئی ضرورت مند ہیں، اسی لیے یہاں میرے پاس آئے ہیں۔ اتفاق کی بات کہ ٹیم کے انچارج نے مجھے حکم دیا کہ کل دوپہر کے بعد فلاں جگہ موجود رہنا اور فلاں کام کرنا۔ یہ وقت بالکل وہی تھا جس وقت میں نے ان صاحب سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے دل میں کہا: اب تو ان صاحب کے پاس جانے کا کوئی امکان نہیں رہا۔ ٹیم کے انچارج نے جو کام میرے سپرد کیا تھا، اگلے دن جب

---

[1] قادیانیوں کی طرح کا ایک فرقہ جو تقریباً سو سال پرانا ہے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

اس کا وقت آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میری طبیعت گر رہی ہے۔ ذرا دیر میں تیز بخار چڑھ آیا اور میں اس طرح بستر پہ گر گیا کہ میرے لیے ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ قدرتی طور پر جو کام انچارج نے مجھے بتلایا تھا میں اس پر جانے سے معذور ہو گیا۔ مگر جیسے ہی انچارج کا آدمی میرے پاس سے گیا، میرا بخار اتر گیا اور میری حالت معمول پر آ گئی۔ میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو مجھے خیال آیا کہ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔ چنانچہ میں اٹھ کر ان صاحب کے گھر چلا گیا۔ جیسے ہی میں ان سے ملا، انھوں نے عقائد کی بات چھیڑ دی اور ہر عقیدہ کی دلیل اس طرح بیان کی کہ میں ایمان لے آیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ کل پھر آنا۔ کئی دن تک میں اسی طرح انکے پاس جاتا رہا۔ جب بھی میں ان کے پاس جا کر بیٹھتا وہ تمام حالات اور واقعات جو مجھے پیش آئے ہوتے، بے کم و کاست بیان کر دیتے تھے اور میرے ایسے نجی کاموں اور خیالوں کا تذکرہ کرتے تھے جن کے متعلق میرے سوا کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ اسی طرح ایک مدت گزر گئی۔ یہاں تک کہ ایک رات میں نے دوستوں کے مجبور کرنے پر ان کی ایک محفل میں شرکت کی۔ وہاں مجھے جوا بھی کھیلنا پڑا۔ اگلے دن جب میں ان بزرگ کی خدمت میں پہنچا، انھوں نے فوراً فرمایا: تمھیں شرم نہیں آتی، تم نے ایسے بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے کہا: غلطی ہو گئی، میں توبہ کرتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا: غسل توبہ کرو اور آئندہ پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔ اس کے بعد کچھ اور ہدایات دیں۔ انھوں نے میری زندگی کا معمول اور پروگرام بالکل بدل دیا۔ یہ قصہ زنجان کا ہے۔ بعد میں جب میں

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

طہران جانے لگا، آپ نے مجھے طہران کے کچھ علماء سے ملنے کی ہدایت کی۔ بالآخر مجھے یہ حکم ملا کہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے ادھر کا سفر کروں۔ اب میں وہی سفر کر رہا ہوں جس کا حکم مجھے ان بزرگ نے دیا تھا۔"

میرے دوست کہتے تھے: جب ہم عراق کے نزدیک پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان پھر رونے لگا۔ میرے پوچھنے پر بولا: "معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم سرزمینِ عراق میں داخل ہو گئے ہیں کیونکہ حضرت ابو عبداللہ علیہ السلام نے میرا استقبال کیا ہے۔"

اس قصہ کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خلوص سے اس راہ پہ چلے اور صمیم قلب سے اللہ سے ہدایت طلب کرے تو ضرور کامیاب ہوگا۔ اگر وحدانیتِ الٰہی میں بھی اسے شک ہوگا، تب بھی اسے ہدایت ملیگی۔

سالک جب اس مرحلے میں کامیاب ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اسلامِ اکبر اور ایمانِ اکبر کے حصول کی کوشش کرے۔ اس سلسلے میں پہلی ضروری چیز احکام کا جاننا ہے۔ یہ علم کسی فقیہ سے حاصل کرنا چاہیے۔ علم کے بعد عمل کا نمبر آتا ہے۔ عمل پہ بھی مداومت ضروری ہے تاکہ یقین میں اضافہ ہوتا جائے کیونکہ علم سے عمل کی ترغیب ملتی ہے اور عمل سے علم کو بڑھاوا ملتا ہے۔ اگر کسی کو کسی بات کا علم ہو اور ساتھ ہی اپنے علم کی صداقت پہ پختہ یقین ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے علم کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریگا۔ اگر عمل نہیں کرتا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو اپنے علم پہ یقین اور اعتقاد نہیں ہے بلکہ صرف ایک تصور ہے جو اس کے ذہن پہ ثبت ہے مثلاً اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی رزاقی مطلق کا واقعی

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

اور حقیقی علم ہے تو وہ مال حاصل کرنے کے لیے کبھی اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالے گا بلکہ اتنے مال پر اکتفا کرے گا جتنے کو حاصل کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے اور پورے ذہنی سکون اور دلی اطمینان کے ساتھ اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے لیے صرف بقدرِ ضرورت روزی کمانے کی کوشش کریگا لیکن اگر کوئی شخص روزی ہی کی فکر میں گھلا جاتا ہے، پریشان رہتا ہے اور کمانے کی کوشش میں حد سے زیادہ مصروف رہتا ہے، تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص کو یا تو اللہ تعالیٰ کے رزاقِ مطلق ہونے کا علم نہیں یا وہ اللہ تعالیٰ کی رزاقی کو مشروط سمجھتا ہے کہ اگر سخت محنت اور کوشش کریگا تو رزق ملے گا ورنہ نہیں یا وہ رزق کا مطلب صرف نقد روپیہ یا تنخواہ تک محدود سمجھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہرصورت اس کی ذہنی یا جسمانی پریشانی اور گھبراہٹ یہ ظاہر کرتی ہے کہ یا تو اس کو اللہ کی رزاقی کا علم ہی نہیں یا وہ اللہ کی رزاقی کو مطلق کے بجائے مقید اور محدود سمجھتا ہے۔ یہ مطلب ہے علم سے عمل کی ترغیب کا۔ رہی یہ بات کہ عمل سے علم کو کیسے بڑھاوا ملتا ہے تو اس کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی شخص دل سے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی وَبِحَمْدِہٖ کہتا ہے تو وہ ایسی ذلت، بے بسی اور بے چارگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ذلت کا تصور بغیر عزت کے تصور کے ممکن نہیں۔ ہمیشہ ذلیل کے مقابلے میں کوئی صاحبِ عزت و اقتدار بھی ہوگا، اس لیے لازماً اس کا ذہن عزتِ مطلق کی طرف متوجہ ہوگا اور یہ بھی خیال آئے گا کہ اس عزت کے ساتھ علم و قدرت کا وجود بھی ضروری ہے۔ اس طرح ایک چھوٹے سے عمل یعنی سجدہ کی تسبیح سے اسے اللہ تبارک و تعالیٰ کی عزتِ مطلقہ اور قدرتِ مطلقہ کا

احساس اور ادراک[1] ہو گا۔ یہ مطلب ہے اسکا کہ عمل، علم کو بڑھا دیتا ہے۔ اللہ عزوجل کے قول اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ سالک کے لیے ضروری ہے کہ واجبات کی بجا آوری اور محرمات سے اجتناب کی پوری سنجیدگی سے کوشش کرے، کیونکہ سلوک فی سبیل اللہ کسی واجب کو ترک کرنے یا کوئی ناجائز کام کرنے کے قطعاً منافی ہے۔ سالک کی محنت اسی وقت مفید ہو گی جب وہ ان دونوں باتوں سے بچتا رہے ورنہ جس طرح اگر جسم گندا ہے تو ظاہری سنگار کا کوئی فائدہ نہیں اسی طرح دل اور روح کی آلودگی کی صورت میں مستحب اعمال اور شرعی ریاضتوں کا بھی کوئی نتیجہ نہیں۔ واجبات کے اہتمام اور محرمات سے اجتناب کیساتھ مکروہات سے اجتناب اور مستحب اعمال کی بجا آوری کا اہتمام بھی ضروری ہے کیونکہ اسلام اکبر اور ایمان اکبر کے مرتبہ کا حصول اعمال پر موقوف ہے اور ہر عمل کی اپنی ایک خاصیت ہے جس سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ محمد بن مسلم

---

[1] وہ دعائیں جو پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اہلبیتؑ سے آئی ہیں، ہر مسلمان کے لیے بہترین تربیتی مکتب اور تقلیدی نمونہ بن سکتی ہیں۔ وہ مکتب جو انسان میں ایمانی قوت، پکا اعتقاد اور حق کے لیے جان دینے کا جذبہ پیدا کرتا ہے، خدا کی عبادت کے راز سے واقف کراتا ہے، مناجات کرنے اور خدا سے دل لگانے کا مزہ دیتا ہے، انسان کو فرض کا پہچاننا، دین پر چلنا اور ایسے اسباب مہیا کرنا سکھاتا ہے جو اس کو خدا کے قریب لاتے ہیں اور تباہیوں، عیاشیوں اور بدعتوں سے دور رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں دعائے مجیر، دعائے کمیل، دعائے ابو حمزہ ثمالی اور دعائے عرفہ سے رجوع فرمائیں۔

سے مروی مندرجہ ذیل حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے:

اَلْاِیْمَانُ لَا یَکُوْنُ اِلَّا بِالْعَمَلِ وَالْعَمَلُ مِنْہُ وَلَا یَثْبُتُ الْاِیْمَانُ اِلَّا بِالْعَمَلِ "ایمان عمل پر موقوف ہے، عمل ایمان کا جزو ہے اور ایمان بغیر عمل کے قائم نہیں رہ سکتا۔"

اس لیے سالک کو چاہیے کہ ہر مستحب عمل کو ایک مرتبہ ضرور بجا لائے تاکہ اسے ایمان کا وہ حصہ بھی نصیب ہو جائے جو خاص اس عمل پر موقوف ہے۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ملفوظات میں ہے کہ ایمانِ کامل عمل سے پیدا ہوتا ہے اس لیے سالک کے لیے ضروری ہے کہ ایمانِ اکبر کی منزل کی طرف سفر کرتے ہوئے مستحب اعمال کی بجا آوری میں کوتاہی نہ کرے کیونکہ اعمال کی بجا آوری میں جتنی سستی اور سہل انگاری سے کام لے گا اتنا ہی اس کا ایمان ناقص رہ جائے گا۔ اگر کوئی سالک اپنے ہاتھ، اپنی زبان اور اپنے تمام اعضاء و جوارح کو تو پاکیزہ اور صحیح معنی میں مؤدب بہ ادبِ الٰہی بنا لیتا ہے، لیکن جب مال خرچ کرنے کا وقت آتا ہے تو اس مرحلے میں مجاہدہ سے کام نہیں لیتا تو اس کا ایمان کامل نہیں ہوگا بلکہ اس میں نقص رہ جائیگا اس لیے ضروری ہے کہ ایمان کا جو حصہ جس عضو کے ساتھ مخصوص ہے وہ حصہ اس عضو کو مل جائے اور اس طرح ایمان کا وہ حصہ سالک کو نصیب ہو جائے مثلاً قلب کو جو بدن کا سردار ہے ذکر و فکر میں مشغول رکھے۔ ذکر سے مراد قلب میں حضرت باری تعالیٰ شانہ، کے اسماء و صفات کی یاد کا ہونا ہے اور فکر سے مراد آیاتِ آفاقیہ و انفسیہ کی طرف قلب کو متوجہ کرنا اور ان کی صنعت و حرکت پر غور کرنا ہے۔ اس طرح

جامع تعلیمات اسلامی

انسان کا دل سرچشمۂ ایمان سے سیراب ہو جاتا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ "یاد رکھو کہ خدا کے ذکر سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے"۔

جب ہر عضو کو ایمان سے اس کا مخصوص حصہ مل جائے تو سالک کو چاہیے کہ مجاہدہ شروع کرے اور اس طرح اسلام اکبر اور ایمانِ اکبر کی تکمیل کر کے تخمین وظن سے نکل کر یقین کی حد تک پہنچ جائے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ "جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان میں شرک کی آمیزش نہیں کی انھیں کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں"۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۸۲)

مجاہدہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ علاوہ اس کے کہ سالک صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائیگا وہ شیطانوں کی دستبرد سے بھی محفوظ ہو جائیگا۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

"اچھی طرح سمجھ لو کہ اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے نہ وہ مغموم ہونے والے ہیں"۔

خوف کا مطلب ہے کسی ایسی بات سے ڈرنا جو ابھی نہیں ہوئی لیکن جس کے وقوع کا اندیشہ ہے جس کے سبب سے پریشانی ہے، اور حزن کے معنی ہیں کسی ناپسندیدہ بات کے ہو جانے پر رنج وغم۔ سالک الی اللہ کو نہ کوئی اندیشہ ہوتا ہے، نہ کوئی رنج۔ ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوتی کیونکہ سالک اپنے تمام معاملات اپنے خدا کے سپرد

کر دیتا ہے اور خدا کے سوا اس کا نہ کوئی مقصد رہتا ہے نہ مقصود۔ نہ اسے کسی ناگہانی نقصان کا غم ہوتا ہے نہ کسی غیر متوقع حادثہ کا خوف۔ ایسے لوگ جو یقین کی اس منزل پر پہنچ جائیں، ان کو اللہ تعالٰے نے اپنے اولیاء سے تعبیر کیا ہے۔ اس منزل کی طرف حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے قول میں اشارہ ہے:

أَبْصَرَ طَرِيقَهُ وَسَلَكَ سَبِيلَهُ وَعَرَفَ مَنَارَهُ وَقَطَعَ غِمَارَهُ فَهُوَ مِنَ الْيَقِينِ عَلَى مِثْلِ ضَوْءِ الشَّمْسِ۔

"اس نے اللہ کا راستا دیکھا، اس کی راہ پر چلا، اس کی نشانیوں کو پہچانا، اس کی راہ کی دشواریوں کو عبور کیا، وہ یقین کے اس درجہ پر ہے گویا وہ سورج کی روشنی میں سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

نیز حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے:

هَجَمَ بِهِمُ الْعِلْمُ عَلَى حَقِيقَةِ الْبَصِيرَةِ وَبَاشَرُوا رُوحَ الْيَقِينِ وَاسْتَلَانُوا مَا اسْتَوْعَرَهُ الْمُتْرَفُونَ وَأَنِسُوا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْهُ الْجَاهِلُونَ وَصَحِبُوا الدُّنْيَا بِأَبْدَانٍ أَرْوَاحُهَا مُعَلَّقَةٌ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَى۔

"علم نے اچانک انھیں صحیح بصیرت عطا کر دی۔ روحِ یقین ان میں سرایت کر گئی۔ جس بات کو آرام طلب لوگ مشکل سمجھتے ہیں، وہ ان کو آسان معلوم ہونے لگی۔ وہ اس چیز سے مانوس ہو گئے جس سے جاہل گھبراتے ہیں۔ ان کے جسم دنیا میں ہیں اور ان کی روحیں ملاءِ اعلیٰ میں۔"

اسی مرحلے میں سالک پر کشف و شہود کے دروازے کھلتے ہیں۔

جیسا کہ ظاہر ہے ان منازل سے گزرنے اور سالک کے دنیا میں اپنی بنیادی ضروریات میں مشغول ہونے کے درمیان کوئی منافات نہیں۔

اس کے وارداتِ قلبیہ کا اس کے خارجی کاموں جیسے نکاح، روزی کمانے، تجارت یا زراعت میں مشغولیت وغیرہ سے کچھ تعلق نہیں۔ سالک کا جسم دنیا میں رہتا ہے، وہ دنیا کے کاموں میں مشغول رہتا ہے لیکن اس کی روح عالمِ ملکوت کی سیر کرتی اور ملکوتیوں سے راز و نیاز میں مصروف ہوتی ہے۔ سالک کی مثال اس مصیبت زدہ شخص کی سی ہے جس کا کوئی عزیز داغِ مفارقت دے گیا ہو۔ یہ مصیبت زدہ شخص لوگوں کے درمیان رہتا ہے، بات چیت کرتا ہے، چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، سوتا ہے لیکن اس کے سینہ میں اپنے عزیز کی یاد سے ایک طوفان برپا رہتا ہے۔ جو اسکی صورت دیکھتا ہے سمجھ جاتا ہے کہ یہ شخص مصیبت زدہ ہے۔ اسی طرح سالک اپنی فطری ضرورتوں میں مشغولی کے باوجود اپنے خدا سے رابطہ قائم رکھتا ہے۔ اس کے دل میں عشق و محبت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وہ مفارقت کے غم میں تڑپتا رہتا ہے لیکن اس کی اندرونی کیفیت کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہوتا۔ تاہم جو اس کی شکل دیکھتا ہے وہ اجمالی طور پر سمجھ جاتا ہے کہ خدا کی محبت، حق پرستی اور ذاتِ الٰہی کی طرف توجہ نے اس کی یہ صورت بنا دی ہے۔ اس توضیح سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ائمۂ اطہارؑ کی گریہ و زاری اور دعا و مناجات میں کوئی تصنّع نہیں تھا اور نہ ہی وہ دعائیں جو ائمۂ معصومینؑ سے مروی ہیں وہ صرف لوگوں کی تعلیم کے لیے ہیں۔ اس قسم کا خیال محض حقائق سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ائمہؑ کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ وہ محض ظاہر داری کے لیے کوئی ایسی بات کہیں جو مبنی بر حقیقت نہ ہو یا جھوٹی دعاؤں کے ذریعے سے لوگوں

کو خداوند کی طرف بلائیں۔ کیا یہ درست ہو گا اگر ہم کہیں کہ حضرت امیرالمومنینؑ اور حضرت سیدالساجدینؑ کے نالہ ہائے جاں سوز و جگر خراش بناوٹی تھے۔ ان کی اصلیت کچھ نہیں تھی یا یہ صرف تعلیم کے لیے تھے؟ حاشا وکلاّ! چونکہ پیشوایانِ دین کا یہ گروہ سلوک کے سب مراتب طے کر کے حرم خداوندی میں داخل ہوا ہے اور مقامِ بقاء بعدِ فناء یعنی مقام بقاء باللہ تک پہنچا ہے اس لیے یہ گروہ عالمِ وحدت اور عالمِ کثرت دونوں کے احوال کا جامع ہے اور عالمِ امکان کے گوناگوں مظاہر عالمِ مُلک و ملکُوت کے تمام شعبوں میں ہمیشہ انوارِ الٰہی کی ضیاء پاشیوں سے مستفید ہوتا رہتا ہے۔ کمال کے جس اعلیٰ درجے پر یہ گروہ فائز ہے اس کا تقاضا ہے کہ یہ عالمِ ملکوت کے تمام لوازم کی رعایت کرے اور کسی چھوٹے سے چھوٹے حکم، ادب یا اس عالم سے مطابقت رکھنے والے حال سے سرِ مو تجاوز نہ کرے بلکہ عالمِ بالا کی طرف اپنی توجہ کو قائم رکھے۔

جب سالک ان عالموں کو طے کرنے میں کامیاب ہو کر شیطان پر غلبہ حاصل کرے گا تو وہ عالمِ فتح و ظفر میں داخل ہو جائیگا۔ اس وقت سالک عالمِ مادہ سے گزر کر عالمِ ارواح میں داخل ہو جائیگا۔ اب اس کا عظیم سفر عالمِ نفس و روح سے ہو گا جس کے نتیجے میں وہ عالمِ ملکوت سے عالمِ جبروت اور عالمِ لاہوت تک پہنچ جائے گا۔

۲

اس راہ پر چلنے کے لیے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ کسی مردِ حق آگاہ کو اپنا مرشد قرار دیا جائے۔ مرشد ایسا ہونا چاہیے جو مقامِ فناء سے گزر کر بقاء باللہ کے مقام تک پہنچ چکا ہو اور اس راہ کے مصالح و مفاسد اور منجیات و مہلکات سے بخوبی آگاہ ہو، جو سالک کی تربیت کی ذمہ داری لے سکے اور منزلِ مقصود تک اس کی رہنمائی کر سکے۔ پھر ذکر و فکر اور بارگاہِ خداوندی میں الحاح و تضرع اور دعاء و مناجات کرنا بھی ضروری ہے۔

دمِ عارف نسیمِ صبحدم ہے — اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیبؑ آئے میسّر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اقبال

اس راہ کی منازل بخیر و خوبی طے کرنا چند امور پر موقوف ہے جن کی پوری رعایت لازمی ہے۔

اول: رسم و رواج اور معاشرتی تکلفات کا ترک کرنا۔

اس سے مراد ان امور کو ترک کرنا ہے جن کا تعلق محض رسم پرستی، وضع داری اور تکلفات سے ہے اور جو طریقت کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ سالک رہے تو لوگوں کے درمیان مگر معتدل اور متوازن زندگی بسر کرے۔ بعض لوگ معاشرتی رسم و رواج میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ ان کو ہر وقت انہی باتوں کا دھیان رہتا ہے۔ وہ اپنی سماجی پوزیشن کو برقرار رکھنے کے لیے ہر طرح کے مجلسی آداب اور بے فائدہ بلکہ مضر میل جول سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اپنی ظاہری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے تکلفات برتتے ہیں اور اس کے نتیجے میں بسا اوقات تکلیف اٹھاتے اور پریشان ہوتے ہیں۔ یہ لوگ غیر ضروری کاموں کو زندگی کی اصل اور اہم ضرورتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ عوام کی تعریف و تنقیص کو معیار قرار دے کر اپنی عمر کو ناحق ضائع کرتے ہیں۔ ان کے وجود کی کشتی رسم و رواج کی تلاطم خیز موجوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے اور معاشرتی رسم و رواج کی موجیں ان کو جدھر چاہے بہالے جاتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ یہ صرف معاشرے کا اتباع کرتے اور جدھر کی ہوا چل رہی ہو اُدھر ہی چلنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کے بالمقابل کچھ اور لوگ ہیں جو معاشرے سے کٹ کر بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔ یہ معاشرے کے تمام آداب و قواعد کو یک قلم نظر انداز کر کے تمام اجتماعی فوائد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ دوسرے

لوگوں سے قطعاً میل جول نہیں رکھتے اور گوشۂ تنہائی میں اس طرح رہتے ہیں کہ ان پر لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں اور یہ مردم بیزار مشہور ہو جاتے ہیں۔

سالک کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ان دونوں گروہوں کے درمیان کا راستا اختیار کرنا اور افراط و تفریط کو چھوڑ کر معتدل رویہ اپنانا اور صراطِ مستقیم پر چلنا چاہیے۔ لوگوں سے اتنا ہی میل جول رکھے جتنا ضروری ہے۔ باہمی روابط اور طرزِ معاشرت میں کمیت اور فرق کی وجہ سے اگر سالک کو باقی لوگوں پر خود بخود کوئی امتیاز حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور کچھ نقصان نہیں ہوگا اور ایسا امتیاز تو حاصل ہو کر رہے گا کیونکہ جہاں دوسرے لوگوں سے میل جول ایک حد تک لازمی اور ضروری ہے وہاں سالک کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ کسی طرح بھی اپنے آپ کو دوسروں کے اخلاق و اطوار کا تابع بنائے۔ لَا يَخَافُونَ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (وہ اللہ کی راہ میں کسی کی نکتہ چینی کی پروا نہیں کرتے)۔ اسی روش کی پختگی کا بیان ہے کہ مومن ہمیشہ اپنے صحیح طریقہ پر قائم رہتے ہیں۔ اصولی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سالک کو چاہیے کہ معاشرت سے متعلق ہر معاملے کو سنجیدگی سے پرکھے، اس کے نفع و نقصان پر غور کرے اور بلا وجہ عوام کی رائے اور خواہشات کا اتباع نہ کرے۔

دوم، عزم:

جیسے ہی سالک مجاہدہ کے میدان میں قدم رکھتا ہے اس کو عوام اور دوست احباب کی طرف سے جو اپنی ذاتی خواہشات اور معاشرتی رسم و رواج کی پیروی کے سوا کسی بات سے غرض نہیں رکھتے۔ ناخوشگوار حالات و واقعات

کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ اپنی زبان اور اپنے عمل سے سالک کو کچوکے لگا کر یہ چاہتے ہیں کہ اس کے رویہ میں تبدیلی لے آئیں اور اسے اس کے مقصد سے دور ہٹا دیں۔ اس کی زندگی کے معمولات اور ان کی زندگی کے لائحہ عمل میں جو مغایرت پیدا ہو گئی ہے اس سے پریشان ہو کر یہ دنیادار اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ طعن و تشنیع اور طنز و استہزاء کے تیر برسا کر سالک کے قدم جس نے حال ہی میں سلوک کی راہ اختیار کی ہے ڈگمگا دیں۔ اسی طرح سلوک کی ہر منزل میں سالک کو نت نئی مشکلات کا سامنا ہو گا جن کا حل ثابت قدمی اور عزمِ مصمم کے بغیر ممکن نظر نہیں آتا۔ سالک کو چاہیے کہ اپنی قوتِ ارادی اور تائید ایزدی سے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرے اور صبر و توکل کے ہتھیار سے تمام رکاوٹوں کو دُور کر دے۔ اپنے مقصد کی عظمت کا خیال کر کے ان خوفناک آندھیوں سے جو راہِ خدا میں رکاوٹ بنتی ہیں ہراساں نہ ہو اور کسی طرح کے خوف اور اندیشہ کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔

سوم۔ سہولت اور نرمی:

یہ ان اہم باتوں میں سے ہے جن کی رعایت سالک کے لیے ضروری ہے کیونکہ اس معاملے میں ذرا سی غفلت سے سالک کی ترقی رک جاتی ہے بلکہ بسا اوقات وہ سیر و سلوک ہی سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ ابتدائے سلوک میں سالک میں بہت زیادہ شوق اور جوش ہوتا ہے اور درمیان میں بھی عجب تجلیات اور انوار کا ظہور ہوتا ہے۔ سالک کے ذوق و شوق میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اس

وقت زیادہ سے زیادہ عبادت میں مشغولی کا تہیہ کرلیتا ہے۔ ہر وقت دعا اور گریہ وزاری میں لگا رہتا ہے۔ ہر نیک کام میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر شخص سے نئی بات سیکھتا ہے اور ہر روحانی غذا سے ایک لقمہ اٹھا لیتا ہے۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف یہ کہ فائدہ مند نہیں بلکہ نقصان دہ ہے کیونکہ جب نفس پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا ہے تو اسکے ردِ عمل میں نفس اچانک پیچھے ہٹ جاتا ہے اور سالک منزلِ مقصود تک پہنچے بغیر ہی اپنا کام چھوڑ دیتا ہے۔ پھر اسے مستحبات کی بجاآوری کا شوق اور انکی طرف میلان باقی نہیں رہتا۔ ابتداء میں افراط اور آخر میں اس تفریط کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سالک وقتی ذوق وشوق کی بنا پر مستحبات کی بجا آوری میں انتہا پسندی سے کام لیتا ہے اور نفس پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈال دیتا ہے۔ جب وہ عارضی شوق ختم ہوجاتا ہے اور جوش ٹھنڈا پڑجاتا ہے تو نفس اس بارگراں سے تنگ آکر اس کے اٹھانے سے انکار کردیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سلوک کا سفر درمیان ہی میں رہ جاتا ہے اس لیے سالک کو وقتی جوش اور عارضی شوق سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے بلکہ وقتی نظر سے اپنے حالات، اپنی استعدادِ کار خصوصیات، پیشہ اور اپنی قوتِ برداشت کا صحیح اندازہ لگا کر اسی قدر بلکہ اس سے بھی کچھ کم اعمال واشتغال کو اختیار کرنا چاہیے جتنے کو وہ ہمیشہ نبھا سکے تاکہ اعمال سے پوری ایمانی لذت حاصل ہو، اس لیے سالک کو چاہیے کہ عبادت میں اس وقت مشغول ہو جب اپنے اندر اس کا شوق پائے اور ابھی رغبت اور میلان باقی ہی ہو، تو عبادت سے ہاتھ کھینچ لے تاکہ عبادت کا شوق اور تشنگی باقی رہے۔ عبادت کے معاملے میں سالک کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کچھ کھانا چاہتا ہے۔ سب سے پہلے تو اسے ایسی غذا کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کے مزاج

کے موافق ہو، پھر سیر ہونے سے پہلے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے تاکہ کھانے کی رغبت باقی رہے۔ رفق و مدارا کا یہی مضمون اس حدیث سے بھی مستنبط ہوتا ہے۔ جس میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے عبدالعزیز قراطیسی سے فرمایا:

یَاعَبْدَ الْعَزِیْزِ اِنَّ لِلْاِیْمَانِ عَشْرَ دَرَجَاتٍ بِمَنْزِلَۃِ السُّلَّمِ یُصْعَدُ مِنْہُ مِرْقَاۃً بَعْدَ مِرْقَاۃٍ . . . وَاِذَا رَاَیْتَ مَنْ ھُوَ اَسْفَلُ مِنْکَ بِدَرَجَۃٍ فَارْفَعْہُ اِلَیْکَ بِرِفْقٍ وَلَا تَحْمِلَنَّ عَلَیْہِ مَالَا یُطِیْقُ فَتَکْسِرَہٗ۔ "عبدالعزیز" ایمان کے دس درجے ہیں، گویا یہ ایک سیڑھی ہے جس کے ڈنڈوں پر ایک ایک کر کے چڑھا جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا: جب تم یہ دیکھو کہ کوئی تم سے ایک سیڑھی نیچے ہے تو اس کو نرمی سے اٹھا کر اپنے برابر لے آؤ مگر اس پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ وہ برداشت نہ کر سکے ورنہ تم اس کو توڑ دو گے۔"

اصولی طور پر اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سیر و سلوک میں وہی اور صرف وہی عبادت کارآمد ہے جو شوق اور رغبت سے بجالائی جائے۔ یہی معنی ہیں امام صادق علیہ السلام کے قول کے۔

وَلَا تُکْرِھُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمُ الْعِبَادَۃَ. اپنے آپ کو عبادت کے لیے مجبور نہ کرو۔

چہارم، وفا:

اس سے مراد یہ ہے کہ جس غلط کام سے ایک دفعہ توبہ و استغفار کر لے پھر کبھی اس کا ارتکاب نہ کرے اور جو عہد کرے اس کو وفا کرے۔ اپنے

جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی

حق آگاہ شیخ سے جو وعدہ اور عہد کرے اس کو آخر تک نبھائے۔

پنجم، ثبات و دوام:

اس مطلب کی توضیح سے پہلے ایک تمہید ضروری ہے۔ آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن موجودات کا ہم اپنے حواس سے ادراک کرتے ہیں اور جو کام ہم اس دنیا میں بجالاتے ہیں اور جو کچھ بھی اس مادی دنیا میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ ان سب کی اس مادی، جسمانی، ظاہری اور محسوس دنیا کے ماوراء ایک بلند مرتبہ حقیقت بھی ہے جو مادہ اور زمان و مکان اور ان کے تمام عوارض سے بے نیاز ہے۔ جب یہ حقائق اپنے واقعی مقام سے تنزل کرتے ہیں اور نیچے آتے ہیں تو وہ اس دنیا میں مادی اور محسوس صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ قرآن مجید میں تصریح ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ "کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور ہم ہر چیز ایک معلوم مقدار میں نازل کرتے ہیں"۔ (سورۂ حجر۔ آیت ۲۱)

مختصراً اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ جس چیز کا بھی اس مادی جہان میں وجود ہے اس کی اس خارجی وجود سے پہلے ایک اور حقیقت ہے جو اندازے اور مقدار سے مبرا ہے۔ جب وہ چیز اس دنیا میں نازل ہوتی ہے تو علم باری تعالیٰ کے مطابق اس کی مقدار مقرر کر دی جاتی ہے اور وہ محدود ہو جاتی ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ۔

جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی جامع تعلیمات اسلامی

"کوئی بھی مصیبت جو دنیا میں آتی ہے یا خاص تمہاری جانوں میں یہ سب ایک کتاب میں لکھی ہوتی ہیں اس سے پیشتر کہ ہم ان کو پیدا کریں' بلاشبہ یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔" (سورۃ حدید- آیت ۲۲)

چونکہ ہر شئے کی خارجی صورت معین اور محدود ہے اور اس پر وہ تمام عوارض ظاہر ہوتے ہیں جو مادہ کا خاصہ ہیں جیسے بنتا اور بگڑنا' اس لیے اس دنیا کی ہر چیز ختم ہو جانے والی' فانی اور زوال پذیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ تمہارے پاس جو کچھ ہے ختم ہونیوالا ہے لیکن وہ عالی اور مجرد حقائق جو مادی عوارض سے پاک ہیں اور جو خزانوں کا حکم رکھتے ہیں' ثبات' دوام اور کلیت کے اوصاف سے متصف ہیں کہ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ یعنی جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث بھی جو فریقین میں متفق علیہ ہے' اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے:

نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ أُمِرْنَا أَنْ نُكَلِّمَ النَّاسَ عَلَىٰ قَدْرِ عُقُولِهِمْ.

"ہم گروہ انبیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کریں۔" اس حدیث کا تعلق حقائق کی کیفیت کے بیان سے ہے کمیت کے بیان سے نہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ہم پیغمبر' حقائق عالیہ کو اس طرح گھٹا کر اور آسان بنا کر بیان کرتے ہیں کہ وہ سننے والوں کی عقل و فہم کے مطابق ہو جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن دنیا اور اس کی چکا چوند کی طرف متوجہ ہونے کے سبب اور بیکار خواہشات کے ہجوم میں پھنس کر زنگ آلود اور دھندلا ہو گیا ہے۔ وہ حقائق کی اصلیت کا صحیح

جامع تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

ادراک نہیں کر سکتا۔ انبیائے عظام کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بچوں کے سامنے کوئی حقیقت بیان کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے وہ مجبور ہوگا کہ اس حقیقت کو ایسے طریقے سے بیان کرے جو بچوں کی سمجھ اور انکے مشاہدے سے ہم آہنگ ہو۔ یہی حال پیغمبران عظام کا ہے جو شریعت کے پاسدار ہیں۔ لبسا اوقات پیغمبر زندہ حقائق کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقائق بے جان، بے حس اور بے شعور ہیں حالانکہ شریعت کے ظاہری احکام بھی جیسے نماز، روزہ، حج، زکات، خمس، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ، ان میں سے ہر ایک کی ایک زندہ اور باشعور حقیقت ہے۔

سالک اس شخص کو کہتے ہیں جو سلوک و مجاہدہ کے ذریعے سے یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور عنایت سے عبودیت، خاکساری اور تضرع و زاری کے زیر سایہ نفس اور عقل کی کدورت اور ان کا میل کچیل دُور کر دے تاکہ وہ پاک صاف عقل اور روشن و منور نفس سے حقائق عالیہ کا اسی زندگی اور اسی عالم خاکی میں مشاہدہ کر سکے۔ ایسا اکثر اتفاق ہوتا ہے کہ سالک وضو اور نماز کو بھی ان کی واقعی صورت میں دیکھ لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ شعور و ادراک کے لحاظ سے یہ واقعی صورت اس جسمانی صورت سے جو خارج میں پائی جاتی ہے ہزار گنا بہتر ہے۔

چنانچہ عبادات کے برزخ اور قیامت میں اپنی مثالی صورتوں میں ظاہر ہونے اور انسانوں سے باتیں کرنے سے متعلق نہایت عمدہ اور قیمتی مضامین ائمہ طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین کی روایات میں آئے ہیں۔ خود قرآن مجید میں بھی آنکھوں، کانوں اور دوسرے اعضاء کے بولنے

کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مسجد صرف اینٹ اور مٹی ہی کا مجموعہ ہے۔ اس کی بھی زندہ اور باشعور حقیقت ہے۔ اسی وجہ سے روایات میں آیا ہے کہ کل قیامت کے دن قرآن اور مسجد اپنے پروردگار سے شکایت کریں گے۔ سالکین میں سے کوئی شخص اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کروٹ جو بدلی، اچانک زمین سے ایک چیخ سنائی دی۔ وجہ معلوم کرنی چاہی تو معلوم نہیں خود ہی احساس ہوا یا کسی نے بتلایا کہ زمین نے یہ چیخ تمہارے فراق میں ماری تھی۔

اب اس تمہید کے بعد آمدم بر سرِ مطلب۔ سالک کو چاہیے اعمال پر مُواظبت اور مداومت کے ذریعے سے ان کی ملکوتی اور مجرّد صورت اپنے نفس میں جما ے تاکہ حال سے ملکہ کے مقام تک ترقی کر سکے۔ سالک کو چاہیے کہ ہر عمل کو بار بار دہرا کر اس عمل سے ایمانی اور روحانی لذت حاصل کرے۔ جب تک یہ بات حاصل نہ ہو جائے اس عمل کو نہ چھوڑے۔ کسی عمل کا مستقل ملکوتی پہلو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس عمل پر اس قدر مداومت نہ کی جائے کہ اس فانی اور خارجی عمل کا اثر نفس میں اس طرح جم نہ جائے کہ پھر مٹائے نہ مٹ سکے۔ اس لیے سالک کے لیے اول یہ ضروری ہے کہ ایسے عمل کا انتخاب کرے جو اس کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ہو۔ جس عمل پر مداومت کا ارادہ نہ ہو۔ اس کا انتخاب ہی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اگر کسی عمل کو ترک کر دیا جائے تو اس عمل کی حقیقت مخالفت پر آمادہ ہو جاتی ہے اور اس عمل کے جو آثار اب تک مرتب ہوئے تھے ان کو یکسر محو کر دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں الٹے آثار نفس میں ظاہر ہونے لگتے

ہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ مخالفت کا یہ مطلب ہے کہ جب سالک کسی عمل کو ترک کر دیتا ہے تو اس عمل کی حقیقت ردِّ عمل کے طور پر سالک سے دُور ہٹ جاتی ہے اور اپنی خصوصیات اور آثار کو بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ چونکہ وہ عمل نورانی تھا، عملِ خیر تھا، جب نفس اس کے نورانی آثار سے خالی ہو جاتا ہے تو لامحالہ ان آثار کے مخالف آثار جو ظلمت، تیرگی اور شر پر مشتمل ہوتے ہیں، ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لَا یُوْجَدُ عِنْدَ اللّٰہِ اِلَّا الْخَیْرُ وَاَمَّا الشُّرُوْرُ وَالْقَبَائِحُ وَالظُّلُمَاتُ اِنَّمَا ھِیَ مِنْ اَنْفُسِنَا۔ "اللہ کے پاس تو خیر ہی خیر ہے۔ رہے شر، برائیاں اور تیرگیاں تو یہ ہماری اپنی طرف سے ہیں۔" اس بنا پر جو عیب اور نقص پیدا ہو، اس کا سبب آدمی ہیں وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ "الٰہی شر کی نسبت تیری طرف نہیں ہو سکتی۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کا فیضان عام ہے۔ یہ کسی طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اللہ کی شانِ ربوبیت اور رحمت لامتناہی تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس میں مسلمان، یہودی، نصرانی، مجوسی، آتش پرست اور بت پرست کی کوئی تخصیص نہیں لیکن بعض انسانوں کی اپنی غلط روی کے سبب ان میں جو خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں، ان کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کی وسیع رحمت بعض کو سرور و شادمانی دیتی ہے اور کچھ دوسروں میں غم و اندوہ پیدا کرتی ہے۔

ششم، مراقبہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک ہر حال میں اس بات کا دھیان رکھے کہ اپنے فرض سے تجاوز نہ کرے اور جو فیصلہ اس نے کر لیا ہے اس پر قائم رہے۔ مراقبہ کا مفہوم وسیع ہے۔ مقامات و درجات کے اختلاف اور

منازلِ سلوک کے تفاوت کے لحاظ سے اس کے معنی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ابتدائے سلوک میں مراقبہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے تمام کاموں سے اجتناب کیا جائے جن سے دین و دنیا کا کوئی فائدہ نہیں اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ کوئی قول و فعل خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہونے پائے۔ آہستہ آہستہ یہ مراقبہ زیادہ سخت اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔ کبھی مراقبہ سے مراد ہوتی ہے اپنے سکوت کی طرف توجہ، کبھی اپنے نفس کی طرف توجہ اور کبھی اس سے بھی بالاتر حقیقت یعنی اسماء و صفاتِ الٰہی کی حقیقت کی طرف توجہ۔ اس کے مراتب و درجات انشاء اللہ آگے چل کر بیان کیے جائیں گے۔

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مراقبہ سلوک کی شرائط میں سے ایک اہم شرط ہے۔ مشائخ کرام نے اس کی بہت تاکید کی ہے اور سیر و سلوک کے لیے اس کو نہایت ضروری قرار دیا ہے۔ یہ گویا سیر و سلوک کا بنیادی پتھر ہے۔ ذکر و فکر اور دوسرے امور کی تعمیر اسی بنیاد پر ہوتی ہے لہٰذا اگر مراقبہ نہ کیا جائے تو ذکر و فکر کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ مراقبہ ایسا ہی ہے جیسا مریض کے لیے نامناسب غذا سے پرہیز۔ ذکر و فکر بمنزلہ دوا کے ہے۔ جب تک مریض ضروری پرہیز نہیں کریگا دوا بے اثر رہیگی۔ بسا اوقات دوا کا الٹا اثر ہوگا، اسی لیے بزرگانِ دین اور اس راہ کے بڑے بڑے اساتذہ مراقبہ کے بغیر ذکر و فکر سے منع کرتے ہیں اور ذکر و فکر کا سالک کے درجے کے لحاظ سے انتخاب کرتے ہیں۔

ہفتم، محاسبہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ دن رات میں کوئی ایک وقت مقرر کرکے اسوقت

جامع تعلیمات اسلامی

اپنے شب و روز کے کاموں کا جائزہ لیا جائے۔ محاسبہ حضرت موسیٰ بن جعفر الکاظم ؑ کے اس قول سے ماخوذ ہے: لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یُحَاسِبْ نَفْسَہٗ کُلَّ یَوْمٍ مَرَّۃً "وہ ہم میں سے نہیں ہے جو اپنے نفس کا دن میں ایک مرتبہ محاسبہ نہیں کرتا" اگر محاسبہ کرنے پر سالک کو معلوم ہو کہ اس نے اپنا کوئی فرض پورا نہیں کیا تو اس کو چاہیے کہ استغفار کرے اور اگر اس نے سب فرائض پورے کر دیے ہیں تو باری تعالیٰ شانہ کا شکر ادا کرے۔

ہشتم، مواخذہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سالک یہ دیکھے کہ اس سے کوئی کوتاہی یا غلطی ہو گئی ہے تو جس طرح مناسب سمجھے اپنے نفس کو تنبیہ کرے اور سزا دے۔

نہم، مسارعت:

یعنی جس کام کا اس نے عزم کر رکھا ہے، اس کو انجام دینے میں جلدی کرے۔ چونکہ اس راہ میں طرح طرح کے موانع پیش آتے ہیں اس لیے سالک کو چاہیے کہ ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہے اور اس سے پہلے کہ کوئی رکاوٹ پیش آئے اور اس کے کام میں رخنہ ڈالے اپنا کام پورا کر لے اور اپنا مقصد حاصل کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرے۔

دہم، ارادت:

سالک کو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے خلفائے برحق[لہ]

لہ وہ بزرگوار جو دین کی مکمل معرفت رکھتے ہوں اور نبی اکرمؐ کے بعد آپ کی وصایت و امامت کی رہبری کا فریضہ انجام دیں۔ متفق بین الفریقین حدیث کے (جاری ہے)

جامع تعلیمات اسلامی

سے ایسی خالص عقیدت و محبت ہونی چاہیے جس میں قطعاً کوئی آمیزش نہ ہو۔ اس مرحلے میں کمال درجہ عقیدت و محبت کی ضرورت ہے کیونکہ عقیدت کو اعمال کی تاثیر میں بڑا دخل ہے۔ عقیدت جتنی زیادہ اور گہری ہوگی اتنا ہی اعمال کا اثر بھی بہتر اور دیرپا ہوگا۔

چونکہ تمام موجودات خدا کی مخلوق ہیں اس لیے سالک کو چاہیے کہ ان سب سے محبت کرے اور ان کے درجات کے مطابق ان کا احترام کرے۔ سب انسانوں اور حیوانوں پر ان کے اپنے اپنے درجے کے مطابق شفقت اور مہربانی خدا کی محبت کے آثار میں سے ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ایمان کی ایک خاص شاخ خلق خدا پر شفقت ہے اَللّٰھُمَّ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ۔ بارِ الٰہا! میں تجھ سے تیری محبت اور ان کی محبت مانگتا ہوں جو تجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

اُحِبُّ بِحُبِّہَا تَلْعَاتِ نَجْدٍ ۔ وَمَا شَغْفِی بِہَا لَوْلَا ھَوَاھَا۔

"لیلیٰ کی وجہ سے میں نجد کی پہاڑیوں سے بھی محبت کرتا ہوں۔ اگر لیلیٰ کی محبت نہ ہوتی تو مجھے ان پہاڑیوں سے کیا دلچسپی تھی؟"

مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: "میرے بعد بارہ خلفاء/امیر ہونگے۔ صحیح بخاری صفحہ ۱۷۵ مطبوعہ مصر ۱۳۵۵ھ۔ صحیح ترمذی جلد دوم صفحہ ۱۹۱ مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ۔ سنن ابی داؤد جلد دوم صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ مصر۔ مسند احمد بن حنبل جلد پنجم صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ مصر ۱۳۱۳ھ۔ مستدرک حاکم جلد دوم صفحہ ۶۱۸ مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ ینابیع المودۃ، صفحہ ۴۴۵ مطبوعہ استنبول۔ منتخب کنز العمال جلد پنجم صفحہ ۳۱۲۔

یازدہم: پاسِ ادب:

رب العزت اور اس کے خلفاء کے ادب کا خیال رکھنا۔ اس عقیدت و محبت سے جس کا اوپر ذکر ہوا مختلف چیز ہے۔ ادب کے معنی ہیں خود اپنی طرف توجہ شامل ہے یعنی اس بات کا خیال کہ ہم اپنی حدود سے تجاوز نہ کر جائیں اور کوئی بات مقتضائے عبودیت کے خلاف نہ ہو جائے کیونکہ ممکن الوجود کو واجب الوجود کے مقابلے میں اپنی حدود کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ادب کا خیال رکھنا اس عالمِ کثرت کی ضروریات میں سے ہے جبکہ محبت و عقیدت اس ذاتِ واحد کی طرف میلان ہے جس میں قدرتی طور پر وحدت کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

عقیدت اور ادب کا آپس میں وہی تعلق ہے جو احکام میں واجب اور حرام میں تعلق ہے کیونکہ واجب کو ادا کرتے وقت، سالک کی نظر محبوبِ حقیقی کی طرف ہوتی ہے اور حرام سے اجتناب کے وقت خود اپنی حدود کی طرف کہ کہیں وہ اپنی امکانی حدود اور مقتضائے عبودیت سے تجاوز نہ کر جائے۔ درحقیقت ادب کا مطلب خوف و امید کے درمیان معتدل راستا اختیار کرنا ہے۔ ادب نہ کرنا ضرورت سے زیادہ بے تکلفی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر یہ حد سے بڑھ جائے تو سخت ناپسندیدہ ہے۔

مرحوم حاجی مرزا علی آغا قاضی رضوان اللہ علیہ پر خوف کے مقابلے میں انبساط اور عقیدت کا غلبہ تھا۔ یہی حال مرحوم حاجی شیخ محمد بہاری کا تھا۔ ان کے برعکس حاجی مرزا جواد آغا ملکی تبریزی پر رجاء اور انبساط کے مقابلے میں خوف کا غلبہ تھا۔ یہ بات ان کے اقوال سے اشارتاً مفہوم ہوتی ہے۔ جس پر انبساط اور بے تکلفی کا غلبہ ہو اس کو "خراباتی" کہتے ہیں اور جس

کا خوف بڑھا ہوا ہو اس کو "مناجاتی" لیکن کمال یہ ہے کہ دونوں کے بین بین اعتدال کی راہ اختیار کی جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں کمال درجہ انبساط بھی ہو اور کمال درجہ خوف بھی۔ یہ وصف فقط ائمہ طاہرین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کے یہاں ملتا ہے۔

غرض حاصل کلام یہ ہے کہ ادب سے مراد یہ ہے کہ انسان جو ممکن الوجود ہے اپنی حدود کو فراموش نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے ان کے متعلق کوئی ایسی بات کہی جاتی تھی جس میں غلو کا شائبہ ہوتا تھا تو آپ فوراً خاک پہ سجدہ ریز ہو جاتے اور اپنی پیشانی خاک پر ملتے تھے۔

ادب کا کامل مرتبہ یہ ہے کہ سالک ہر حال میں خود کو حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے حضور میں حاضر سمجھے اور بات چیت، خاموشی، کھانے پینے، سونے، الغرض تمام حالات اور حرکات و سکنات میں ادب کو ملحوظ رکھے۔ اگر سالک ہمیشہ اسماء و صفات الٰہی کو نظر میں رکھے تو خود ہی آداب کا خیال رہے گا اور اپنی عاجزی ہر وقت نظروں کے سامنے رہے گی۔

دوازدہم، نیت:

اس سے مراد یہ ہے کہ سالک کی بجز سلوک اور ذاتِ خداوندی میں فناء کے اور کوئی غرض نہ ہو۔ اس کی سیر خالص ہونی چاہیے۔ فَاعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ "اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ عبادت اسی کے لیے خالص رکھو۔"

متعدد روایات میں آیا ہے کہ نیت کے تین درجے ہیں۔ امام جعفر صادق ع

نے فرمایا ہے:

اَلْعُبَّادُ ثَلَاثَۃٌ: قَوْمٌ عَبَدُوا اللّٰہَ خَوْفًا فَتِلْکَ عِبَادَۃُ الْعَبِیْدِ وَقَوْمٌ عَبَدُوا اللّٰہَ طَمَعًا فَتِلْکَ عِبَادَۃُ الْاُجَرَاءِ وَقَوْمٌ عَبَدُوا اللّٰہَ حُبًّا فَتِلْکَ عِبَادَۃُ الْاَحْرَارِ۔ "عبادت کرنے والے تین طرح کے ہیں: ایک وہ جو خوف کے مارے عبادت کرتے ہیں، ان کی عبادت غلاموں کی عبادت ہے۔ دوسرے وہ جو لالچ کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں، ان کی عبادت مزدوروں کی عبادت ہے۔ تیسرے وہ جو اللہ کی عبادت اس سے محبت کی وجہ سے کرتے ہیں، یہ عبادت آزاد بندوں کی عبادت ہے۔"

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت دو طرح کی ہے۔ ایک تو صحیح معنی میں عبادت ہی نہیں کیونکہ یہ لوگ خدا کی عبادت خدا کے لیے نہیں کرتے۔ ان کی عبادت کا منشا خود پرستی ہے۔ درحقیقت وہ خود اپنے آپ کو پوجتے ہیں کیونکہ ان کے عبادت کرنے کا سبب ان کی نفسانی خواہشات ہیں اور چونکہ خود پرستی اور خدا پرستی ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں اس لیے ان لوگوں کو خدا کا منکر سمجھنا چاہیے لیکن چونکہ قرآن نے خدا پرستی کے اصول کو صاف طور پر ہر انسان کی فطرت قرار دیا ہے اور پیدائشی اوصاف میں تغیر و تبدل کی نفی کی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

"دین حق کی طرف اپنا رخ رکھو۔ اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی

نہیں۔ یہی ہے سیدھا دین لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا بھی علم نہیں رکھتے۔"

(سورۂ روم۔ آیت ۳۰)

اس لیے یہ خدا پرستی کے راستے سے انحراف نہیں بلکہ توحید کے راستے سے انحراف ہے کیونکہ یہ لوگ خدا کو افعال و صفات میں واحد نہیں سمجھتے بلکہ غیر کو اس کا شریک و سہیم قرار دیتے ہیں۔ قرآن نے سب جگہ خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا ہے اور اس کے شریک و سہیم کی نفی کی ہے۔ اس طرح عبادت گزاروں کے پہلے دو گروہ خدا کو اپنے مقصد میں سہیم و شریک گردانتے ہیں اور خدا پرستی میں بھی خود پرستی سے باز نہیں رہتے۔ عبادت میں ان کے پیش نظر دونوں مقصد رہتے ہیں اور یہی شرک ہے۔ دراصل یہ دونوں گروہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں جس کی نص قرآن کے مطابق بخشش نہیں ہے[1]۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ "اللہ ہرگز معاف نہیں کریگا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور معاف کر دے گا اس سے کم (گناہ) کو جس کو چاہیگا۔"

(سورۂ نساء۔ آیات ۴۸ اور ۱۱۶)

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے دو گروہوں کی عبادت بار آور نہیں ہو گی اور نہ ان لوگوں کو خدائے متعال سے نزدیک کرے گی۔

رہا تیسرا گروہ جو محبت کی بنا پر خدا کی پرستش کرتا ہے اس کی عبادت احرار کی عبادت ہے اور ایک روایت کے مطابق معززین کی عبادت ہے۔

---

[1] شرک جلی عام مسلمانوں کے لیے روا نہیں ہے جبکہ احرار اور اولیاء کے لیے شرک خفی بھی ناروا ہے۔

جامع تعلیمات اسلامی

اسی گروہ کی عبادت اصلی اور واقعی ہے مگر یہ درجہ پاکانِ بارگاہ خداوندی ہی کو نصیب ہوتا ہے۔

فَهٰذَا مَقَامٌ مَّكْنُوْنٌ ۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۔ "یہ وہ پوشیدہ مقام ہے جس تک پاک لوگ ہی پہنچتے ہیں۔"

محبت کا مطلب ہے کشش یعنی کسی چیز کا کسی شخص یا کسی حقیقت کی طرف کھنچنا یا مائل ہونا۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے اپنی عبادت اور پرستش کی بنیاد محبت اور خدا کی طرف اپنے میلان پر رکھی ہے۔ ان کا مقصد سوائے خدا کی طرف کھنچنے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے کچھ نہیں۔ یہ اپنے اندر محبوب حقیقی کی طرف کشش محسوس کرتے ہیں۔ ان کی عبادت کا محرک محبوب حقیقی ہے اور اسی کی بارگاہ کی طرف ان کی حرکت ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ کی اس لیے عبادت کرو کہ وہ عبادت کا مستحق ہے جیسا کہ ظاہر ہے اس اہلیت و استحقاق کا تعلق خدا کی صفات سے نہیں بلکہ خود اس کی ذاتِ اقدس سے ہے اس لیے اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کی عبادت اس لیے کرو کہ وہ خدا ہے۔

اِلٰهِيْ مَا عَبَدْتُكَ خَوْفًا مِّنْ نَّارِكَ وَلَا طَمَعًا فِيْ جَنَّتِكَ بَلْ وَجَدْتُكَ اَهْلًا لِّلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُكَ ۔ اَنْتَ دَلَلْتَنِيْ عَلَيْكَ وَدَعَوْتَنِيْ اِلَيْكَ وَلَوْلَا اَنْتَ لَمْ اَدْرِ مَا اَنْتَ ۔

"الٰہی میں نے تیری عبادت تیرے جہنم کی آگ کے خوف یا تیری جنت کے لالچ میں نہیں کی بلکہ میں نے دیکھا کہ تو عبادت کا مستحق ہے اس لیے میں نے

جامع تعلیمات اسلامی

تیری عبادت کی۔ تو نے ہی مجھے اپنا پتا بتلایا اور اپنی طرف بلایا۔ اگر تو نہ ہوتا تو مجھے کیسے معلوم ہوتا کہ تو کیا ہے۔" (امام علیؑ)

ابتدائے سلوک میں سالک محبت کے سہارے آگے بڑھتا ہے لیکن جب کچھ منزلیں طے کر لیتا ہے اور فی الجملہ کچھ کمال حاصل کر لیتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ محبت اور ہے اور محبوب اور' اس لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ محبت جو اب تک اس کی ترقی کا ذریعہ رہی ہے اسے چھوڑ دے اور یہ سمجھ لے کہ یہ ذریعہ یہیں تک کام دیتا تھا اور اب مزید ترقی میں یہ رکاوٹ ہے۔ یہاں سے سالک کی ساری توجہ محبوب کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور وہ اس کو فقط محبوب سمجھ کر اس کی عبادت کرتا ہے۔ جب چند قدم اور آگے بڑھتا ہے اور چند منزلیں اور طے ہو جاتی ہیں تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ عبادت بھی شرک سے خالی نہیں کیونکہ اس نے خود کو محبّ و عاشق اور خدا کو معشوق و محبوب سمجھا ہے حالانکہ خودی کا احساس محبوب کی محبت کے منافی ہے۔ محبوبِ حقیقی کو اس نظر سے دیکھنا کہ اس کا ایک محب بھی موجود ہے' اس کی ذاتِ اقدس کی عبادت سے میل نہیں کھاتا اس لیے یہاں سے سالک یہ کوشش کرتا ہے کہ محبت اور عشق کو بھول جائے تاکہ غیریت اور کثرت کو چھوڑ کر عالم وحدت میں قدم رکھ سکے۔ اس مرحلے میں سالک کا اپنا ارادہ باقی نہیں رہتا کیونکہ اب اس کی شخصیت اور خودی فنا ہو چکی ہے پھر ارادہ اور نیت کا کیا سوال۔

اس مرحلے سے پہلے تک سالک شہود' کشف اور مکاشفہ کا جویا تھا لیکن اس منزل پر وہ ان تمام مقاصد کو بالکل بھلا دیتا ہے کیونکہ اب

جامعہ تعلیمات اسلامی

نہ ارادہ رہا نہ نیت، اور جب کوئی ارادہ نہیں تو کوئی مراد بھی نہیں۔ اس حالت میں سالک کی آنکھ اور اس کے دل کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنا کام کر رہے ہیں نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنا کام نہیں کر رہے۔ دیکھنے نہ دیکھنے، پہنچنے نہ پہنچنے، جاننے نہ جاننے، ماننے نہ ماننے کی بات ہی نہیں کی جاسکتی۔ حافظ شیرازی کا شعر ہے:

با خرابات نشیناں ز کرامات ملاف

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد

بایزید بسطامیؒ سے منقول ہے کہ پہلے دن میں نے دنیا کو ترک کر دیا، دوسرے دن عقبیٰ کو بھی ترک کر دیا، تیسرے دن ماسوی اللہ کو بھلا دیا، چوتھے دن مجھ سے پوچھا گیا: مَا تُرِیْدُ؟ (کیا چاہتے ہو؟) میں نے جواب دیا: اُرِیْدُ اَنْ لَا اُرِیْدَ۔ (میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں) اس میں اشارہ اسی مضمون کی طرف ہے جس کے مطابق بعض لوگوں نے چار منزلیں مقرر کی ہیں یعنی اول ترکِ دنیا، دوم ترکِ عقبیٰ، سوم ترکِ مولیٰ اور چہارم ترکِ ترک۔ اس بات کو غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس کو سالکین قطعِ طمع یعنی تمام خواہشات کو ختم کر دینا کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے لیکن ہے بہت ہی مشکل۔ یہ بات آسانی سے حاصل نہیں ہوتی کیونکہ سالک جب خوب غور کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے سے گزرتے ہوئے بھی اس کا دل قصد و نیت سے خالی نہیں ہے بلکہ اس کے دل کی گہرائی میں ایک مقصد اور خواہش موجود ہے۔ گویہ مقصد ضعف و نقص کے مراحل سے گزر کر کمال کا حصول ہی

کیوں نہ ہو۔ اگر سالک کسی طریقے اور کسی ذریعے سے اپنے ذہن کو خالی کرنے کی کوشش کرے گا اور بار بار اس گھاٹی سے گزرنے کے لیے اپنے اوپر دباؤ ڈالے گا اور اس خواہش اور مقصد کو بھلانے کی کوشش کرے گا تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کیونکہ نفس کو خالی رکھنے کی شعوری کوشش کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نفس خالی نہیں ہوگا۔ نفس کو خالی کرنے کی کوشش خود ایک خواہش اور مقصد ہے اور یہ نشانی ہے سالک کے خالی النفس نہ ہونے کی۔

ایک روز اپنے استاد مرحوم حاجی مرزا علی آغا قاضی رضوان اللہ علیہ سے میں نے اس مسئلہ کا ذکر کیا اور پوچھا کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ فرمایا: طریقہ' احراق اختیار کرنے سے یہ مشکل حل ہو سکتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سالک یہ محسوس کرے کہ خداوند متعال نے اس کے وجود کو آرزومند بنایا ہے اور وہ خواہ جتنی بھی کوشش کرے آرزو اور خواہش کو کلیتہً ختم نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اس کی فطرت میں داخل ہیں لہٰذا اس کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں۔ ایک خواہش کو ختم کرنے کی کوشش کا لازمی نتیجہ ایک دوسری خواہش کو پیدا کرنا ہے بلکہ ایک بالاتر خواہش کے ذریعے سے ایک ادنیٰ خواہش کو ختم کرنے کی کوشش ہے لہٰذا اگر سالک اپنے عجز کو محسوس کرے اور خواہشات کو ختم کرنے کی کوشش ترک کر دے تو وہ قدرتی طور پر اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیگا اور خواہشات ختم کرنے کا قصد نہیں کرے گا۔ یہ عجز و بیچارگی کا احساس خود خواہشات کی جڑ کو جو اس کی طبیعت میں موجود ہے جلا دیگا اور سالک کو پاک اور پاکیزہ بنا دیگا لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس مضمون کا نظری علم کافی نہیں۔ اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا بلکہ

جامعہ تعلیمات اسلامی

اس بات کا واقعی احساس ہونا چاہیے جس کے لیے ذوق اور خاص کیفیت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی کو اس مضمون کا واقعی ذوق پیدا ہو جائے تو وہ محسوس کریگا کہ دنیا جہان کی تمام لذتیں اس ایک حقیقت کی برابری نہیں کرسکتیں۔

اس طریقہ کو احراق یعنی جلانا کیوں کہتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طریقہ نیت، ارادے اور اس سلسلے کی تمام مشکلات کے خرمنِ وجود ہی کو جلا دیتا ہے اور ان کو جڑ سے اس طرح ختم کر دیتا ہے کہ ان کا نام و نشان سالک کے وجود میں باقی نہیں چھوڑتا۔

قرآن مجید میں متعدد مواقع پر طریقۂ احراقیہ سے کام لیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص مقصد کے حصول کے لیے اس طریقے کو استعمال کرے تو سالوں کا راستہ بہت تھوڑی مدت میں طے کریگا۔ ایک موقع جہاں قرآن مجید میں اس طریقے سے کام لیا گیا ہے۔ کلمۂ استرجاع ہے یعنی اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

مصیبتوں، بلاؤں اور فتنوں کے وقت انسان اپنے آپ کو مختلف طریقوں سے تسلی دیتا ہے مثلاً وہ یہ یاد کرے کہ موت اور مصیبتیں سب کے لیے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس کو تسکین حاصل ہو جاتی ہے لیکن اللہ نے طریقۂ احراقیہ کے ذریعے سے اور کلمۂ استرجاع کو پڑھنے کی تلقین کر کے راستے کو مختصر کر دیا ہے اور ایسا طریقہ بتلا دیا ہے جس سے مشکل بالکل آسان ہو جاتی ہے۔ اگر انسان یہ سمجھ لے کہ وہ خود اس کی تمام مملوکہ چیزیں اور وہ تمام چیزیں بھی جن کا اس سے کسی طرح کا تعلق ہے سب کی سب دراصل

خدا کی ملکیت ہیں اور اسے ان میں تصرف کا پورا اختیار ہے' وہ ایک دن دیتا ہے اور ایک دن لے لیتا ہے۔ کسی کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ اگر آدمی بخوبی سمجھ لے کہ وہ ابتداء سے کسی چیز کا مالک نہیں، اسکی ملکیت محض مجازی ہے اور وہ بلا وجہ اپنے آپ کو مالک سمجھتا ہے تو اس کو کسی چیز کے جاتے رہنے کا غم نہ ہو اور راستا اس کے لیے آسان ہو جائے۔ اگر وہ یہ محسوس کرے کہ خدا نے انسان کو شروع ہی سے آرزو مند بنایا ہے اور غنی علی الاطلاق نے اس کو شروع ہی سے حاجتمند پیدا کیا ہے اور چونکہ حاجتمندی اس کے خمیر میں داخل ہے اس لیے اس کی حاجتمندی اور ضرورتِ سوال ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ فقیر پہ کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ وہ کیوں مانگتا ہے۔ جب یہ مان لیا کہ وہ فقیر ہے تو پھر اس کا سوال کرنا اور گدا ہونا بھی امرِ مسلّم ہو جاتا ہے اس لیے سالک راہِ خدا کو بھی سیر و سلوک کے دوران میں اگر کوئی خواہش پیدا ہو تو سمجھ لے کہ خواہش اور آرزو ابتدا ہی سے اس کی فطرت میں داخل ہے اور وہ کسی طرح بھی خواہشات سے مبرّا نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف چونکہ ذاتِ احدیت میں فنا ہونے کا کہ جس پہ احرار کی عبادت کی بنیاد ہے' ارادے اور خواہش سے میل نہیں ملتا' اس لیے سالک بیچارہ عجب بے بسی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بے بسی کی کیفیت ہی اس کی خودی کو فنا کر دیتی ہے اور چونکہ خواہش اور ارادے کی بنیاد یہی خودی ہے اس لیے اس مرحلے سے گزر جانے کے بعد نہ خواہش باقی رہتی ہے نہ ارادہ۔ یہ نکتہ اس قابل ہے کہ اس کو بغور سمجھ لیا جائے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

سیزدہم، خاموشی:

اس کی دو قسمیں ہیں: ایک سکوتِ عام اور اضافی اور دوسری سکوتِ خاص اور مطلق۔ سکوتِ عام اور اضافی سے مراد یہ ہے کہ لوگوں سے ضرورت سے زیادہ بات نہ کی جائے۔ سالک کو چاہیے کہ بقدرِ ضرورت اور کم سے کم کلام پر اکتفا کرے۔ اس طرح کا سکوت تمام سلوک کے دوران میں لازمی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مطلقاً اور ہر حال میں مستحسن ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کے اس قول میں کہ اِنَّ شِیْعَتَنَا الْخُرْسُ "ہمارے شیعہ گونگے ہیں" اسی سکوت کی طرف اشارہ ہے۔ مصباح الشریعہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اَلصَّمْتُ شِعَارُ الْمُحِبِّیْنَ وَفِیْهِ رِضَا الرَّبِّ وَهُوَ مِنْ اَخْلَاقِ الْاَنْبِیَاءِ وَشِعَارِ الْاَصْفِیَاءِ "خاموشی اللہ سے محبت کرنیوالوں کا طریقہ ہے۔ اس میں اللہ کی خوشنودی ہے اور انبیاء کا وتیرہ اور اصفیاء کا شیوہ ہے۔"

حدیثِ بزنطی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

اَلصَّمْتُ بَابٌ مِنْ اَبْوَابِ الْحِکْمَةِ وَاِنَّهٗ دَلِیْلٌ عَلٰی کُلِّ خَیْرٍ

"خاموشی حکمت کا ایک شعبہ ہے۔ یہ ہر بھلائی کی علامت ہے۔"

سکوتِ خاص و مطلق کا مطلب یہ ہے کہ زبانی ذکر کے دوران میں ہر قسم کی گفتگو سے پرہیز بہتر ہے۔

چہاردہم، بھوکا رہنا اور کم خوری:

اس کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ کمزوری اور خیالات کی پراگندگی کا سبب نہ بنے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

اَلْجُوعُ إِدَامُ الْمُؤْمِنِ وَغِذَاءُ الرُّوحِ وَطَعَامُ الْقَلْبِ "بھوک مومن کے لیے بمنزلہ سالن کے ہے۔ یہ روح کی غذا اور قلب کا کھانا ہے۔"

بھوک سے روح ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔ اس میں نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ فکر میں بلند پروازی آتی ہے۔ زیادہ کھانے اور پیٹ بھر کر کھانے سے روح میں اکتاہٹ اور تھکن پیدا ہوتی ہے۔ آسمانِ معرفت کی سیر میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ عبادات میں روزہ کی بہت تعریف آئی ہے۔ معراج کی روایات میں اللہ تعالیٰ کا اپنے حبیب سے "یا احمد" کہہ کر کلام کرنے کا تذکرہ ہے۔ یہ روایات ارشادِ دیلمی اور بحار الانوار کی جلد ہفدہم میں مذکور ہیں۔ ان روایات میں بھوکے رہنے کی فضیلت اور سیر و سلوک میں اس کے اثر کا حیرت انگیز بیان ہے۔ مرحوم استاد قاضی رضوان اللہ علیہ نے بھوکے رہنے سے متعلق ایک عجیب روایت بیان کی تھی۔ حاصل اس کا یہ تھا کہ انبیائے سلف کے زمانے میں تین آدمی اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ رات ہوئی تو وہ غذا کی تلاش میں تین مختلف جگہوں کی طرف چلے مگر آپس میں یہ طے کر لیا کہ کل ایک مقررہ وقت پر فلاں جگہ ملیں گے۔ ان میں سے ایک کی تو کسی شخص کے یہاں دعوت تھی۔ دوسرا بھی اتفاق سے کسی کا مہمان بن گیا۔ تیسرے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ میں مسجد میں جا کر خدا کا مہمان ہو جاتا ہوں۔ اس نے رات مسجد میں بسر کی اور

جامعہ تعلیمات اسلامی

صبح تک بھوکا رہا۔ صبح کو تینوں رفیق مقررہ جگہ پر ملے اور ہر ایک نے اپنی اپنی سرگزشت بیان کی۔ اس وقت حق تعالیٰ کی طرف سے اس زمانے کے نبی کے پاس وحی آئی کہ ہمارے مہمان سے کہو کہ ہم نے اس مہمانِ عزیز کی مہمان داری قبول کر لی تھی اور ہم اس کے میزبان ہو گئے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ اس کے لیے بہترین کھانے کا انتظام کریں لیکن ہم نے دیکھا تو ہمارے خزانۂ غیب میں بھوک سے بڑھ کر کوئی غذا نہیں تھی۔

پانزدہم، خلوت:

خلوت کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک خلوتِ عام، دوسری خلوتِ خاص۔

خلوتِ عام کا مطلب ہے غیر اللہ اور خصوصاً کم سمجھ عوام سے الگ تھلگ رہنا اور ان سے صرف بقدرِ ضرورت میل ملاقات رکھنا۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ "چھوڑ دو ان لوگوں کو جنھوں نے اپنے دین کو ہنسی کھیل بنا لیا ہے اور دنیوی زندگی نے جن کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔" (سورہ انعام۔ آیت ۷۰)

خلوتِ خاص کے معنی ہیں سب لوگوں سے دوری اور علیحدگی اختیار کرنا۔ اگرچہ تمام عبادات اور اذکار کے وقت یہ دوری افضل ہے لیکن کچھ زبانی اذکار بلکہ سبھی اذکار کی مشائخ کے نزدیک یہ لازمی شرط ہے اور اس کا لحاظ حسبِ ذیل امور میں کیا جاتا ہے۔

سالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ شور اور ہجوم سے دور رہے اور ان آوازوں کو نہ سنے جن سے اس کی کیفیت میں خلل پڑتا ہو۔ دوسرے

اس کی عبادت اور ذکر کی جگہ حلال اور پاک ہو۔ اس کی چھت اور دیواریں تک پاک ہوں۔ یہ جگہ اتنی چھوٹی ہونی چاہیے کہ اس میں ایک آدمی سے زیادہ کی گنجائش نہ ہو۔ کوشش کی جائے کہ اس میں دنیوی زینت اور آرائش کا کوئی سامان نہ ہو۔ چھوٹا سا کمرہ جس میں فرنیچر نہ ہو' حواس کو مجتمع رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

ایک شخص نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب کی کہ میں آپ کے لیے ایک مکان بنانا چاہتا ہوں۔ اس وقت تک حضرت سلمانؓ نے اپنے لیے کوئی مکان نہیں بنایا تھا مگر آپ نے اجازت نہیں دی۔ اس شخص نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کیوں اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ حضرت سلمانؓ نے کہا: بتلاؤ کیوں؟ اس نے عرض کی کہ وجہ یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے لیے ایسا گھر بناؤں جس کا طول و عرض اتنا ہو کہ اس میں بس آپ کی ہی گنجائش ہو اور ایسا کوئی گھر موجود نہیں ہے۔ حضرت سلمانؓ نے کہا: ہاں یہی بات ہے' تم نے صحیح کہا۔ اس کے بعد اس شخص نے اتنا ہی چھوٹا مکان بنانے کی اجازت لیکر ویسا ہی بنا دیا۔

شانزدہم' شب بیداری:

اس سے مراد صبح صادق سے اس قدر پہلے جاگنا ہے جس قدر سالک کی طبیعت برداشت کر سکے۔ سحر کے وقت سونے کی مذمت اور اس وقت کی بیداری کی عادت کی تعریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ

"رات کو تھوڑی ہی دیر سوتے تھے اور سحر کے وقت استغفار کرتے تھے"۔

چنداں بنشینم کہ برآید نفس صبح
کآں وقت بدل میرسد از دوست پیامے

ہفدہم، دوام طہارت:

اس سے مراد ہے ہر وقت باوضو رہنا اور غسلِ واجب، غسلِ جمعہ اور تمام مستحب غسلوں کی پابندی کرنا۔

ہیجدہم، تضرع وزاری میں مبالغہ:

اس سے مراد ہے تواضع، خاکساری اور گریہ و بکاء۔

نوزدہم، لذائذ سے احتراز:

اس سے مراد ہے مزیدار چیزوں سے پرہیز اور اتنے کھانے پر اکتفا کرنا جتنا زندگی اور طاقت قائم رکھنے کے لیے کافی ہو۔

بستم، رازداری:

یہ سلوک کی بڑی اہم شرائط میں سے ہے۔ بزرگانِ طریقت نے اس شرط کا بڑا اہتمام کیا ہے اور اپنے شاگردوں کو مبالغے کی حد تک تاکید کی ہے۔ خواہ وہ اعمال و اوراد میں مشغول ہوں یا واردات و مکاشفات میں حتیٰ کہ جہاں تقیہ غیر ممکن ہو وہاں توریہ[1] کی نصیحت کی ہے اور اس کو لازمی قرار دیا ہے۔ اگر رازداری کے لیے عمل اور ورد کا ترک ضروری ہو تو اس کو ترک کر دینا چاہیے۔

---

[1] جب اظہارِ حقیقت نہ کرنا ہو تو اس طرح کلام کرنا کہ سامع بعید کی بجائے معنیٔ قریب مراد لے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا عَلٰی حَوَائِجِکُمْ بِالْکِتْمَانِ

"رازداری سے کام لے کر اپنی ضرورت پوری کرو۔"

تقیہ اور رازداری سے مصیبتوں اور سختیوں میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ تقیہ ترک کرنے سے سالک کی مصیبتوں، بلاؤں اور فتنوں میں اضافے کا اندیشہ ہے۔ اگر مشکلات پیش آئیں تو سالک کو صبر و تحمل سے کام لے کر آگے بڑھنا چاہیے تاکہ کامیابی حاصل ہو۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ۔[1]

"صبر اور صلوٰۃ سے مدد چاہو اور وہ بیشک گراں ہے (سب پر) سوائے ان کے جن کے دل میں خوف ہے۔"

اس آیت میں صلوٰۃ سے اس کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی پروردگار کی طرف توجہ۔ اس بنا پر یادِ خدا میں صبر و تحمل سے کام لینے اور تکلیف برداشت کرنے سے سختیاں اور مصیبتیں ہلکی ہو جاتی ہیں اور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ اپنے گھر میں ذرا سی انگلی کٹ جانے سے بے چین ہو کر چیخنے لگتے ہیں وہی لوگ میدانِ جنگ میں ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء و جوارح کے کٹنے سے ذرا نہیں ڈرتے اور نہ پریشان ہوتے ہیں۔ اسی قاعدہ کلیہ کے مطابق ائمہ طاہرین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین نے رازداری کی عجیب عجیب طرح سے تاکید فرمائی ہے یہاں تک کہ ترکِ تقیہ کو ایک بڑا گناہ

---

[1] سورہ بقرہ۔ آیت ۴۵

شمار کیا ہے۔

شیخ صدوقؒ کی کتاب توحید کے بابِ رویت میں ایک روایت ہے کہ ایک دن ابوبصیر نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ قیامت میں خدا کا دیدار ممکن ہے؟ کیونکہ اشاعرہ[1] کا عقیدہ ہے کہ قیامت اور اگلے جہان میں سب لوگ خدا کو دیکھیں گے، جو ظاہر ہے تجسم ہی کی صورت میں ممکن ہے (تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُولُ الظَّالِمُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا) آپ نے فرمایا: خدا کا دیدار تو اس دنیا میں بھی ہو سکتا ہے جیسے تم نے ابھی اس مجلس میں خدا کو دیکھا۔ ابوبصیر نے عرض کی: اے فرزندِ رسولؐ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں یہ واقعہ دوسروں سے بیان کروں۔ حضرت نے فرمایا: نہیں۔ اسے لوگوں سے بیان مت کرو کیونکہ وہ اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکیں گے اور خواہ مخواہ گمراہ ہو جائیں گے۔

بیست ویکم، شیخ و استاد:

استاد کی بھی دو قسمیں ہیں: استادِ عام اور استادِ خاص۔ استادِ عام وہ ہے جس کے ذمہ خاص طور پر کسی کی ہدایت نہ ہو بلکہ اہل علم و تجربہ ہونے کی بنا پر اس سے رجوع کیا جاتے اور وہ فَاسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (اگر تمہیں معلوم نہیں تو جاننے والوں سے پوچھ لو) کے عموم کے تحت آتا ہو۔ استادِ عام سے صرف سیر و سلوک کی ابتدا میں رجوع کیا جاتا ہے۔ جب سالک ذات و صفات کے مشاہدہ اور تجلیات

---

[1] اہل سنت کے مشہور امام شیخ ابوالحسن اشعری کے پیروکار۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

سے مشرف ہونے لگتا ہے، پھر اسے استادِ عام کے ساتھ رہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ استادِ خاص وہ ہے جس کے متعلق نقل سے ثابت ہے کہ اس کا کام ارشاد و ہدایت ہے۔ یہ منصب رسولِ خداؐ اور آپ کے خلفائے برحق کا ہے۔ ان کی رہنمائی اور ہمراہی سے کسی حال میں بھی مفر نہیں چاہے سالک منزلِ مقصود تک پہنچ ہی چکا ہو۔ یہاں ہمراہی سے مراد امام کی باطنی ہمراہی ہے نہ کہ ظاہری کیونکہ امام کی اصل حقیقت ان کی نورانیت کا وہ مقام ہے جس کے دائرۂ اقتدار و اختیار میں تمام عالم اور اہلِ عالم ہیں۔ گو امام کا جسم بھی باقی لوگوں کے اجسام پر فضیلت رکھتا ہے لیکن کائنات پر تصرف کا سرچشمہ امام کا بدن نہیں ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے یہاں یہ یاد دلانا مناسب ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اس کا سرچشمہ اسماء و صفات الٰہی ہیں اور یہی اسماء و صفاتِ الٰہی امام کی حقیقت بھی ہیں۔ اسی بناء پر ائمہؑ نے فرمایا ہے کہ بِنَا عُرِفَ اللّٰہِ، بِنَا عُبِدَ اللّٰہِ ہم سے ہی لوگوں نے اللہ کو پہچانا اور اس کی عبادت کی اس لیے یہ صحیح ہے کہ سالک سلوک کے درجات امام کی نورانیت ہی کے سائے میں طے کرتا ہے اور جس درجے پر بھی ترقی کرتا ہے وہ درجہ امام علیہ السلام کے تصرف میں ہوتا ہے اور سالک کو اس درجے میں امام کی معیت نصیب ہوتی ہے۔ اسی طرح وصول کے بعد بھی امام کی معیت اور ہمراہی ضروری ہے کیونکہ عالم لاہوت کے آداب وہی سالک کو سکھلاتے ہیں اس لیے امام کی معیت ہر حال اور ہر ہر مرحلے میں سلوک کی ایک اہم ترین شرط ہے۔ اس ضمن میں بہت سے دقیق نکات ہیں جن کا بیان ممکن نہیں ہے۔ سالک کو چاہیے کہ اپنے ذوق

جامع تعلیمات اسلامی

کے وسیلے سے ان نکات کو دریافت کرے۔

محی الدین ابن عربی ایک استاد کے پاس گئے اور ان سے مظالم اور معاصی کی کثرت کی شکایت کی۔ استاد نے کہا: اپنے خدا کی طرف توجہ کرو۔ کچھ دن بعد ایک اور استاد کے پاس گئے۔ ان سے بھی معاصی اور مظالم کے پھیل جانے کی شکایت کی۔ استاد نے کہا: اپنے نفس کی طرف توجہ کرو۔ ابن عربی یہ سن کر رونے لگے اور استاد سے پوچھا کہ جواب میں اختلاف کی کیا وجہ ہے؟ استاد نے کہا: نورِ چشم! جواب تو ایک ہی ہے۔ انھوں نے تمھیں رفیق کی طرف توجہ دلائی، میں نے طریق کی طرف!

میں نے یہ قصہ اس لیے بیان کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ سیر الی اللہ اور اسماء و صفاتِ الٰہی کے مراتب میں سیر جو مقامِ امام ہے کوئی تفاوت نہیں بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت نزدیک اور درحقیقت ایک ہی ہیں۔ اس مقام پر دوئی کا وجود ہی نہیں۔ جو کچھ ہے وہ ذاتِ واحد کا نور ہے یعنی نور الٰہی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو مختلف الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کبھی اسی کو اسماء و صفاتِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کبھی حقیقتِ امام یا نورانیتِ امام کہا جاتا ہے:

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

ہمارے الفاظ مختلف ہیں مگر تیرا حسن ایک ہے۔ سب الفاظ میں اسی ایک حُسن کا بیان ہے۔ استادِ عام کی شناخت کے لیے ضروری ہے کہ معتدبہ مدت تک اس کی صحبت میں رہا جائے اور اس سے خلا ملا رکھا جائے تاکہ

جامع تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

یقینی طور پر اسکی حقیقت کا علم ہو جائے۔ اسطرح کی باتوں سے جیسے خوارق کا ظہور، غیب دانی، لوگوں کے دل کا حال معلوم کر لینا، آگ اور پانی پر چلنا، آئندہ اور گزشتہ کا حال بتلا دینا اور اسی قسم کے عجائب و غرائب سے کسی کے واصل باللہ ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ سب باتیں اس وقت حاصل ہو جاتی ہیں جب روحانی کشف ہونے لگتا ہے مگر روحانی کشف کے درجے سے وصول الی اللہ تک بے انتہا فاصلہ ہے۔ جب تک استاد میں ذاتی تجلیاتِ ربانیہ پیدا نہ ہو جائیں وہ صحیح معنی میں استاد نہیں ہو سکتا۔ محض صفاتی اور اسمائی تجلیات کافی نہیں ہیں کیونکہ ان سے وصول اور کمال ظاہر نہیں ہوتا۔

تجلّیِ صفاتی کا مطلب یہ ہے کہ سالک اپنے اندر صفاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرے اور اپنے علم یا طاقت اور زندگی کو خدا کا علم، خدا کی طاقت اور خدا کی حیات تصور کرے مثلاً کچھ سنے تو یہ محسوس کرے کہ یہ خدا نے سنا ہے اور وہ سمیع ہے اور کچھ دیکھے تو یہ محسوس کرے کہ یہ خدا نے دیکھا ہے اور وہ بصیر ہے یا علم کو خدا کے ساتھ مخصوص تصور کرے اور ہر موجود کا علم اسے خدا ہی کے علم کا پرتو بلکہ خود اس کا علم محسوس ہو۔

تجلّیِ اسمائی سے مراد یہ ہے کہ سالک اللہ کی ذاتی صفات مثلاً عالم، قائم، سمیع، بصیر، حیّ، قدیر وغیرہ کا خود اپنی ذات میں مشاہدہ کرے جیسے یہ محسوس کرے کہ علیم تو عالم میں ایک ہی ہے اور وہ خدائے متعال ہے اس لیے خدا کے مقابلے میں اپنے آپ کو علیم نہ سمجھے بلکہ یہ محسوس کرے کہ اس کا اپنا علم بھی درحقیقت خود خدا کا علم ہے یا یہ محسوس کرے کہ حیّ اور زندہ تو

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

ایک ہی ہے اور وہ خدا ہے اور وہ خود یعنی سالک اصلاً خود زندہ نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی فقط خدا کی زندگی ہے۔ اس کا وجدان یہ کہے کہ لَیْسَ الْقَدِیْرُ وَالْعَلِیْمُ وَالْحَیُّ اِلَّا ھُوَ تَعَالٰی وَتَقَدَّسَ یعنی بجز اللہ کے نہ کوئی قدیر ہے، نہ علیم ہے، نہ حیّ۔ یہ البتہ ممکن ہے کہ تجلّیِ اسمائی صرف اللہ تعالیٰ کے چند ناموں ہی کی تجلّی ہو کیونکہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اگر سالک پر دو تین ناموں کی تجلّی ہو تو باقی ناموں کی بھی تجلّی ہو۔

تجلّیِ ذاتی یہ ہے کہ خود ذاتِ باری کی سالک پر تجلّی ہو اور یہ بات اس وقت حاصل ہوتی ہے جب سالک اپنا نام و نشان بالکل بھلا دیتا ہے، اپنے آپ کو اس طرح گم کر دیتا ہے کہ عالمِ وجود میں اسے کہیں اپنا پتا نہیں ملتا۔ وہ خود کو بھی اور اپنی خودی کو بھی پورے طور پر فراموش کر دیتا ہے۔ وَلَیْسَ ھُنَاکَ اِلَّا اللّٰہُ "یہاں بجز خدا کے اور کچھ نہیں"۔ ایسے شخص کے گمراہ ہونے اور شیطان کے بہکاوے میں آنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک سالک اپنی ہستی کو بالکل مٹا نہیں دیتا، شیطان سالک کی طرف سے ناامید نہیں ہوتا لیکن جب سالک اپنی خودی اور شخصیت کو فنا کر کے عالمِ لاہوت میں قدم رکھ دیتا ہے تو وہ حرمِ خداوندی میں لباسِ حرم زیبِ تن کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتی تجلّی سے مشرف ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد شیطان اس کے ورغلانے سے ناامید ہو کر کفِ افسوس ملتا رہ جاتا ہے۔

استادِ عام کے لیے ضروری ہے کہ وہ کمال کے اس مرتبہ تک پہنچا ہوا ہو، ورنہ ہر کسی کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور نہیں دی جا سکتی۔

سالک کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ ہر دکان سے سودا خریدنے لگے

اور جو بھی کشف و شہود کا مدعی ہو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے بلکہ سالک کے لیے ضروری ہے کہ شیخ کے احوال کی پوری تحقیق کرے اور اگر تحقیق نہ کر سکے یا تحقیق دشوار ہو تو خدا پر توکل کرے اور شیخ جو کچھ بیان کرے اور ہدایت دے اس کا کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ اور سیرتِ ائمہ طاہرین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین سے مقابلہ کر کے اچھی طرح جانچے اور پرکھے۔ اگر دیکھے کہ شیخ جو کچھ کہتا ہے وہ کتاب و سنت اور سیرتِ ائمہؑ کے مطابق ہے تو اس پر عمل کرے ورنہ اجتناب کرے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا سالک خدا کے بھروسے پر کوئی قدم اٹھائے گا تو شیطان کو اس پر دسترس حاصل نہیں ہوگی۔

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۔ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهِ مُشْرِكُونَ ۔

"شیطان کا کچھ بھی قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان لائے ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کا قابو تو بس انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اسے دوست بنائے رکھتے ہیں اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے رہتے ہیں۔" (سورہ نحل۔ آیات ۹۹ - ۱۰۰)

بیست و دوم، ورد:

ورد سے مراد زبانی اوراد و اذکار ہیں جن کی مقدار اور پڑھنے کا طریقہ شیخ یا استاد کی رائے پر موقوف ہے۔ اوراد بمنزلہ کسی دوا کے ہیں جو کچھ کو موافق آتی ہے اور کچھ کو نقصان کرتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سالک ایک سے زیادہ قسم کے ورد اور ذکر از خود شروع کر دیتا ہے۔ ایک ورد اسکو

جامع تعلیمات اسلامی

کثرت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور دوسرا وحدت کی طرف۔ دونوں کے ٹکراؤ کا نتیجہ صفر ہوتا ہے اور کچھ فائدہ نہیں ہوتا، البتہ یہ ضروری ہے کہ استاد کی اجازت انھیں اوراد میں شرط ہے جن کی عام اجازت نہ دی گئی ہو۔ جن اوراد کی عام اجازت دیدی گئی ہو ان کے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ورد کی چار قسمیں ہیں: قالبی اور خفی اور پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں، اطلاقی اور حصری۔ اہلِ سلوک قالبی ورد کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے کیونکہ قالبی ورد کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے تو ورد کیا جائے لیکن معنی کی طرف کوئی توجہ نہ ہو۔ یہ صرف زبانی جمع خرچ ہوتا ہے چونکہ سالک کو معنیٰ کی تلاش ہوتی ہے اس لیے قالبی ذکر سے سالک کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

بلست وسوم، بست وچہارم اور بست وپنجم، وسوسوں کا ازالہ، ذکر، فکر:

یہ تین مرحلے مقصد کے حصول کی راہ میں نہایت اہم ہیں۔ اکثر لوگ جو راستے ہی میں رہ جاتے ہیں اور منزل مقصود تک نہیں پہنچ پاتے وہ انھیں میں سے کسی ایک مرحلے پر رک جاتے ہیں یا راستے ہی میں ہلاک ہو جاتے ہیں کیونکہ ان مراحل میں جو خطرات مضمر ہیں وہ ہیں بت پرستی، ستارہ پرستی، آتش پرستی اور کبھی کبھی زندقہ، فرعونیت، حلول اور اتحاد کا دعویٰ، مکلّف ہونے کا انکار اور ہر کام کو جائز سمجھنا وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام باتوں کے بارے میں مختصراً گفتگو کی جائے گی۔ سب سے پہلے ہم حلول و اتحاد کا مجمل طور پر تذکرہ کریں گے کیونکہ یہ بہت بڑا خطرہ ہے۔ یہ صورت ذہن کے وسوسوں سے خالی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

جامع تعلیمات اسلامی

چونکہ ابھی تک سالک نے نام ونمود کی وادی سے قدم باہر نہیں نکالا ہوتا اس لیے نعوذ باللہ یہ ممکن ہے کہ سالک اسمائی یا صفاتی تجلی کے نتیجے میں یہ خیال کرنے لگے کہ اللہ اس کی ذات یا شخصیت میں سما گیا ہے۔ یہی مطلب ہے اتحاد اور حلول کا جو کفر اور شرک ہے حالانکہ وحدانیت کا تصور تعدّد اور غیریت کے ہر تصور کی مکمل نفی کرتا ہے اور باری تعالیٰ کے وجود کے مقابلے میں ہر وجود کے تصور کو محض وہم قرار دیتا ہے اور ہر موجود کو محض سایہ اور عکس سمجھتا ہے۔ سالک جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو وہ اپنی ہستی کو بالکل مٹا دیتا ہے، فنا کر دیتا ہے اور بجز اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے کسی وجود کا ادراک اور احساس نہیں کرتا۔ وَلَیْسَ فِی الدَّارِ غَیْرُہٗ دَیَّارٌ۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

تجلّی تیری ذات کی سو بہ سو ہے
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

کہاں تو یہ تصور اور کہاں حلول و اتحاد!

وسوسوں کی نفی: اس سے مراد یہ ہے کہ سالک کو اپنے دل پر اتنا مکمل قابو ہو کہ اس کے دل میں کوئی خیال اور کوئی تصور اس کی اجازت اور ارادے کے بغیر نہ آسکے اور اس سے کوئی بات یا کام قصد و ارادے کے بغیر سرزد نہ ہو۔ اس کیفیت کا حصول بہت مشکل اور دشوار ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ وسوسوں کا ازالہ روح کی پاکیزگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جب سالک وسوسوں کی نفی کے مقام پہ پہنچتا ہے تو وہ ابتداء میں یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خطرناک خیالوں اور وسوسوں کے ہجوم میں

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

گھر گیا ہے۔ عجیب ناقابلِ یقین خیال آنے لگتے ہیں۔ بھولی بسری باتوں کا خیال یا ایسی باتوں کا خیال جن کا وقوع پذیر ہونا ناممکن ہے، ہر وقت اس کے دل و دماغ پر چھائے رہتے ہیں۔ سالک کو چاہیے کہ اس موقع پر پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہے۔ ورِ حق تکلیف وہ خیال پیدا ہو ذکر کی تلوار سے اس کا کام تمام کر دے۔ یہاں ذکر سے مراد اسمائے الٰہی ہیں۔ جب دل میں کوئی وسوسہ آئے، کسی ایک اسم الٰہی پر اپنی توجہ مرکوز کر دے اور اس وقت تک دل و جان سے اس طرف متوجہ رہے جب تک وہ وسوسہ دل سے نکل نہ جائے۔ اسمائے الٰہی کی طرف توجہ اور ان کی یاد وسوسوں کو دور کرنے کا نہایت صحیح طریقہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ "یقیناً جو لوگ متقی ہیں جب انہیں کوئی شیطانی وسوسہ لاحق ہوتا ہے تو وہ یادِ الٰہی میں لگ جاتے ہیں جس سے یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔" (سورۃ اعراف۔ آیت ۲۰۱)

لیکن جو رسالہ مرحوم بحر العلوم سے منسوب ہے وہ اس طریقہ کی اجازت نہیں دیتا۔ اس رسالہ میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ وسوسوں کو بغیر ذکر کے دور کیا جائے اور ذکر بعد میں شروع کیا جائے۔ اس رسالہ کے مطابق وسوسوں کا ذکر کی تلوار سے قلع قمع کرنا بہت خطرناک ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے پہلے ہم اس کو یہاں اجمالاً بیان کرتے ہیں۔ بعد میں اس کی تردید کریں گے۔ یہ رسالہ کہتا ہے کہ:

بہت سے مشائخ یہ سکھاتے ہیں کہ ذکر سے وسوسوں کا ازالہ کیا

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

جائے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ذکر سے مراد توجہ قلبی ہے نہ کہ ذکرِ لسانی جس کو اصطلاحاً ورد کہتے ہیں، لیکن یہ طریقت بہت خطرناک ہے کیونکہ ذکر کی حقیقت محبوب کا نظارہ اور ورد سے اس کے جمال جہاں آرا پر نظر یں جمانا ہے۔ محبوب کا دیدار اسی وقت جائز ہے جبکہ اس کے غیر سے آنکھیں بند کر لی جائیں کیونکہ محبوب غیرتمند ہے اور اس کی غیرت اس کو روا نہیں رکھتی کہ جو آنکھ اس کو دیکھ رہی ہو وہ کسی اور کو بھی دیکھے۔ جو آنکھ اس سے ہٹ کر کسی اور کو دیکھے وہ اندھی ہے۔ محبوب کے ساتھ کسی اور کو دیکھنا اس کی غیرت کے منافی ہے۔ اگر بار بار ایسا ہو کہ اسے دیکھا جائے اور پھر نظریں ہٹالی جائیں تو یہ استہزاء کی مانند ہے۔ ایسے شخص کی گدّی پر ایسا طمانچہ پڑتا ہے کہ نہ سر کا پتا چلتا ہے نہ ٹوپی کا۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۔

" جو خدا کی یاد سے آنکھیں بند کر لیتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پھر وہ مسلسل اس کے ساتھ رہتا ہے۔" (سورۂ زخرف۔ آیت ۲۶)

البتہ ایک طرح کا ذکر وسوسوں کو دُور کرنے کے لیے جائز ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ذکر کا مقصد محبوب کے جمال پر نظر نہ ہو بلکہ شیطان کو دفع کرنا مقصود ہو جیسے کہ کوئی یہ چاہے کہ غیر کو مجلس سے اٹھا دے اور اس مقصد کے لیے محبوب کو آواز دے۔ یہاں مقصد غیر کو ڈرانا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اگر وسوسوں کو دُور کرنے میں کوئی ایسا وسوسہ آجائے کہ اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جائے تو ایسے وسوسے کو دُور کرنے کے لیے ذکر میں مشغول ہو جائے۔ بہرصورت محققین اور عارفین حق آگاہ کا طریقہ

جامعہ تعلیمات اسلامی

یہ ہے کہ وہ مبتدیوں کو پہلے وسوسوں سے نجات پانے کو کہتے ہیں پھر ذکر شروع کراتے ہیں اور وسوسوں کو دُور کرنے کے لیے سالک کو حکم دیتے ہیں کہ ایک مدت تک کسی چیز جیسے کسی پتھر یا لکڑی پر نظر جمائے اور جتنی دیر ممکن ہو آنکھ نہ جھپکائے بلکہ پوری ظاہری اور باطنی طاقت سے اس کی طرف متوجہ رہے۔ بہتر یہ ہے کہ چالیس دن تک یہ عمل کرے اس دوران میں "استعاذہ" "استغفار" یا "فعّال" کا ورد رکھے اور صبح و شام نماز کے بعد خاص طور پر ذکر جاری رکھے۔ چالیس دن کے بعد کچھ مدت تک اپنے قلب کی طرف مستقل طور پر متوجہ رہے اور کوئی دوسرا خیال اپنے ذہن میں نہ آنے دے۔ اگر اس عمل کے دوران میں کوئی وسوسہ سر اٹھائے تو اسم اللہ اور کلمہ لَامَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ کا ورد کرتا رہے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رکھے جب تک ایک بے خودی کی کیفیت پیدا نہ ہو جائے۔ اس عمل کے دوران میں "استغفار" کرتا رہے اور "یَا فَعَّالُ" اور "یَا بَاسِطُ" کا بکثرت ورد کرے۔ جب سالک اس مرحلے تک پہنچ جائے تو اسے اجازت ہے کہ باقی ماندہ وسوسوں کو دُور کرنے کے لیے اگر چاہے تو ذکر قلبی کا سہارا لے تاکہ تمام وساوس کا ایک ہی مرتبہ میں مکمل خاتمہ ہو جائے کیونکہ ذکر و فکر کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد انشاء اللہ باقی ماندہ وسوسے خود ہی ختم ہو جائیں گے۔ یہ تھا خلاصہ اس مضمون کا جو بحر العلوم سے منسوب رسالے میں بیان کیا گیا ہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وسوسوں کے دور کرنے کا یہ طریقہ نقشبندی طریقے سے ماخوذ ہے۔ نقشبندی صوفیوں کی ایک جماعت ہے جو ترکی وغیرہ

جامعہ تعلیمات اسلامی

میں کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے مرشدِ اعلیٰ خواجہ بہاؤالدین نقشبند ہوتے ہیں، اسی لیے یہ لوگ نقشبندی مشہور ہو گئے۔

لیکن مرحوم آخوند ملا حسین قلی ہمدانی رضوان اللہ علیہ کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ ان کے یہاں اور ان کے شاگردوں کے یہاں وسوسے دُور کرنے کا کوئی عمل ذکر کے بغیر نہیں ہوتا۔ ان کے طریقے میں مراقبہ کے اہتمام پر البتہ بہت زور دیا جاتا ہے۔ ہم اس سے قبل مراقبہ کا اجمالی تذکرہ کر چکے ہیں۔ اب ہم اس کے مدارج کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

پہلا درجہ: مراقبہ کا پہلا درجہ یہ ہے کہ سالک محرّمات سے اجتناب کرے اور تمام واجبات کو ادا کرے۔ ان دو کاموں میں ذرا بھی غفلت یا سستی سے کام نہ لے۔

دوسرا درجہ: مراقبہ میں زیادہ شدت پیدا کرے اور کوشش کرے کہ جو کام بھی کرے وہ خالص رضائے الٰہی کے لیے ہو۔ ان سب باتوں سے جن کو لہو و لعب کہا جاتا ہے اجتناب کرے۔ اس درجے میں پورا اہتمام کرنے سے یہ حالت راسخ اور عادت ایسی پختہ ہو جائے گی کہ پھر کسی کوشش کی ضرورت نہیں رہے گی۔

تیسرا درجہ: یہ ہے کہ پروردگارِ عالم کو ہمیشہ حاضر و ناظر جانے اور یہ سمجھے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس کا یقین اور اقرار کرے کہ اللہ ہر جگہ موجود اور سب مخلوق کا نگراں ہے۔ اس مراقبہ کا ہر وقت اور ہر حال میں خیال رکھنا چاہیے۔

چوتھا درجہ: اسی کا ایک اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ خود یہ دیکھے کہ خدا حاضر و ناظر

ہے اور اجمالی طور پر جمال الٰہی کا مشاہدہ کرے۔ مراقبہ کے تیسرے اور چوتھے درجے کی طرف اشارہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نصیحت میں ہے جو آپ نے عظیم صحابی حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ کو کی تھی:

اُعْبُدُ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ "اللہ کی اسطرح عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو اسطرح عبادت کرو کہ تمہیں یقین ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کا یہ درجہ کہ خدا عبادت کرنیوالے کو دیکھ رہا ہے" اس سے کمتر ہے کہ عبادت کرنیوالا خود خدا کو دیکھ رہا ہو۔ جب سالک اس درجے پر پہنچ جائے تو کلی طور پر ذہن کو اغیار سے خالی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی عبادت ہی کے ذریعے سے وساوس کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرے۔ کسی پتھر یا لکڑی کی طرف توجہ کی تو ہماری مقدس شریعت میں ہرگز اجازت نہیں۔ غور کا مقام ہے کہ پتھر یا لکڑی کی طرف توجہ کے دوران میں اگر موت آجائے تو کیا جواب دیگا۔ ذکر کے دوران میں یا ذکر کے ہتھیار سے وساوس سے چھٹکارا پانا خود ایک عبادت اور شریعت کی نظر میں مستحسن اور پسندیدہ ہے۔ اس کا بہترین طریقہ اپنے نفس کی طرف توجہ ہے کیونکہ یہ منزل مقصود تک پہنچنے کا مختصر ترین راستہ ہے۔ نفس کی طرف توجہ کی شریعت بھی نہ صرف اجازت دیتی ہے بلکہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ "اے ایمان والو تم اپنے نفس کی فکر میں لگے رہو کسی کے گمراہ ہونے سے تمہارا کچھ نقصان نہیں بشرطیکہ تم ہدایت کی راہ

پر چل رہے ہو۔" (سورہ مائدہ۔ آیت ۱۰۵)

نفس کی طرف توجہ ہی آخوند ملا حسین قلی مرحوم کا طریقہ ہے۔ ان کے شاگردوں نے بھی ہمیشہ معرفتِ نفس ہی کا طریقہ اختیار کیا ہے جس کا لازمی نتیجہ معرفتِ رب ہے۔

معرفت کی تعلیم کا سلسلہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام تک منتہی ہوتا ہے تصوف کے جن مختلف سلسلوں نے اس حقیقت کی تعلیم کو لوگوں تک پہنچانے میں حصہ لیا ہے ان کی تعداد تو سو سے زیادہ ہے لیکن ان میں سے اصل پچیس سے زیادہ نہیں۔ یہ سب سلسلے حضرت امیر المومنین امام علی بن ابی طالب علیہ السلام تک پہنچتے ہیں۔ ان میں سے دو تین شیعوں کے ہیں باقی سنیوں کے۔ ان میں سے بعض سلسلے "معروف کرخی" کے واسطے سے حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام تک پہنچتے ہیں لیکن ہمارا طریقہ وہی آخوند مرحوم کا طریقہ ہے جو ان میں سے کسی سلسلے سے جا کر نہیں ملتا۔

سو سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ شوشتر میں آغا سید علی شوشتری نامی ایک جلیل القدر عالم اور قاضی رہتے تھے۔ دوسرے نامور علماء کی طرح انکا مشغلہ بھی تدریس اور قضاء تھا۔ لوگ بکثرت ان کے پاس فیض حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ایک دن اچانک کسی نے ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوچھنے پر کسی نے کہا دروازہ کھولیے آپ سے کچھ کام ہے۔ جب آغا سید علی نے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جولاہا کھڑا ہے۔ پوچھا کیا کام ہے؟ جولاہے نے جواب دیا کہ آپ نے جو فلاں جائیداد کے حقِ ملکیت کا فلاں شخص کے حق میں شہادت کی بنا پر فیصلہ دیا ہے وہ صحیح نہیں اور

وہ جائیداد دراصل ایک چھوٹے یتیم بچے کی ہے اور اس کا قبالہ فلاں جگہ دفن ہے۔ آپ جس راستے پر چل رہے ہیں وہ بھی صحیح نہیں۔ آیت اللہ شوشتری نے جواب میں کہا: تو کیا میرا فیصلہ غلط ہے؟ جولاہے نے جواب دیا: بات وہی ہے جو میں نے کہی ہے۔ یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا۔ آیت اللہ سوچنے لگے کہ یہ شخص کون تھا اور کیا کہتا تھا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یتیم بچے کا قبالہ وہیں مدفون ہے جہاں اس جولاہے نے کہا تھا اور جو گواہ گزرے وہ جھوٹے تھے۔ آیت اللہ ڈرے اور دل میں کہنے لگے: ہو سکتا ہے کہ میرے اور بھی بہت سے فیصلے اسی طرح غلط ہوں۔ یہ سوچ کر وہ گھبرا گئے لیکن اگلی رات کو اسی وقت پھر جولاہے نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ جس راستے پر آپ چل رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں۔ اسیطرح تیسری رات کو پھر واقعہ پیش آیا اور جولاہے نے کہا: آپ وقت ضائع نہ کریں، گھر کا تمام سامان جمع کر کے فوراً فروخت کر دیں اور نجفِ اشرف کی زیارت کے لیے روانہ ہو جائیں۔ جو کچھ میں نے بتلایا ہے اس پر عمل کریں اور چھ مہینے بعد نجفِ اشرف کی وادی السلام میں میرا انتظار کریں۔ مرحوم شوشتری فوراً نجفِ اشرف روانہ ہو گئے۔ جیسے ہی وہاں پہنچے وادی السلام میں طلوعِ آفتاب کے وقت وہ جولاہا نظر آیا۔ گویا اچانک ذہن میں سے نمودار ہو گیا ہو۔ اس نے پاس آکر کچھ ہدایات دیں اور پھر غائب ہو گیا۔ مرحوم شوشتری نے نجفِ اشرف میں داخل ہو کر جولاہے کی ہدایات پر عمل شروع کیا اور بالآخر وہ مرتبہ حاصل کر لیا۔ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔

مرحوم آغا سید علی شوشتری، شیخ مرتضٰی انصاری مرحوم کا بہت احترام

کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے فقہ اور اصول فقہ کے درس میں حاضر ہوتے تھے۔ شیخ مرتضیٰ انصاری بھی آغا سید علی مرحوم کے درس میں جو اخلاقیات پر ہوتا تھا ہفتہ میں ایک بار شریک ہوتے تھے۔ شیخ مرتضیٰ انصاری کے انتقال کے بعد آغا سید علی مرحوم ہی نے ان کے درس کی مسند سنبھالی اور جہاں سے شیخ مرتضیٰ انصاری نے درس چھوڑا تھا وہاں سے درس دینا شروع کیا لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور چھ مہینے بعد ہی آپ واصل بحق ہو گئے مگر اسی چھ ماہ کی مدت میں آغا سید علی مرحوم نے شیخ مرتضیٰ انصاری کے ایک ممتاز شاگرد آخوند ملا حسین قلی ہمدانی کی رہنمائی وادیٔ حقیقت و معرفت کی طرف کی۔ ملا حسین قلی، شیخ مرتضیٰ انصاری کی زندگی میں بھی آغا سید علی سے تعلق رکھتے تھے اور ان سے اخلاقی و عرفانی امور میں استفادہ کرتے رہتے تھے۔ اب جب شیخ مرتضیٰ انصاری کے بعد آغا سید علی نے مسندِ تدریس سنبھالی اور یہ چاہا کہ شیخ مرتضیٰ انصاری کے ان مباحث کی تکمیل کریں جن پر خود انھوں نے بھی نوٹ لکھے تھے، تو انھوں نے ملا حسین قلی کے نام بھی ایک پرچہ لکھا۔ اس میں لکھا کہ تمہارا موجودہ طریقہ ناقص ہے۔ تمہیں چاہیے کہ بلند تر مقامات پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ آخر آغا سید علی شوشتری نے آخوند ملا حسین قلی کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور میدانِ حقیقت و معرفت کی طرف انکی رہنمائی کی، چنانچہ مرحوم آخوند جو کئی سال پہلے ہی سے آغا سید علی سے معارف میں استفادہ کرتے رہے تھے، اخلاق، مجاہدۂ نفس اور معارفِ الٰہیہ میں اپنے ہمعصروں میں ممتاز اور عجائبِ روزگار میں سے ہو گئے۔ مرحوم آخوند نے بھی بڑے لائق اور قابل شاگردوں کی تربیت کی کہ ان میں سے ہر ایک آسمانِ معرفت اور توحید کا

ستارہ بن کر چمکا۔ آخوند مرحوم کے مکتب کے سربرآوردہ ترین شاگردوں میں حاجی مرزا جواد آغا ملکی تبریزی، آغا سید احمد کربلائی طہرانی، آغا سید محمد سعید حبوبی اور حاجی شیخ محمد بہاری کا نام لیا جا سکتا ہے۔

استادِ بزرگوار عارفِ بے بدل مرحوم حاجی مرزا علی آغا قاضی رضوان اللہ علیہ، مرحوم آغا سید احمد کربلائی کے شاگردوں میں سے ہیں۔ یہ ہے ہمارے اساتذہ کا سلسلہ جو مرحوم شوستری اور ان کے واسطے سے ان جولاہے تک پہنچتا ہے لیکن وہ جولاہے کون تھے، کس کے متوسلین میں سے تھے، ان کو یہ معارف و حقائق کہاں سے اور کیسے ہاتھ آئے کچھ معلوم نہیں۔

بہرحال مرحوم استاد، آغا قاضی کا طریقہ بھی آخوند ملا حسین قلی کی طرح معرفتِ نفس ہی کا طریقہ تھا اور وساوس کے خاتمہ کے لیے وہ سب سے پہلے نفس کی طرف توجہ کرنے کی ہی ہدایت کرتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ وسوسوں کو ختم کرنے کے لیے سالک کو چاہیے کہ دن رات میں کوئی وقت مقرر کرکے آدھ گھنٹہ یا کچھ زیادہ اپنے نفس کی طرف توجہ کرے۔ اس توجہ سے رفتہ رفتہ قلب میں طاقت آتی جائے گی اور وسوسے دور ہوجائیں گے۔ ساتھ ہی معرفتِ نفس بھی رفتہ رفتہ حاصل ہوجائے گی اور انشاء اللہ سالک منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اکثر لوگ جو اپنے ذہن کو وسوسوں سے پاک و صاف کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور بالآخر ان پر سلطانِ معرفت کی تجلّی ہوئی ہے، ان کو دو میں سے ایک صورت سے کامیابی ہوئی ہے: یا تو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے ان کا ذہن تلاوت کرنے والے کی طرف گیا اور اس وقت ان پر منکشف ہوا کہ قرآن کا پڑھنے والا تو دراصل خدا ہے یا

ابو عبداللہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے توسل سے پردے اٹھتے چلے گئے کیونکہ آپ کو حجاب دور کرنے اور سالک کی راہ سے موانع دور کرنے کی طرف خاص توجہ ہے۔

سلطانِ معرفت کی تجلی میں دو باتوں کو بڑا دخل ہے۔ ایک تو مراقبہ کے تمام مدارج کا طے کرنا اور دوسرے نفس کی طرف توجہ۔ اگر سالک ان دو باتوں کا اہتمام کرے تو آہستہ آہستہ اس کو محسوس ہوگا کہ یہ تمام کائنات اپنے تنوع کے باوجود ایک ہی چشمہ سے سیراب ہو رہی ہے اور عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کا منبع ایک ہی ہے۔ موجودات میں سے جس کسی میں بھی جس قدر کمال، حسن، خوبی اور نور ہے وہ اسی ایک چشمۂ فیض کا عطیہ ہے۔ ہر ایک کو اس کے ظرف کے مطابق نورِ وجود اور جمال و عظمت سے حصہ ملا ہے۔ بہ الفاظ دیگر فیاضِ مطلق کا فیض تو عام ہے مگر ہر موجود اپنے ظرف اور قابلیت کے مطابق جو اس کی ماہیت میں داخل ہے، اس فیض کا اکتساب کرتا ہے۔

بہرحال سالک اگر مکمل مراقبہ کا پورا اہتمام رکھے اور نفس کی طرف توجہ کرے تو اس پر بتدریج چار عالم منکشف ہوں گے۔

عالم اول۔ توحیدِ افعال: شروع میں تو وہ یہ محسوس کریگا کہ جو کچھ آنکھ دیکھتی ہے، زبان کہتی ہے، کان سنتا ہے، ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کام کرتے ہیں۔ سب کا منبع و منشا خود اس کا نفس ہے اور یہ نفس جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کو یہ محسوس ہوگا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کا منبع و منشا بھی خود اس کی اپنی ذات ہے اور خارج میں تمام

جامعہ تعلیمات اسلامی

افعال کا تعلق اس کے اپنے نفس سے ہے۔ اس کے بعد اگلے مرحلے میں وہ یہ دیکھے گا کہ اس کا وجود ذاتِ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے اور فیوض و رحمت ہائے ربانی اسی کے واسطے سے مخلوق تک پہنچ رہے ہیں اس لیے جہان میں تمام افعال کا منبع و مخرج دراصل خدا ہی کی ذاتِ اقدس ہے۔

عالم دوم۔ توحیدِ صفات: اس کا ظہور عالمِ اول کے بعد ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک جو کچھ سنتا یا دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے کہ درحقیقت سننا اور دیکھنا خدا ہی کی طرف سے ہے۔ بعد میں ہر طرح کے علم، قدرت، حیات اور سمع و بصر جس کا خارجی موجودات میں مشاہدہ کرتا ہے، اس کا سرچشمہ خداتعالیٰ ہی کو پاتا ہے۔

عالمِ سوم۔ توحیدِ اسماء: اس کا ظہور عالمِ دوم کے بعد ہوتا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ سالک صفات کو ذات سے وابستہ محسوس کرتا ہے مثلاً وہ دیکھتا ہے کہ عالم و قادر و حیّ خداوندمتعال ہے تو وہ اپنے عالم ہونے کو بھی خدا ہی کا عالم ہونا محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے قادر اور سمیع و بصیر ہونے کو فقط خدا کا ہی قادر اور سمیع ہونا سمجھتا ہے۔ وہ اصولی طور پہ سمجھتا ہے کہ تمام جہانوں میں عالم، قادر، سمیع، بصیر اور حیّ فقط ایک ہی ہے۔ موجوداتِ عالم میں سے ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق اسی کے علم، قدرت، سماعت، بصارت اور حیات کا ایک عکس پیش کرتا ہے اور اس کے عالم، قادر، سمیع، بصیر اور حیّ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔

عالمِ چہارم۔ توحیدِ ذات: یہ عالم تیسرے عالم سے بلند تر ہے۔ یہ سالک پر تجلیِّ ذاتی کے ذریعے سے منکشف ہوتا ہے یعنی سالک یہ محسوس کرتا

جامعہ تعلیمات اسلامی

ہے کہ وہ ذات جو تمام افعال وصفات کا سرچشمہ ہے، ذاتِ واحد ہے اور تمام افعال وصفات کا وجود اسی سے ہے۔ اس موقع پر سالک کی توجہ اسم اور صفت کی طرف نہیں ہوتی۔ وہ فقط ذات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ بات صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب سالک اپنے عاریتی وجود کو خدا حافظ کہہ کر اپنے آپ کو اور اپنی ہستی کو بالکل فنا کر دیتا ہے اور حق تعالیٰ کی ذاتِ اقدس میں گم ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس پر تجلّی ذاتی ہوگی۔ اس مرحلہ کو مقامِ ذات، حقیقتِ ذات یا احدیت کا نام دینا بھی دشوار اور حقیقت سے بعید ہے کیونکہ جو کچھ بھی زبان سے ادا کیا جاتا ہے یا تحریر میں آتا ہے وہ محض نام ہے اور ذاتِ اقدسِ الٰہی اس سے بالاتر ہے۔ اسے نہ کوئی نام دیا جا سکتا ہے اور نہ اس کا کوئی مقام تصور کیا جا سکتا ہے بلکہ حق تعالیٰ تو اس نہ دیے جا سکنے اور نہ کیے جا سکنے سے بھی بالاتر ہے کیونکہ یہ منفی عبارت بھی ایک طرح سے یہ ظاہر کرتی ہے کہ ذاتِ باری کی بھی کچھ حدود ہیں حالانکہ حق تعالیٰ ہر حد سے بالاتر ہے۔ جب سالک اس مقام پہ پہنچے گا تو وہ اپنا نام ونشان مٹا چکا ہوگا۔ وہ نہ خود کو پہچانے گا اور نہ کسی اور کو۔ وہ سوائے خدا کے کسی کو نہیں پہچانے گا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ فقط اپنے خدا کو پہچانے گا اور بس۔

سالک مذکورہ بالا چاروں عالموں میں سے ہر ایک میں اپنے وجود کا کچھ حصہ فنا کر دیتا ہے اور بالآخر اپنے وجود اور ہستی کو سرے سے مٹا ہی دیتا ہے۔

جامع تعلیمات اسلامی

عالمِ اول میں سالک افعال میں فنا کا درجہ حاصل کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی فعل اس سے صادر نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ہے خدا کی طرف سے ہے۔ اس طرح وہ اپنے افعال کے آثار کو مٹا دیتا ہے۔

عالمِ دوم میں تجلیِ صفاتی کے باعث سالک یہ محسوس کرتا ہے کہ علم، قدرت اور باقی سب صفات حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس طرح وہ اپنی صفات کے تمام آثار کو مٹا دیتا ہے۔

عالمِ سوم میں تجلّیِ اسمائی ہوتی ہے اور سالک یہ محسوس کرتا ہے کہ عالم اور قادر وغیرہ فقط اللہ جلّ جلالہٗ ہی ہے۔ اس طرح سالک اپنے ناموں کو بھی مٹا دیتا ہے اور ان کا کوئی نشان اپنے اندر نہیں پاتا۔

عالمِ چہارم میں جہاں تجلّیِ ذاتی ہوتی ہے سالک اپنے وجود کو گم کر دیتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وجودِ باری کے سوا کوئی وجود نہیں۔

شہود کے اس مرحلہ میں تجلیِ ذاتی کو عارفین عنقاء اور سیمرغ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ یہ وہ موجود ہے جس کا کوئی شکار نہیں کر سکتا۔ سیمرغ سے مراد وہ ذاتِ بحت اور وجودِ محض ہے کہ جس کو "کنزِ مخفی"، "غیب الغیوب" اور "ذاتِ مَا لَا اِسْمَ لَہٗ وَلَا رَسْمَ لَہٗ" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

(جا کسی اور پرندے کو جال میں لے کہ عنقا کا آشیانہ بہت اونچا ہے)۔

حافظ شیرازی علیہ الرحمہ نے اپنی مثنویوں میں اس مضمون کو بڑے لطیف پیرائے اور دلکش استعاروں کی زبان میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

پیرِ دانا نے مجھے یہ قصہ سنایا تھا جس کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ ایکدن کوئی رہرو کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک رند بیٹھا ہوا ملا۔ اس رند نے کہا کہ اے سالک تیرے تھیلے میں کیا ہے؟ اگر تیرے پاس دانہ ہو تو، تو آکر جال لگا۔ سالک نے جواب دیا کہ ہاں میرے پاس جال تو موجود ہے مگر میں سیمرغ کا شکار کرنا چاہتا ہوں۔ رند نے کہا یہ تو جب ممکن ہے کہ تو یہ معلوم کرے کہ وہ ہے کہاں۔ اس کے توآشیانے کا بھی پتا نشان معلوم نہیں۔ سالک نے کہا گو یہ کام ناممکن ہے مگر ناامیدی بھی تو مصیبت ہے۔ مسلمانو! غور کرو کہ اس دوست نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ ممکن ہے کہ خضرِ مبارک قدم اس تنہا کو اس تنہا تک پہنچا دیں۔

واضح رہے کہ سیمرغ کے آشیانے کا جب نشان ہی نہیں تو اس کا شکار کہاں ممکن ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اسکا لطف و کرم یاوری کرے اور وہ گم گشتگانِ وادیٔ محبت اور اپنے جمالِ لم یزل ولایزال کے عاشقوں کی عالمِ توحید و فناء تک رہبری کرے۔

بحقِ پیشوا زانِ وادیٔ محبت و لوادارانِ حمد و معرفت: محمد مصطفیٰ و علی مرتضیٰ و یازدہ فرزند امجدش از نسلِ بتول عذراء فاطمہ زہرا علیھم سلام اللہ الملک المتعال وفق اللّٰھم جمیع المحبین و ایانا لکل ما یرضیک والحقنا بالصٰلحین وله الحمد فی الاولیٰ والاٰخرۃ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

وضاحت: اس رسالے میں جو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں ضروری نہیں کہ ان کے وہی معنی مراد ہوں جو عرف یا لغت میں مراد لیے جاتے ہیں کیونکہ عرفاء اصطلاحی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لہٰذا اس سلسلے میں اس شخص سے رجوع کرنا چاہیے جو علم عرفان میں دسترس رکھتا ہو۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

تفسیرِ سُورۂ الحمد

آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی

تفسیر کے معنی ہیں قرآن پر سے پردہ اٹھانا

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں سورۃ حمد کی تفسیر کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ہم جیسے لوگ عہدہ برآ ہو سکیں۔ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں درجۂ اول کے علماء نے جن میں اہل سنت بھی ہیں اور اہل تشیع بھی، اس موضوع پر بکثرت کتابیں لکھی ہیں لیکن ہر شخص نے اس علم کے لحاظ سے جس میں اسے مہارت تھی قرآن کریم کے صرف ایک پہلو کی تفسیر کی ہے اور معلوم نہیں کہ وہ پہلو بھی مکمل ہے یا نہیں مثلاً گزشتہ چودہ صدیوں میں عرفاء نے جو تفاسیر لکھی ہیں ــــ جیسے محی الدین ابن عربی، عبدالرزاق کاشانی یا

جامعہ تعلیمات اسلامی

ملّا سلطان علی ـــ ان سب نے عارفانہ انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے بہت عمدہ تفاسیر لکھی ہیں اور جس فن میں انھیں تخصص حاصل تھا اس پر بھی خوب لکھا ہے مگر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ قرآن نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے قرآن کے ایک حصہ پر سے پردہ اٹھایا ہے یا اس کے کچھ پہلو بیان کیے ہیں۔ ایسے ہی طنطاوی جوہری اور سید قطب وغیرہ ہیں۔ انھوں نے ایک جداگانہ طرز پر تفسیر کی ہے لیکن وہ بھی ہر معنی میں قرآن کی تفسیر نہیں ہے۔ بہت سے دوسرے مفسرین ہیں جن کا تعلق ان دونوں گروہوں سے نہیں ہے جیسے شیخ طبرسی جنکی مجمع البیان بہت عمدہ اور بلند پایہ تفسیر ہے۔ یہ تفسیر اہل سنت اور اہل تشیع کے اقوال کی جامع ہے۔ بہت سی دوسری تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں مگر ان سب کا یہی حال ہے۔ قرآن مجید کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کی ہم یا کوئی اور ایسی جامع تفسیر کر سکے جو تمام قرآنی علوم پر واقعی حاوی ہو کیونکہ کچھ ایسے علوم بھی ہیں جو ہماری سمجھ سے ماوراء ہیں۔ ہم تو کتاب اللہ کی صرف ایک شکل یا اس کا ایک پہلو سمجھ سکتے ہیں۔ باقی کے لیے ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی تفسیر کی ضرورت ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے اصل معلم تھے۔

کچھ دن سے ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو قطعاً تفسیر کے اہل نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنے مخصوص مقاصد کو قرآن وسنت سے منسوب کرنا چاہتے ہیں تعجب تو یہ ہے کہ بائیں بازو کا ایک گروہ اور کچھ کمیونسٹ بھی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ قرآن سے علاقہ رکھتے ہیں لیکن وہ اپنے خاص مقاصد کے تحت ایسا ظاہر کرتے ہیں۔ تفسیر سے کیا، ان کا تو قرآن سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ لوگ اپنی

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

بات جوانوں کے گلے سے یہ کہکر اتارنا چاہتے ہیں کہ یہی اسلام ہے۔

اسی بنا پر میں عرض کرونگا کہ جن لوگوں کو کافی علمی دستگاہ نہیں ہے اور جن نوجوانوں کو نہ اسلامی مسائل کا ادراک ہے اور نہ اسلام سے واقفیت ہے انھیں کوئی حق نہیں کہ وہ قرآن کی تفسیر میں دخل دیں اور اگر وہ اپنی کسی غرض کی بنا پر ایسا کرتے ہیں تو ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ ان کی تفسیر کی طرف کوئی توجہ نہ کریں۔ اسلام میں تفسیر بالرائے ممنوع ہے۔ جو شخص اپنی رائے کو قرآن کے سر منڈھنا چاہتا ہے، وہ یا تو مادہ پرست ہے جو اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر اور تاویل کرتا ہے یا پھر ان لوگوں میں سے ہے جو قرآن کے کچھ روحانی معنی بیان کرتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ بھی اپنی رائے کے مطابق قرآن کی تاویل کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم ہر لحاظ سے ان دونوں قسم کے لوگوں سے دوری اختیار کریں۔ قرآن کے بارے میں ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اس کی جو بھی رائے ہو اُسے قرآن سے منسوب کردے اور کہہ دے کہ یہی قرآن ہے یا قرآن یہی کہتا ہے۔

میں جو تفسیر بیان کر رہا ہوں وہ محض احتمالی ہے۔ چنانچہ اگر میں قرآن کریم کی بعض آیات کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں تو میں یہ نہیں کہونگا کہ ان آیات کا یہی مطلب ہے جو میں نے مراد لیا ہے یعنی میں احتمال کے طور پہ بات کروں گا نہ کہ حزم ویقین کے طور پہ لہٰذا میں یہ نہیں کہونگا کہ ان آیات کا مطلب یہی ہے اور کوئی مطلب نہیں ہے۔

چونکہ بعض حضرات نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ تفسیر سے متعلق کچھ

جامعہ تعلیمات اسلامی

گفتگو ہو جائے اس لیے میں نے یہ طے کیا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن سورۂ مبارک حمد کے متعلق کچھ مختصر سی گفتگو کروں میں ایک بار پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ یہ تفسیر قطعی نہیں ہے اور نہ اس کا مقصد تفسیر بالرائے ہے۔ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہ بطور ایک احتمال کے ہے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ؕ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔

یہ ممکن ہے کہ قرآن کریم کی تمام سورتوں کے شروع میں جو بسم اللہ ہے اس کا تعلق ان آیات سے ہو جو اس کے بعد آتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس بسم اللہ کا تعلق مثلاً ایک معنی مقدّر (فعل محذوف) سے ہے لیکن غالب خیال یہ ہے کہ ان بسم اللّٰہوں کا تعلق ان کے بعد آنے والی سورتوں سے مثلاً سورۃ الحمد میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ؕ کا تعلق اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے ہے یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام کے ساتھ کہ سب تعریف اسی کے لیے ہے۔ نام کیا چیز ہے؟ یہ کسی کو پہچاننے کے لیے

ایک علامت ہے۔ جب انسان کسی شخص یا چیز کا کوئی نام رکھتا ہے تو وہ اس کی پہچان کے لیے علامت کے طور پر کام آتا ہے۔ اگر کسی کا نام زید ہے تو وہ اس لیے ہے کہ لوگ سمجھ جائیں کہ زید کون ہے۔

اللہ کے نام اسکی ذات کی علامت ہیں

اللہ تعالیٰ کے نام بھی اس کی ذاتِ مقدس کی علامت ہیں۔ انسان جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کا کچھ ناقص علم حاصل کر سکتا ہے وہ اس کے اسمائے حسنیٰ ہی کے ذریعے سے حاصل کر سکتا ہے ورنہ اس کی ذاتِ مقدس تک تو انسان کی رسائی ممکن ہی نہیں یہاں تک کہ خود خاتم النبیینؐ کی بھی وہاں تک رسائی نہیں ہے حالانکہ آپ اعلم البشر اور اشرف البشر ہیں۔ اس کی ذات کا مرتبہ سوائے اس کی ذاتِ پاک کے کوئی نہیں پہچانتا۔ انسان صرف اسمائے الٰہی تک ہی رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

اسمائے الٰہی کے بھی مراتب ہیں بعض مراتب ہم سمجھ سکتے ہیں۔ بعض مراتب کا ادراک صرف اولیاءُ اللہ، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان حضرات سے مخصوص ہے جو آپکی دی ہوئی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔

سارا عالم اللہ کا نام ہے

سارا جہان اللہ کا نام ہے کیونکہ نام علامت اور نشانی ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ سب موجوداتِ عالم حق تعالیٰ کی ذاتِ مقدس کی نشانی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس بات کی گہرائی

جامعہ تعلیمات اسلامی

تک پہنچ جاتے ہیں کہ موجودات کس طرح نشانی ہیں جبکہ دوسرے لوگ اس بات کو صرف مجمل طور پہ سمجھ سکتے ہیں یعنی وہ اتنا جانتے ہیں کہ کوئی موجود خود بخود وجود میں نہیں آسکتا۔

کوئی ممکن خود بخود وجود میں نہیں آتا

یہ ایک واضح عقلی مسئلہ ہے۔ ہر انسان کی عقل فطری طور پہ یہ جانتی ہے کہ جو موجود ایسا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ نہ ہو تو بھی ممکن ہے کہ اس کا وجود ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا وجود نہ ہو' لہٰذا ایسا ممکن الوجود یونہی خود بخود وجود میں نہیں آتا۔ ممکن کے لیے ضروری ہے کہ اس کے وجود کا سلسلہ ایک ایسے موجود تک پہنچے جو موجود بالذات ہو یعنی اس کا وجود اس سے سلب نہ ہو سکے۔ یہ موجود ازلی ہوگا اور اس کا وجود قابل سلب نہیں ہوگا۔ دوسری موجودات جو ایسی ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ موجود ہوں اور ہو سکتا ہے کہ موجود نہ ہوں' اس بات کی محتاج ہیں کہ باہر سے کوئی ان کو وجود میں لائے۔ اگر ہم فرض کریں کہ یہ بالائی خلا ـــــ جو محض خیالی ہے اور جب کچھ نہیں ہے تو خیالی ہی ہے اور واقع میں اس کا کوئی وجود نہیں ـــــ ہمیشہ سے ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ خلا' جو محض خلا ہے' خود بخود کسی موجود شے میں بدل جائے یا کوئی شے ایسے ہی اس میں پیدا ہو جائے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ابتدا میں دنیا ایک لامتناہی خلا تھا (لامتناہی ہوتے ہیں جو اشکال ہے وہ اپنی جگہ ہے) اور بعد میں اس کے اندر ایک طرح کی ہوا یا بھاپ پیدا ہوئی اور اسی بھاپ سے دنیا کی ہر چیز پیدا ہو گئی تو یہ بات بالکل خلافِ عقل ہے کہ کوئی چیز بغیر کسی خارجی سبب یا

علت کے از خود کسی دوسری چیز میں بدل جائے۔ جو چیز کسی دوسری چیز میں بدلتی ہے اس کے لیے کوئی خارجی علت ضرور موجود ہوتی ہے ورنہ کوئی شے خود بخود کچھ اور نہیں بن جاتی مثلاً برف جمتی ہے تو اس کے لیے کوئی خارجی علت ضروری ہے جس کی وجہ سے پانی برف بن کر جم جائے یا پانی اُبلتا ہے تو اسکے لیے بھی کوئی خارجی علت ضروری ہے۔ اگر پانی کا درجہ حرارت نہ صفر سے نیچے ہو اور نہ صفر سے اوپر تو ابد تک پانی ہی رہے گا۔ اس میں تبدیلی کے لیے کوئی خارجی علت ضروری ہے۔ یہ اجمالی بیان ہوا اس کا کہ ہر معلول کے لیے ایک علت ضروری ہے اور ہر ممکن کسی علت کا محتاج ہے۔

جو شخص ذرا غور و فکر سے کام لے گا وہ یہ مان لے گا کہ جو چیز ایسی ہے کہ وہ ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی وہ (چیز) نہ خود بخود ہوتی ہے اور نہ خود بخود نہیں ہوتی۔ "نہ ہونا" کوئی چیز نہیں ہے کہ اس کے لیے بھی کسی علت کی ضرورت ہو۔ نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز علت کے بغیر کسی دوسری چیز میں بدل جائے اور نہ کوئی چیز بغیر علت کے وجود میں آسکتی ہے۔ یہ سب باتیں بدیہیات میں سے ہیں۔

موجودات، اللہ کی نشانی ہیں

اتنی بات تو اجمالی طور پر سب کی عقل میں آسکتی ہے کہ سب موجودات عالم، اللہ کا نام اور اللہ کی نشانی ہیں اور پورا جہان ہی اسمائے الٰہی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہاں کچھ نام رکھنے کا سوال نہیں ہے۔ یہ ایسی بات نہیں کہ جیسے فرض کیجیے کہ ہم کسی کو چراغ سمجھانا چاہتے ہیں تو اس کا نام لے دیتے

جامع تعلیمات اسلامی

ہیں چراغ یا ایسے ہی موٹر یا انسان یا زید۔ یہ بات ایک ایسی ذات کے متعلق نہیں کہی جا سکتی جو اپنے تمام اوصافِ کمال میں لامتناہی اور غیر محدود ہے۔

جو موجود محدود ہو وہ ممکن الوجود ہوتا ہے

اگر موجود محدود ہو تو وہ ممکن ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی موجودیت کی کوئی حد نہیں اس لیے اسے عقلاً تمام کمالات سے متصف ہونا چاہیے کیونکہ اگر ایک بھی کمال کم ہو تو وہ محدود ہو جائیگا اور محدود ہوا تو ممکن ہو گیا۔ ممکن اور واجب میں یہی فرق ہے کہ واجب ہر لحاظ سے لامتناہی اور موجودِ مطلق ہوتا ہے۔ باقی چیزیں متناہی اور محدود ہیں۔ اگر واجب میں تمام اوصاف لامتناہی اور غیر محدود نہ ہوں تو واجب پھر واجب نہیں رہے گا ممکن ہو جائیگا۔ واجب ایسا موجود ہے جو ایجاد اور وجود کا سرچشمہ ہے۔ وہ سب موجودات جو اس سرچشمہ سے وجود میں آئینگی، وہ بھی ان تمام صفات کی جامع ہونگی جو واجب میں پائی جاتی ہیں لیکن کچھ کمی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان موجودات کے بھی مختلف درجے ہیں۔ اعلیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ موجود میں جہاں تک ممکن ہے حق تعالیٰ کی سب صفات پائی جائیں اس حد تک کہ گویا وہ موجود بھی واجب ہے۔ ایسے ہی موجود کو اسم اعظم کہتے ہیں۔

اسم اعظم کیا ہے

اسم اعظم وہ نام اور وہ علامت ہے جس میں ایک طرح سے حق تعالےٰ

جامع تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیماتِ اسلامی

کے سب کمالات پائے جائیں گو ناقص طور پر یعنی اس حد تک جس حد تک ایسا ہونا ممکن ہے۔ دوسری موجودات کے مقابلے میں اس میں سب کمالاتِ الٰہی کامل طور پر ہوتے ہیں۔ دوسری موجودات میں بھی جو اسمِ اعظم کے بعد آتی ہیں کمالات پائے جاتے ہیں لیکن صرف ان کی حیثیت اور ظرف کے مطابق یہاں تک کہ وہ مادی موجودات آجاتی ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ ہر کمال سے خالی ہیں۔ ان میں نہ علم ہے اور نہ قدرت لیکن ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی علم و ادراک سے خالی نہیں ہیں۔

سب موجودات تسبیح کرتی ہیں

چونکہ ہم حجاب میں ہیں اس لیے ہم اس کا ادراک نہیں کر سکتے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان موجودات میں بھی جو انسان اور حیوان سے کمتر اور ناقص ہیں سارے کمالات کا عکس پایا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان میں یہ کمالات ان کے وجود کے ظرف کے مطابق ہوتے ہیں یہاں تک کہ ادنیٰ ترین مخلوقات میں بھی انسان کی طرح ادراک کی صفت موجود ہے۔ قرآن پاک میں ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم انکی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ (سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۴۴)

چونکہ ہم حجاب میں ہیں اور موجودات کی تسبیح کو نہیں سمجھتے اس لیے قدیم علماء کو یہ معلوم نہیں تھا کہ موجوداتِ ناقص میں بھی ادراک ہو سکتا ہے چنانچہ انھوں نے اس تسبیح کو تکوینی تسبیح پر محمول کیا حالانکہ اس آیت کا

جامعہ تعلیماتِ اسلامی

تکوینی تسبیح سے کوئی تعلق نہیں۔ تکوینی تسبیح کے متعلق ہمیں معلوم ہے مگر یہاں تکوینی تسبیح کا ذکر نہیں ہے۔ بہر حال بات یہ ہے کہ سب موجودات تسبیح کرتی ہیں مثلاً اس کنکری کی تسبیح کے قصہ میں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک میں تھی لوگوں نے اس کی تسبیح سنی تھی اور انھیں معلوم بھی ہوا تھا کہ وہ تسبیح کیا تھی۔ وہ ایسی تسبیح تھی جس سے ہمارے تمہارے کان نا آشنا ہیں۔ یہ تسبیح ایک بولی ہے لیکن ہماری بولی نہیں بلکہ ان کی اپنی بولی ہے۔ ان میں بھی ادراک ہے البتہ یہ کہ ان کا ادراک ان کے اپنے ظرفِ وجودی کے مطابق ہے۔ اونچے درجے کی مخلوق جو اپنے آپ کو ہر قسم کے ادراک کا سرچشمہ سمجھتی ہے اس کا خیال ہے کہ دوسری موجودات ادراک سے عاری ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ادراک کا یہ درجہ جو اسے حاصل ہے دوسری موجودات کو حاصل نہیں ہے۔ چونکہ ہم حجاب میں ہیں اس لیے ہمیں ان کے ادراک اور تسبیح کا علم نہیں اور چونکہ ہمیں علم نہیں اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ بات ہی کچھ نہیں۔

ایسی بہت سی چیزیں ہیں جنکا ہمیں علم نہیں

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ان کا وجود نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا وجود ہے اگرچہ ہم ان سے ناواقف ہیں۔ آج بھی نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں مثلاً سب کا خیال تھا کہ نباتات بے جان ہیں لیکن اب کہا جا رہا ہے کہ ان میں سماعت کا نظام ہے اور اگر گرم پانی میں درخت کے ریشوں کو رکھ کر آواز گزاری جائے تو ردعمل

جامع تعلیمات اسلامی

ہوتا ہے اور جوابی آوازیں آتی ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ لیکن یہ تو صحیح ہے کہ یہ دنیا طرح طرح کی آوازوں سے بھری ہوئی ہے۔ سارا عالم زندہ ہے اور اللہ کا نام ہے۔ سب اللہ کا نام ہیں۔ ہر چیز اللہ کا نام ہے۔ آپ خود اسمائے الٰہی ہیں۔ آپ کی زبان بھی اسمائے الٰہی میں سے ہے۔ آپ کے ہاتھ بھی اسمائے الٰہی ہیں۔

تمام حرکات اسمائے الٰہی ہیں

(بِسْمِ اللّٰہِ ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ) آپ خدا کی جو حمد کرتے ہیں وہ بھی اسم الٰہی ہے۔ آپ جو بھی حرکت کرتے ہیں، وہ بھی اسم الٰہی ہے۔ گھر سے پاؤں دھو کر آپ مسجد جاتے ہیں تو اللہ کے نام کے ساتھ جاتے ہیں۔ آپ اللہ کے نام کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتے کیونکہ آپ خود اسم اللہ ہیں۔ آپ کے دل کی دھڑکن بھی اسم اللہ ہے۔ آپ کی نبض کی جنبش بھی اسم اللہ ہے۔ یہ ہوائیں جو چلتی ہیں سب اللہ کا نام ہیں۔ اس آیتِ مبارکہ میں شاید یہی معنی مراد ہوں۔ اس کے علاوہ بھی متعدد آیات میں آیا ہے کہ اللہ کے نام کے ساتھ فلاں بات ـــــ بات اللہ کے نام کی ہے اور ہر چیز اللہ کا نام ہے یعنی حق ہے اور اسم الٰہی ہے۔ سب کچھ وہی ہے۔ اسم فنا فی المسمّٰی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا بھی کوئی مستقل وجود ہے، ہم بھی کوئی چیز ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اگر وہ ذات جس نے اپنے ارادے اور اپنی تجلّی کی شعاعوں سے سب موجودات کو وجود بخشا ہے ایک آن، ایک پل کے لیے

جامع تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

بھی اپنی تجلی اٹھالے تو سب موجودات نیست ونابود ہو جائیں۔ اپنی حالتِ وجودی سے خارج ہو کر اپنی سابقہ حالت پر لوٹ جائیں کیونکہ ان کے وجود کی بقا کا دارو مدار بھی اسی تجلی پر ہے۔ حق تعالےٰ نے اپنی تجلیؔ سے سارے عالم کو پیدا کیا ہے اور یہی تجلی اور نورِ وجود کی اصلی حقیقت ہے، اسم اللہ ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اللہ یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ ہر چیز میں اس کا نور ہے۔ ہر چیز کا ظہور اس کے نور سے ہے۔ یہ ظہور خود نور ہے۔ انسان کا ظہور بھی نور ہے اس لیے انسان بھی نور ہے۔ اسی طرح حیوانات بھی نور ہیں۔ سب مخلوقات نور ہیں۔ سب اللہ کا نور ہیں۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ یعنی آسمانوں اور زمین کا وجود جو ایک نور ہے، اللہ کی طرف سے ہے

یہ نور اس طرح فنا فی اللہ ہے کہ یہ کہا ہے کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ یہ نہیں کہا کہ بِاللّٰهِ یَتَنَوَّرُ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔ آسمان اور زمین اللہ کے نور سے منور ہیں۔ بات یہ ہے کہ آسمان و زمین سب ہیچ ہیں۔ ہماری دنیا میں کوئی ایسا موجود نہیں جس کا کسی طرح سے مستقل وجود ہو۔ مستقل وجود کے معنی یہ ہیں کہ وہ حدِ امکان سے خارج ہو کر وجوب کے درجے تک پہنچ جائے حالانکہ اصل میں حق تعالیٰ کے سوا کسی موجود کا وجود نہیں، اس لیے فرمایا ہے بِسْمِ اللّٰهِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، بِسْمِ اللّٰهِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ شاید یہاں مراد یہ نہیں ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہو بلکہ ایک واقعہ کا بیان ہے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے نام سے کہو سے مراد یہ ہے کہ تمہارا یہ

جامعہ تعلیمات اسلامی

کہنا بھی اللہ کا نام ہے۔ ارشاد ہوا ہے یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یعنی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نہیں کہا جس کا مطلب ہوتا کہ ہر شخص تسبیح کرتا ہے۔

آسمان وزمین میں جو کچھ ہے، وہ سب اللہ کے نام سے تسبیح کرتی ہیں کیونکہ سب اسی کا جلوہ ہیں۔ سب موجودات کا وجود اسی کے جلوے سے ہے۔ جو حرکت بھی ہوتی ہے اسی جلوے سے ہوتی ہے۔

دنیا کی تمام چیزیں اسی کا جلوہ ہیں

دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے جلوے سے ہوتا ہے۔ سب کام اور سب چیزیں اسی کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف لوٹتی ہیں کسی مخلوق کے پاس اپنی خود کی کوئی چیز نہیں۔ خود کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی کھڑا ہو کر یہ کہتا ہے کہ: میرے خود کے پاس کوئی چیز ہے تو اس کے معنی سرچشمۂ نور کے ساتھ مقابلے کے ہیں۔ میرے اپنے پاس بھی کچھ ہے" اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ میری ہستی میری اپنی ہے حالانکہ جب تمہارا وجود تمہارے اپنے پاس ہے جب بھی تمہارا نہیں۔ یہ آنکھ جو تمہارے پاس ہے یہ بھی تمہاری نہیں۔ یہ آنکھ اسی کے جلوے سے وجود میں آئی ہے۔ یہ حمد وثنا جو ہم کرتے ہیں یا اور لوگ کرتے ہیں، یہ سب اسم الٰہی سے ہے یا اسم الٰہی کی وجہ سے ہے۔ اسی لیے فرمایا: بِسْمِ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔

اللہ، جامع جلوہ ہے

لفظ "اللہ" حق تعالیٰ کا ایسا جامع جلوہ ہے جس میں سب جلوے شامل

جامع تعلیمات اسلامی

ہیں۔ رحمان و رحیم اسی جلوے کے جلوے ہیں۔

رحمان نے اپنی رحمت و رحمانیت سے تمام موجودات کو وجود بخشا ہے۔ یہ رحمت ہے۔ وجود خود رحمت ہے حتیٰ کہ وہ وجود بھی سراپا رحمت ہے جو موذی موجودات کو عطا کیا گیا ہے۔ اسی کی وسیع رحمت تمام موجودات پر سایہ فگن ہے یعنی سب مخلوقات عین رحمت ہیں۔ اللہ کے نام سے ہی وہ جلوہ ہے جو ہر معنی میں جلوہ ہے۔

اللہ ایک مقام ہے جس سے پورے معنی میں جلوے کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ ایک جامع نام ہے۔ ایک ایسا نام ہے جو خود جلوہ ہے ورنہ حق تعالیٰ کی ذات ہی اس کا نام ہے۔ لَا اِسْمَ لَهٗ وَلَا وِسْمَ۔ اس کی ذات سے الگ اس کا نہ کوئی نام ہے نہ نشان۔ اس کے نام اللہ، رحمان، رحیم سب اس کے جلوے ہیں۔ اللہ کے نام کے ساتھ جو ایسا نام ہے کہ اس سے سب کمالات کا ظہور ہوتا ہے رحمان اور رحیم کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ رحمت، رحمانیت اور رحیمیت پر دلالت کرتے ہیں۔ غضب اور انتقام کی صفات بالذات نہیں ہیں بلکہ ان صفات کی تابع ہیں جبکہ رحمت، رحمانیت اور رحیمیت بالذات ہیں۔ دوسری صفات ان کے تابع ہیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اللہ، رحمان اور رحیم کے نام کے ساتھ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ دنیا میں جس کمال کی بھی تعریف و ستائش ہوتی ہے وہ اسی کی حمد بن جاتی ہے۔ آدمی کوئی کھانا کھاتا ہے تو اس کی تعریف کرتا ہے کہ کیا مزیدار کھانا تھا۔ اگرچہ آدمی خود نہیں سمجھتا لیکن یہ دراصل خدا کی تعریف

ہے ۔ آدمی کسی دوسرے کے متعلق کہتا ہے کہ وہ کتنا اچھا آدمی ہے کتنا بڑا فلسفی اور عالم ہے ۔ یہ بھی خدا ہی کی حمد و ثنا ہے کیونکہ فلسفی اور عالم کا اپنا کچھ نہیں ہے، جو کچھ بھی ہے خدا کا جلوہ ہی ہے ۔ جس نے اس بات کو سمجھا اور عقل سے سمجھا، وہ بھی اور اس کی عقل بھی دونوں خدا کا جلوہ ہیں۔

کوئی تعریف کسی اور کی تعریف نہیں ہے

کوئی تعریف غیر اللہ کی نہیں ہوتی کیونکہ ہم جب بھی کسی کی تعریف کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس میں یہ خوبی ہے ۔ یہ اچھائی ہے ۔ نہ ہونے کی تو تعریف نہیں کی جاتی اور جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے ۔ جس بات کی بھی تعریف کی جائے اسی کی تعریف ہے ۔ جو حمد و ثنا کی جائے گی وہ اسی کی ہوگی ۔ اَلْحَمْدُ کے معنی ہیں سب تعریفیں ۔ جو کچھ بھی تعریف ہے درحقیقت خدا کی ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زید کی تعریف کر رہے ہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عمر کی تعریف کر رہے ہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سورج کی روشنی یا چاند کی چاندنی کی تعریف کر رہے ہیں لیکن ہم حجاب میں ہیں، ہم نہیں جانتے کیونکہ حقیقت ہم سے پوشیدہ ہے ۔

جب پردہ اٹھے گا تو ہم دیکھیں گے کہ سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں ۔ یہ اسی کا جلوہ ہے کہ ہم اس کی تعریف کر رہے ہیں ۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ یعنی ہر خوبی اسی کی ہے ۔ سب کمالات اسی کے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ سب اسی کا جلوہ ہے یا یوں کہیے کہ سارے عالم کا جلوہ اسی سے ہے اور سارا عالم اسی کا جلوہ ہے ۔ ہم سمجھتے

ہیں کہ ہم کچھ کر رہے ہیں۔ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی ''جب آپ نے (کنکریاں) پھینکیں تو آپ نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں'' آپ نے پھینکیں اور آپ نے نہیں پھینکیں کیونکہ یہ پھینکنا بھی ایک اور پھینکنے کا جلوہ ہے اور پھینکنا خود بھی ایک جلوہ ہے لٰکِن مَا رَمَیْتَ جلوہ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ رَمٰی کا۔

ایک اور آیت ہے: جن لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی انہوں نے اللہ سے بیعت کی۔ یہ ہاتھ بھی خدا کا جلوہ ہے۔ ہم چونکہ حجاب میں ہیں اس لیے اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ہم سب حجاب میں ہیں سوائے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جن کو اللہ نے تعلیم دی اور ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے مستفیض ہوئے۔

یہ ایک احتمال ہے کہ شاید 'باسم' کا تعلق 'الحمد' سے ہو یعنی خدا کے نام کے ساتھ سب تعریفیں اللہ کی ہیں۔ یہ خدا کا جلوہ ہے جو سب تعریفوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور کوئی تعریف کسی غیر کی تعریف نہیں ہونے پاتی۔ کوئی کتنی ہی غیر کی تعریفیں کرے ہر تعریف اسی کی ہوگی۔ کتنا ہی غور کیجیے، آپ غیر کا کہیں پتا نہیں پائیں گے اور کتنا ہی زور لگائیے کہ غیر کے متعلق کچھ بات کیجیے تو نہیں کر سکیں گے کیونکہ غیر از خدا تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ جو کچھ آپ کہیں گے وہ اسی کے متعلق ہوگا۔ نقائص معدوم ہیں۔ جو چیز وجود میں آتی ہے اس کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک وجودی پہلو، دوسرا نقص یا لَا کا پہلو۔ وجودی پہلو نور ہے جس میں

جامعہ تعلیمات اسلامی

کوئی نقص نہیں ہوتا اور وہ نقائص سے پاک ہوتا ہے نقص اس سے نہیں ہے لا اس سے نہیں ہے۔ تعریف ہمیشہ "ہے" کی ہوتی ہے "نہیں" کی نہیں ہوتی۔

تعریف ہمیشہ وجود، ہستی اور کمال کی ہوا کرتی ہے، کمال کا اس دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے۔ صرف ایک ہی کمال ہے اور وہ اللہ کا کمال ہے۔ جمال بھی صرف اللہ کا جمال ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کو سمجھیں اور اپنے دل کو سمجھائیں۔ اگر ہم یہی ایک بات دل کو سمجھا سکیں تو پھر کوئی بات ہی نہ ہو۔ بات کرنا آسان ہے لیکن قابلِ فہم بات کا بھی دل کو اس طرح سمجھانا کہ اسے یقین آجائے مشکل ہے۔ کبھی آدمی محض زبان سے کہتا ہے کہ جہنمی ہے، جنتی ہے۔ کبھی اس کو اس کا یقین بھی ہوتا ہے۔

یقین کرنا اور ہے اور علمی اعتقاد اور ہے

دل سے یقین کرنا علمی اعتقاد سے مختلف چیز ہے۔ علمی دلائل سے کسی بات کا ثابت ہونا ایک الگ بات ہے اور اس کا واقعی دل میں جم جانا بالکل الگ بات۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا راز اسی کمل یقین میں پوشیدہ ہے۔ جب کسی بات کا یقین آگیا تو پھر اس کے خلاف عمل ممکن ہی نہیں رہا۔ اگر آپ کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ ایک آدمی تلوار سونتے ہوئے آپ کے سر پہ کھڑا ہے کہ اگر آپ نے اس کے خلاف کوئی لفظ کہا تو وہ آپ کی گردن مار دیگا تو چونکہ آپ کو اپنی جان عزیز ہے

جامعہ تعلیمات اسلامی

اس لیے اس کا امکان ہی نہیں کہ آپ اس کے خلاف زبان ہلائیں گے۔ گویا آپ اس معاملے کی حد تک معصوم ہو گئے۔ جس کو اس کا یقین آگیا کہ اگر اس نے چغلی کھائی تو یہ چغلی اسے ایک ایسے بھیانک جانور کی شکل بنکر چلنے لگے گی جس کی زبان اتنی لمبی ہو گی کہ جہاں وہ ہے وہاں سے لیکر جہاں وہ شخص ہے جس کی غیبت کی گئی وہاں تک پہنچے گی تو وہ کبھی غیبت نہیں کریگا۔ اگر کسی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ غیبت اِدَامُ کِلَابِ النَّارِ یعنی جہنم کے کتوں کی غذا ہے اور غیبت کرنے والے کو جہنم کے کتے نگلیں گے اور نگلتے ہی رہیں گے اور نگلنا کبھی ختم نہیں ہو گا تو وہ ہرگز غیبت نہیں کریگا۔ یہ جو ہم کبھی کبھی کسی کی غیبت کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم ان باتوں کو پوری طرح دل سے نہیں مانتے۔

اعمال وافعال ٹھوس شکل اختیار کرلیں گے

اگر آدمی کو اس کا یقین ہو جائے کہ جو کام بھی وہ اس دنیا میں کرتا ہے وہ سب اگلی دنیا میں مجسم صورت اختیار کرلیں گے۔ اگر اچھے اعمال ہیں تو ان کی اچھی صورت ہو گی اور اگر برے اعمال ہیں تو ان کی بری صورت ہو گی اور ہر چیز کا حساب دینا ہو گا۔ تو وہ برے کام بھول کر بھی نہ کرے۔ اس معاملے کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا کافی ہے کہ ہر کام کا محاسبہ ہو گا۔

چنانچہ اگر کوئی غیبت کریگا تو وہاں اس کا محاسبہ ہو گا اور سزا ملیگی۔ اگر مومنین کو ایذا دیگا تو جہنم میں جائیگا اور اگر خیرات وبرات اسکے نامۂ اعمال

میں ہوگی تو بہشت ملیگی۔ اس کا یقین آجانے کی بات ہے۔ صرف کتاب میں پڑھ لینا اور عقلی طور پر سمجھ لینا کافی نہیں کیونکہ عقلی ادراک اور قلبی یقین ایک دوسرے سے بہت دور اور مختلف ہیں۔ قلب سے میری مراد یہ قلب نہیں بلکہ قلبِ حقیقی ہے۔

مان لینے اور عقلی طور پر سمجھ لینے میں فرق ہے

بسا اوقات آدمی کسی بات کو سمجھتا اور جانتا ہے لیکن چونکہ اسے اس بات پر پختہ یقین نہیں ہوتا اس لیے وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ جب بات دل میں پوری طرح بیٹھ جاتی ہے تو عمل کرنے لگتا ہے۔

ایمان اسی یقینِ محکم کا نام ہے۔ پیغمبر کے متعلق علم ہونے سے فائدہ نہیں ہوتا۔ پیغمبر پر ایمان لانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ کے وجود پر دلائل قائم کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کی ذات پر ایمان ضروری ہے یعنی پختہ یقین رکھنا اور دل کو اس کے تابعِ فرمان کرنا۔ بخدا اگر ایمان ہو تو سب باتیں خود بخود ہو جاتی ہیں۔

اگر آدمی کو یقین ہو جائے کہ ایک ذات اس عالم کا سرچشمہ ہے' آدمی سے بازپرس ضرور ہوگی۔ مرنے کے بعد آدمی فنا نہیں ہو جائیگا کیونکہ مرنے کے معنی ہیں ایک ناقص درجے سے درجۂ کمال کی طرف منتقل ہونا۔ اگر آدمی کو اس کا یقین ہو جائے تو وہ تمام لغزشوں سے بچ جائے۔ سوال صرف یہ ہے کہ یہ یقین کس طرح آئے؟ اس آیت کریمہ میں جو فرمایا گیا ہے بِسْمِ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اللہ کے نام سے سب تعریفیں

اللہ کے لیے ہیں تو اس کے ایک پہلو کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں۔ پھر کہتا ہوں کہ میں یقین سے نہیں کہتا لیکن احتمال یہ ہے کہ اگر آدمی کو یقین آجائے کہ سب تعریفیں اسی کی ہیں تو اس کے دل میں شرک کا خیال ہی نہ آئے کیونکہ جو کوئی کسی کی تعریف کرتا ہے وہ خدا کے جلوے کی تعریف ہوتی ہے۔

اگر کوئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا حضرت امیر علیہ السلام کی شان میں قصیدہ کہتا ہے یا کہنا چاہتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ قصیدہ خدا کے لیے ہے کیونکہ پیغمبر اسلام ؐ اور حضرت امیرؑ خدا کا عظیم جلوہ ہیں اور چونکہ آپ خدا کا جلوہ ہیں اس لیے آپ کی مدح خدا کی مدح اور اس کے جلوے کی مدح ہے۔ اگر آدمی کو یقین ہو کہ سب تعریفیں اللہ ہی کی ہیں تو وہ خود نمائی چھوڑ دے۔ یہ جو آدمی اس قدر شیخی بگھارتا ہے اور غرور کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ. جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا' اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

آدمی نہیں جانتا کہ وہ خود کچھ نہیں۔ اگر وہ یہ سمجھ لے اور اسے یہ یقین ہو جائے کہ جو کچھ ہے خدا کا ہے تو وہ اپنے پروردگار کو پہچانتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم نہ خود کو پہچانتے ہیں نہ خدا کو' نہ ہمیں اپنے آپ پر ایمان ہے نہ خدا پر۔ نہ ہمیں یہ یقین ہے کہ ہم کچھ نہیں ہیں اور نہ ہمیں یہ یقین ہے کہ جو کچھ ہے سب خدا کا ہے۔ جب یہ یقین نہ ہو تو خدا کے وجود کے جتنے بھی دلائل دیے جائیں سب بیکار ہیں۔

انانیت ہر کام میں شامل ہے اور یہ کہ میں کیا ہوں اور تم کیا ہو۔ ریاست و زعامت کے یہ دعوے انانیت ہی کی وجہ سے ہیں۔ یہ انانیت اسی وقت ہوتی ہے جب آدمی خود بین ہوتا ہے۔

انسان پر سب مصیبتیں حبّ نفس کی وجہ سے آتی ہیں

انسان پر جو مصیبتیں آتی ہیں حبِّ نفس کی وجہ سے آتی ہیں کیونکہ آدمی اپنی ذات سے محبت کرتا ہے حالانکہ اگر وہ غور کرے اور سمجھے تو اس کی ذات کوئی چیز نہیں، یہ دوسرے کی چیز ہے، اس لیے حبِّ نفس درحقیقت حبِّ غیر ہے۔ غلطی سے اس کا نام حبِ نفس رکھ دیا گیا ہے۔ یہی غلطی آدمی کو خراب کرتی ہے۔ جو تکلیفیں ہم سب پر آتی ہیں ان کی اصل وجہ یہی حبِّ نفس اور حبِ جاہ ہے۔ حبِّ جاہ ہی ہے جو انسان کو قتل کراتی ہے، اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے اور جہنم میں لیجاتی ہے۔ حبِ نفس اور حبِّ جاہ رَأسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ یعنی ہر لغزش اور برائی کی جڑ ہیں۔ جب انسان خود بین و خود پسند ہو جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ ہر چیز پر خود ہی قبضہ کرے اور غلط یا صحیح جس کو اپنے راستے میں رکاوٹ سمجھتا ہے اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ ہر بات اپنے ہی لیے چاہتا ہے اور کسی طرح کی حدود و قیود کا قائل نہیں رہتا۔ یہی بات سب مصیبتوں اور تکلیفوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

سب تعریفیں اسی کی ہیں

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتابِ الٰہی کی ابتداء ایک ایسے مضمون سے ہوئی ہے جو تمام مسائل پر حاوی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سب تعریفیں اللہ کی ہیں تو شاید سب ہی مسائل سامنے آجاتے ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ کچھ تعریفیں اللہ کی ہیں۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے لیکن میں تعریف تمہاری کر رہا ہوں خدا کی نہیں، جب بھی سب تعریفیں اللہ ہی کی ہیں۔

جب یہ فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تعریف کی سب اقسام ہر لحاظ سے اللہ کی ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ کسی اور کی تعریف کر رہے ہو۔ یہی ایک آیت تمام مسائل پر سے پردہ اٹھا دیتی ہے۔۔۔ اگر اسی ایک آیت پر آدمی کو پورا الیقین ہو۔ واضح رہے کہ بات یقین کی ہے۔۔۔ تو یہی ایک کلمہ انسان کے قلب کو ہر طرح کے شرک سے پاک کرنے کے لیے کافی ہے۔

جس نے یہ کہا ہے کہ میں نے شروع سے آخرِ عمر تک کسی طرح کا شرک نہیں کیا تو اس کے ایسا کہنے کی وجہ یہی ہے کہ اس نے اپنے وجدان سے اس حقیقت کو معلوم کر لیا اور یہ حقیقت اس کے ضمیر میں جاگزیں ہو گئی ہے۔ دلیل اور برہان سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ دلیل اپنی جگہ اچھی چیز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دلیل اچھی چیز نہیں۔ اس کی بھی ضرورت ہے لیکن دلیل محض ایک ذریعہ ہے کسی مسئلے کو اپنی عقل کے مطابق سمجھ لینے کا۔ پہلے سمجھیے اور پھر کوشش کر کے اس پر ایمان لے آیئے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود

فلسفہ محض ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ یہ مسائل و معارف کو عقلی طور پہ دلائل سے سمجھ لینے کا ایک ذریعہ ہے۔ دلائل کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ بات عقل میں آجائے۔ "پائے استدلالیاں چوبیں بود" کا مطلب یہی ہے کہ دلائل لکڑی کے پاؤں ہیں۔ وہ پاؤں جن سے آدمی واقعی راستا طے تو کرسکتا ہے لیکن وہ پاؤں جن سے آدمی واقعتاً راستا طے کرسکے اور جلوۂ الٰہی کو دیکھے وہ ایمان ہے۔ وہ ایمان جو انسان کے دل میں جاگزیں ہوجائے اور وہ وجدان اور ذوق ہے جو ایمان کا سبب بنے۔ یہ درجہ بھی ایک ادنیٰ درجہ ہے۔ اس سے اونچے درجے بھی ہیں۔

امید ہے کہ انشاء اللہ ہم صرف قرآن کی تلاوت اور اس کی تفسیر پڑھنے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ ہر مسئلے اور قرآن کے ہر لفظ پر مکمل یقین رکھیں گے۔ یہ وہ کتاب ہے جو آدمی کی اصلاح کرتی اور اسے ایسا موجود بنانا چاہتی ہے جسے خدا نے خود ایجاد کیا ہے اور اسم اعظم سے ایجاد کیا ہے۔ اللہ نے آدمی کو سب کچھ دیا ہے مگر اس کی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی کو اس ناقص درجے سے اٹھا کر اس اعلیٰ درجے تک پہنچا دے جو اس کے لیے مناسب ہے۔ قرآن اسی لیے آیا ہے۔ سب انبیاء و رسل اسی لیے آئے ہیں کہ انسان کی دستگیری کریں، اسے نفسانیت کے عمیق ترین کنوئیں سے نکالیں جس میں وہ گرا ہوا ہے اور اسے جلوۂ حق دکھائیں تاکہ وہ حق کے سوا سب کچھ بھول جائے۔ خدا کرے کہ اسکے فضل سے یہ نعمت ہمیں بھی نصیب ہو۔

جامع تعلیمات اسلامی

ایک سورت کی بسم اللہ دوسری سورت کی بسم اللہ سے مختلف ہے

بات یہ ہو رہی تھی کہ بسم اللہ میں جار و مجرور کا تعلق کس لفظ سے ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک احتمال یہ ہے کہ ہر سورت کی بسم اللہ کا تعلق اسی سورت کے کسی مناسب لفظ سے ہو جیسے سورۃ الحمد میں حمد سے بِسۡمِ اللّٰہِ، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کے معنی یہ ہوئے کہ: اللہ کے نام سے، سب تعریف اللہ کی ہے۔ اس احتمال کی بنا پر ہر سورت میں بسم اللہ کے معنی مختلف ہونگے کیونکہ ہر سورت میں بسم اللہ کا تعلق اسی سورت کے کسی مناسب لفظ سے ہوگا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سورۃ الحمد میں بسم اللہ کا تعلق حمد

سے ہے تو پھر دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کونسا اسم ہے جو ذاتِ حق سے ذاتِ حق کے لیے ظاہر ہوتا ہے اور اس اسم سے حمد واقع ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی دوسری سورت مثلاً سورۂ اخلاص میں دیکھنا ہوگا کہ اس سورت میں وہ کونسا اسم ہے جو بِسْمِ اللّٰهِ کے مناسب ہے۔ فقہ میں بھی یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی نے کسی سورت کے ساتھ بسم اللہ پڑھی اور پھر کوئی دوسری سورت پڑھنی چاہی تو پہلی بسم اللہ کافی نہیں ہوگی بلکہ دوبارہ بسم اللہ پڑھنی ضروری ہے۔ اس کے بھی یہی معنی ہوئے کہ ایک بسم اللہ دوسری بسم اللہ سے مختلف ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ سب جگہ بسم اللہ کے ایک ہی معنی ہوتے تو پھر ایک سورت کی بسم اللہ اور دوسری سورت کی بسم اللہ میں فرق نہ ہوتا چنانچہ بعض لوگ اس بات کے قائل بھی ہیں کہ اصولی طور پر بسم اللہ کسی سورت کا جزو نہیں اور یہ کہ سورۂ الحمد میں بسم اللہ محض برکت کے لیے آئی ہے لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سورۂ الحمد میں بسم اللہ کے جار و مجرور کا تعلق حمد سے ہے تو ایک احتمال یہ ہے کہ الحمد میں ہر وہ حمد شامل ہو جس پر حمد کا لفظ صادق آتا ہے مطلب یہ ہے کہ جو حمد کرنے والا بھی حمد کرتا ہے وہ اللہ کے اسم سے ہوتی ہے کیونکہ حمد کرنے والا خود بھی ایک اسم ہے۔ اس کے اعضاء و جوارح بھی اسم ہیں۔ انسان جو حمد کرتا ہے وہ بھی ایک اسم ہے۔ اس لحاظ سے بھی ہر حمد اللہ کے اسم سے ہوتی ہے۔ آپ خود بھی ایک اسم ہیں۔ زید بھی ایک اسم ہے۔ سب اسمائے الٰہی ہیں یعنی اسماء کے مظاہر کیونکہ یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ اللہ ان کا وجود میں لانے والا یا

فاعلِ وجود ہے۔ فاعلِ وجود اور فاعلِ طبیعی میں کئی لحاظ سے فرق ہے۔ ایک فرق یہ ہے کہ جو شے مبداءِ الٰہی سے صادر ہوتی ہے جسے فاعلِ الٰہی بھی کہتے ہیں۔ وہ اسی مبداء و مصدر میں فنا ہوتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ایک مثال سے یہ بات کسی حد تک سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اگرچہ یہ مثال موجودات اور فاعل الٰہی پہ پوری طرح منطبق نہیں ہوتی کیونکہ ان کا تعلق اس مثال سے بہت بلند ہے۔ بہرحال سورج اور اس کی شعاعوں کی مثال لیجیے۔ شعاعوں کا سورج سے الگ کوئی وجود نہیں۔ یہی صورت فاعل الٰہی کی ہے۔ اس سرچشمۂ خیر سے جو بھی وجود میں آتا ہے اس کی کسی لحاظ سے کوئی آزاد حیثیت نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی پیدائش کے وقت بھی اس سرچشمہ کا محتاج ہے اور اسی طرح اپنی بقاء کے لیے بھی۔ کوئی بھی موجود ایسا نہیں ہے کہ اگر اللہ اس نے وجود کی وہ روشنی ایک لمحے کے لیے بھی ہٹا لے جس سے اس کا وجود قائم ہے تب بھی وہ موجود باقی رہ سکے۔ چونکہ کسی موجود کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں اس لیے وہ اپنے سرچشمہ میں گم اور فنا ہے۔

ہر ممکن اپنے تحقق اور بقاء دونوں میں محتاج ہے

ممکن اللہ کا نام، اللہ کا فعل، زمین و آسمان کا نور اور نورِ خدا کا ظہور ہے۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. خدا کے نور کا ظہور ہے لیکن عینِ خدا نہیں ہے۔ ممکن جو ظاہر ہے اس کا مبداءِ ظہور سے ایسا تعلق ہے کہ ظاہر مبداءِ ظہور میں اس طرح فنا ہے کہ اس کا اپنا کوئی مستقل وجود

نہیں، اس لیے کہا گیا ہے کہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ الحمد میں الف لام استغراق کا ہے اور بسم اللہ اس سے متعلق ہے تو معنی یہ ہونگے کہ جو بھی حمد کرنے والا کوئی حمد کرتا ہے اس کا تحقق بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ حمد کرنے والا چونکہ خود اسم اللہ ہے، اس لیے ایک لحاظ سے حامد اور محمود (حمد کرنے والا اور جس کی حمد کی جاتی ہے) دونوں ایک ہی ہیں۔ ایک ظہور ہے، دوسرا مظہر اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ اَنَا اَعُوْذُبِكَ مِنْكَ (تو ایسا ہی ہے جیسے کہ تو نے خود اپنی تعریف کی ہے، میں تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں) چونکہ حامد، محمود میں فنا ہے اس لیے گویا محمود خود اپنی تعریف کرتا ہے اور چونکہ کسی دوسرے کی کوئی حیثیت ہی نہیں اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ وہ خود ہی اپنی تعریف کرتا ہے کیونکہ حامد (تعریف کرنے والا) محمود (جس کی تعریف کی جاتی ہے) میں فنا ہے۔

ایک اور احتمال یہ ہے کہ الحمد میں الف لام استغراق کا نہ ہو جو کثرت پر دلالت کرتا ہے بلکہ بغیر کسی تعین اور بغیر کسی خصوصیت کے مطلق حمد مراد ہو۔ اس صورت میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں حمد سے مراد ہوگی مطلق حمد بلا تعیین۔ اس احتمال کی صورت میں معنی پہلے احتمال کے برعکس ہونگے اور ہماری حمد فی الواقع اللہ کی حمد نہیں ہوگی۔ فقط اس کی اپنی ہی کی ہوئی حمد اس کی ہوگی کیونکہ اس کی ذات غیر محدود ہے اور دوسرا جو کوئی بھی حمد کرتا ہے اسکی حمد متعین اور محدود ہوتی ہے۔ محدود جو حمد کرتا ہے، وہ غیر محدود کی حمد نہیں ہوتی۔ پہلے احتمال کی صورت میں ہم نے کہا تھا کہ ہر حمد خدا ہی کی ہوتی ہے یہانتک کہ جب آپ سمجھتے ہیں کہ کسی خوبصورت خط

کی تعریف کر رہے ہیں تب بھی وہ درحقیقت خط کی نہیں بلکہ اللہ کی تعریف ہوتی ہے جب آپ کا خیال ہوتا ہے کہ آپ دنیا کی تعریف کر رہے ہیں تب بھی وہ اللہ ہی کی تعریف ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہم نے کہا تھا کہ ہر حمد چاہے حمد کرنے والا کوئی بھی ہو اسی کی حمد ہوتی ہے اور اسی کو پہنچتی ہے کیونکہ دنیا میں نہ کوئی کمال ہے نہ جمال۔ کمال بھی فقط اسی کا ہے اور جمال بھی اسی کا۔ اللہ کے سوا کسی بھی چیز کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ اگر اللہ اپنا جلوہ اٹھالے تو موجودات میں سے کوئی چیز بھی باقی نہ رہے۔

موجودات خدا کا جلوہ ہیں

موجودات کا وجود خدا کے جلوے سے ہے۔ پہلے احتمال کی صورت میں ہم نے یہ کہا تھا کہ موجودات خود خدا کا جلوہ اور نور ہیں اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اگر یہ جلوہ ہٹا لیا جائے تو کسی موجود کا وجود باقی نہ رہے۔ چونکہ موجودات خدا کا جلوہ ہیں اور مدح کمال ہی کی ہوا کرتی ہے لہٰذا کوئی تعریف بھی غیر اللہ کی نہیں ہوتی اس لیے کہ ذاتِ باری کے کمال کے علاوہ کوئی کمال ہے ہی نہیں۔ وہی کمال ہے، وہی ظہورِ کمال ہے، اسکی ذات میں بھی کمال ہے، صفات میں بھی کمال ہے، مقامِ ظہور میں بھی کمال ہے اس لیے سارے عالم کے کمالات اسی کا کمال ہیں۔ جو کوئی کسی کی مدح کرتا ہے وہ کمال کی مدح ہونے کے باعث اسی کی مدح ہوتی ہے، اسی کے لیے ہوتی ہے۔ یہ بات پہلے احتمال کی صورت میں تھی۔ دوسرے احتمال کی صورت میں گو وہ بھی احتمال ہی ہے حمدِ مطلق ہوگی نہ کہ کُلِ حمد۔ حمدِ مطلق سے مراد وہ حمد

ہے جس میں نہ کوئی قید ہو نہ غیر کا تصور اس میں شامل ہو۔ جو حمد ہم کرتے ہیں وہ بالکلیہ حمدِ متعین اور متعین کی حمد ہے کیونکہ موجود مطلق تک ہماری رسائی نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں اس کا ادراک ہے اس لیے ہم اس کی حمد کیسے کرسکتے ہیں۔ آپ جب اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کہتے ہیں، اس وقت بھی آپ کو اس حقیقت الحقائق کا ادراک نہیں ہوتا کہ آپ اسکی حمد کرسکیں۔

جو حمد بھی کی جاتی ہے وہ اللہ کی حمد نہیں ہوتی، اس کے مظاہر کی حمد ہوتی ہے۔ پچھلے احتمال کی صورت میں کوئی بھی حمد خدا کی نہیں ہوتی سوائے اس حمد کے جو وہ خود اپنی کرتا ہے۔ اس صورت میں بِسۡمِ اللّٰہِ، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ میں اسم کے بھی وہ معنی نہیں ہوسکتے جو ہم نے پہلے بیان کیے تھے کہ آپ بھی اسم ہیں، وہ بھی اسم ہے اور دوسرے بھی اسم ہیں۔ اب اسم اللہ علامت ہے ظہورِ مطلق بے قید کی جس کا ظہور بھی غیب ہے اور اسم بھی غیب۔ اسی اسم کی حمد ہوتی ہے یعنی وہ حمد جو خدا خود اپنی کرتا ہے۔ یہ بھی ایک احتمالی قول ہے اس بنیاد پر کہ بسم اللہ کا تعلق حمد سے ہو۔ ایک احتمال کی بنا پر حمد سے مراد حمد کا ہر مصداق ہے اور دوسرے احتمال کی بنا پر مطلق حمد بلا کسی قید کے۔

ایک صورت میں کوئی بھی حمد غیرِ خدا کی نہیں ہوتی۔ دوسری صورت میں کوئی حمدِ مطلق حمد کے معنی میں خدا کی نہیں ہوتی البتہ محدود حمد ہوتی ہے۔ اس صورت میں اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کے معنی ہوں گے کہ مطلق حمد بلا کسی قید کے۔ اللہ کی حمد صرف اس نام سے ہوتی ہے جو اس کے شایاں ہے۔ یہ بھی فقط ایک احتمال ہے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

ایک اور احتمال یہ ہے کہ بسم اللہ کا تعلق سورت سے ہی نہ ہو۔ چنانچہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ بسم اللہ جار و مجرور فعلِ مقدر ظَھَرَ سے متعلق ہیں یعنی ظَھَرَ الْوُجُوْدُ اب بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز بھی وجود میں آتی ہے وہ اللہ ہی کے نام سے وجود میں آتی ہے یعنی اللہ کا نام تمام موجودات کے ظہور کا سرچشمہ ہے۔ یہ اللہ کا نام وہی ہے جس کے متعلق ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الْمَشِیْئَۃَ بِنَفْسِہٖ وَخَلَقَ الْاَشْیَاءَ بِالْمَشِیْئَۃِ اللہ نے مشیت کی خود تخلیق کی اور باقی چیزیں مشیت سے تخلیق کیں۔

مشیت سے مراد وہی ظہور اول ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ تخلیق کیا ہے۔ باقی سب چیزوں کی تخلیق مشیت سے ہوئی ہے۔ یہ وہی وجود ہے جو ظَھَرَ الْوُجُوْدُ میں ہے۔ اس احتمال کی بنا پر کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا تعلق سورت سے نہیں بلکہ کسی خارجی شئے سے ہے، اہل ادب نے بھی اَسْتَعِیْنُ (میں مدد چاہتا ہوں) اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ مقدر مانے ہیں۔ اَسْتَعِیْنُ کا لفظ بھی مناسب ہے۔ گو اہل ادب کے ذہن میں یہ بات نہ ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر کہیں اَسْتَعِیْنُ بِاللّٰہِ بھی آئے گا تو اس کا مطلب بھی اَسْتَعِیْنُ بِاسْمِ اللّٰہِ ہی ہوگا کیونکہ جو شخص بھی استعانت طلب کرے گا، اللہ کے نام ہی سے کرے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص اللہ کے نام کے بغیر مدد طلب کرے۔ بہر حال باسم اللہ کے الفاظ مقصود نہیں، نہ اَسْتَعِیْنُ وغیرہ کوئی رسمی چیز ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کا نام ہی ہر چیز میں اس کا ظہور ہے، اسی لیے

جامعہ تعلیمات اسلامی

اس کے نام سے مدد طلب کی جاتی ہے۔

اسی ظہور سے مدد طلب کی جاتی ہے اور اسی ظہور کی مدد سے سب کچھ ہوتا ہے۔ استعانت کے معنی ہیں رجوع الی اللہ۔ گو ادب اس تصور سے بھی نا آشنا ہیں۔ یہ تو تھا اس کا بیان کہ بسم اللہ کا تعلق کس لفظ سے ہے۔ اسم کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ اسم مسمّٰی کی علامت اور نشانی ہے اور کون سی چیز ہے جو مسمّٰی کی نشانی نہ ہو۔ آپ جس چیز کو بھی دیکھیں گے تو یہی پائیں گے، وہ وجود اللہ جل شانہ، کا ظہور اور اس کی نشانی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ علامت اور نشانی کے بھی مدارج ہیں۔ بعض نام تو ایسے ہیں جو ہر لحاظ سے اس کی نشانی ہیں۔ بعض کا درجہ اس سے کم تر ہے۔ اسی طرح درجہ بدرجہ سب موجودات ہیں لیکن سب اس کا ظہور اور اس کی نشانیاں ہیں۔ سب اسی کے نام کا جلوہ ہیں۔ گو فرقِ مراتب اپنی جگہ ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے: نَحْنُ اَسْمَاءُ اللّٰهِ الْحُسْنٰی ہم سب اللہ کے اچھے نام ہیں البتہ مقامِ ظہور میں سب سے ارفع و اعلیٰ نام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمۂ اطہار صلوات اللہ علیہم ہیں، جو نقائص سے پاک ہو کر سیر الی الحق کے بلند ترین مرتبہ پر پہنچے۔ وہ ہماری طرح نہیں جو ابھی تک نفسانیت کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔

ہجرت الی اللہ

ہم نے تو ابھی چلنا بھی شروع نہیں کیا جب کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کہ اس گڑھے سے نکل گئے بلکہ ہجرت بھی کر گئے۔ ارشادِ خداوندی

جامعہ تعلیمات اسلامی

ہے: وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ "جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کے لیے اپنے گھر سے نکلا' پھر اسے موت نے آلیا تو اللہ سے اس کا اجر دیگا۔ (سورۃ نساء-آیت ۱۰۰)

ایک احتمال یہ ہے کہ یہاں ہجرت سے مراد اپنے نفس سے اللہ کی طرف جانا ہو اور اپنے گھر سے مراد خود آدمی کا اپنا نفس ہو۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس اندھیرے گھر یعنی اپنی نفسیات کے دائرے سے نکل کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کے ارادے سے چلے یہاں تک کہ موت نے انہیں آلیا یعنی وہ خود کچھ نہ رہے بلکہ فنا فی اللہ ہو گئے' ان کا اجر اللہ پر ہے یہ مطلب یہ ہے کہ ان کا اجر خود اللہ ہے۔ جنت اور اس کی نعمتوں کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ ان کا مطلوب و مقصود صرف اللہ ہے۔ جو شخص نفسانیت کے ظلمت کدہ سے نکل کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف چل پڑا' اسکا اپنا کچھ نہیں رہا۔ اس کے لیے جو کچھ ہے' اللہ کا ہے۔ جو شہود کے اس مرتبہ پہ پہنچ گیا' اس کا اجر اللہ پر ہے۔ غرض کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ ہجرت کر کے منزل پر پہنچ گئے اور ان کا اجر اللہ ہے جبکہ کچھ دوسرے لوگ ایسے ہیں کہ ہجرت تو انھوں نے بھی کی لیکن وہ فنا کی منزل تک پہنچ نہ سکے۔

اس کے بعد کچھ ہم جیسے ہیں جنھوں نے سرے سے ہجرت ہی نہیں کی اور ابھی تک اندھیروں ہی میں ہیں۔ ہم صرف دنیا اور دنیا کی چیزوں میں گم ہیں' بلکہ انانیت اور خود پرستی میں بھی گرفتار ہیں ابھی تک نفسانیت کے اندھیرے کنوئیں میں محبوس ہیں۔ اسی لیے ہمیں اپنے سوا کچھ سجھائی نہیں

دیتا۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں صرف اپنے لیے چاہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہیں ہم ہی ہیں۔ ہمارے سوا سب ہیچ ہے۔ ہمیں ابھی تک ہجرت کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ ہماری سوچ اسی دنیا تک محدود ہے۔

ستّر سال اس طرف

جو قوتیں خدا کی طرف سے ہمیں ودیعت ہوئی ہیں ہم انہیں رد تو نہیں کرتے لیکن ایسا ہے کہ ہم ان سے یہیں کا کام لیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے ہم اس سرچشمہ اور اس جگہ سے دور ہوتے جاتے ہیں جس کی طرف ہمیں ہجرت کرنی چاہیے۔ ایک روایت ہیں ہے کہ ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کیساتھ تشریف فرما تھے کہ اچانک بڑے زور سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ صحابہ نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کیا ہوا؟ روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ایک پتھر جہنم کے درمیان میں لڑھک رہا تھا۔ اب ستّر سال کے بعد اس کنوئیں میں گرا ہے جو جہنم کے دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ یہ اسی کے گرنے کی آواز ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ تمثیل ہے اس بداطوار آدمی کی جو ستّر سال کی عمر پا کر مر گیا۔ ہم بھی اسی گڑھے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں اسّی برس کی عمر میں اُدھر چلا جاؤں گا' اور کچھ برسوں میں آپ بھی دوسری طرف چلے جائیں گے۔

بدترین دشمن

ہماری جو حالت ہے اسی وجہ سے ہے اور ہم پہ جو کچھ گزرتی ہے' اس

کی وجہ یہی حبِّ نفس اور انانیت ہے۔ اسی بات کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اَعْدٰی عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْكَ تمہارا بدترین دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو تمہارے اپنے پہلو میں ہے۔ نفس سب سے بڑا دشمن ہے۔ تمہارا نفس ہی سب بتوں کو جنم دیتا ہے۔ انسان سب سے زیادہ اسی بت کی عبادت کرتا ہے۔ اسے زیادہ تر لگاؤ اسی سے ہے۔ جب تک آدمی اس بت کو پاش پاش نہ کر دے وہ خدا کا نہیں ہو سکتا۔ بت اور خدا ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ خود پرستی اور خدا پرستی کا ساتھ ممکن نہیں۔ جب تک ہم نفسانیت کے بت خانہ اور نفس کے بت سے نجات حاصل نہ کرلیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رخ نہیں کر سکتے۔ گو ہم بظاہر خدا پرست ہوں، لیکن دراصل بت پرست ہیں۔

ہم زبانی خدا کا نام لیتے ہیں لیکن ہمارے دل میں خود اپنا ہی خیال بسا ہوتا ہے۔ ہم نماز پڑھتے ہیں تو اپنے فائدے کے لیے، اگر ہم خدا کے طالب ہیں تو وہ بھی اپنے لیے۔ ہم نماز میں زبان سے تو کہتے ہیں اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ لیکن فی الواقع عبادت اپنے نفس کی کرتے ہیں۔ ہماری ساری توجہ ہمارے اپنے ہی اوپر مرکوز رہتی ہے۔ ہر چیز ہمیں اپنے ہی لیے چاہیے۔ سب مصیبتوں اور برائیوں کی جڑ یہی آدمی کی انانیت اور خود پرستی ہے۔

لڑائیوں کی وجہ انانیت ہے

دنیا کی سب لڑائیاں آدمی کی انانیت ہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ مومن آپس میں نہیں لڑتے۔ اگر دو آدمیوں میں لڑائی ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ مومن

نہیں۔ مومنوں میں لڑائی نہیں ہوتی۔

جب آدمی کا ایمان درست نہ ہو اور اسے اپنے فائدے کے سوا کسی بات سے غرض نہ ہو، تو وہ یہی چاہتا ہے کہ ہر چیز پر خود ہی قبضہ کر لے۔ یہیں سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ مسند میں لے لوں، آپ چاہتے ہیں کہ آپ لے لیں۔ اب یہ دونوں باتیں تو ممکن نہیں، لہٰذا جھگڑا پیدا ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ قالین میں لے لوں، آپ چاہتے ہیں کہ آپ لے لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خیالی کرسی مجھے ملے، آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو ملے۔ جب ایک ہی چیز آپ بھی لینا چاہتے ہیں اور میں بھی لینا چاہتا ہوں تو لامحالہ جھگڑا ہو گا۔ اگر کوئی شخص اس ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور کوئی دوسرا بھی یہی چاہتا ہے تو پھر جنگ ہو گی۔ سب لڑائیاں اور جنگیں خود غرضی کی لڑائیاں ہیں۔ دنیا کی سب جنگیں شخصیتوں اور ان کے مفادات کے ٹکراؤ کے نتیجے میں برپا ہوتی ہیں لیکن چونکہ اولیاء اللہ میں انانیت نہیں ہوتی، اس لیے ان کے مابین جنگ بھی نہیں ہوتی۔ اگر سب اولیاء کسی ایک جگہ جمع بھی ہو جائیں تو وہ کبھی آپس میں نہیں لڑینگے کیونکہ ان میں کبھی باہمی مخالفت نہیں ہو گی کہ سب اولیاء جو کچھ کرتے ہیں خدا ہی کے لیے کرتے ہیں۔ ان میں خودی ہوتی ہی نہیں کہ باہم کشاکش ہو اور وہ ایک دوسرے کے مزاحم ہو کر جھگڑا کریں۔

ان سب کا سرچشمہ ایک ہے۔ ان کی سمت ایک ہے۔ یہ تو ہم ہیں کہ اندھیرے کنویں میں پڑے ہوتے ہیں، جس میں ایسا اندھیرا ہے کہ اس سے بڑھ کر اندھیرا ممکن نہیں۔ یہ اندھیرا انانیت کا ہے۔ جب تک ہم

انانیت سے نہیں نکلیں گے اس کنویں سے نہیں نکل سکتے۔ ہم اپنی خودغرضی سے دوسروں کو کچھ نہیں سمجھتے۔ سب کچھ اپنے آپ ہی کو سمجھتے ہیں۔ جس بات میں ہمارا فائدہ ہو، اس کو تو ہم قبول کر لیتے ہیں لیکن جہاں ہمیں اپنا فائدہ نظر نہ آئے، ہم حق بات کو بھی مان کر نہیں دیتے۔ اگر بات ہمارے مطلب کی ہو تو ہمیں فوراً اس کا یقین آجاتا ہے لیکن اگر ہمارے خلاف ہو تو کبھی آسانی سے یقین نہیں آتا۔ یہ سب انانیت ہے۔ ہماری، تمہاری اور ساری نوعِ بشر کی مصیبتوں کا باعث یہی رویہ ہے۔ سب جھگڑا خودغرضی اور خودپرستی کا ہے۔ میں اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہوں اور آپ اپنا۔ جب تک یہ صورت ہے، تو للّٰہیت کہاں۔ یہ تو نفس پرستی ہے۔ پھر اس گڑھے سے نکلنے کی کیا صورت ہے؟ یہ بت خانہ خود انسان کے اندر ہے جس سے نکلنا آسان نہیں۔ اس سے نجات کے لیے ایک غیبی ہاتھ کی ضرورت ہے جو انسان کی دست گیری کرے اور اسے اس گڑھے سے نکالے۔ انبیاءؑ اسی غرض کے لیے آئے ہیں۔

انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد

تمام انبیاء علیہم السلام جو مبعوث ہوئے ہیں اور سب آسمانی کتابیں جو نازل ہوئی ہیں، وہ سب اسی لیے آئی ہیں کہ آدمی کو اس بتخانے سے نکالیں۔ اس بت کو توڑیں اور لوگوں کو خداپرست بنائیں۔ سب انبیاءؑ اسی لیے آتے ہیں کہ اس دنیا میں، جو شیطانی دنیا ہے، خدائی نظام قائم کریں۔ یہاں شیطان کی حکومت ہے۔ شیطان ہمارا حکمران ہے،

جامع تعلیمات اسلامی

اور ہم سب اس کے تابعِ فرمان ہیں۔ نفسانی خواہشات شیطان کا جلوہ ہیں۔ ہم جو کام کرتے ہیں وہ شیطانی ہوتا ہے کیونکہ سب سے بڑا شیطان خود ہمارا نفس امارہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمارا کوئی کام بھی خود غرضی اور خود پرستی سے خالی نہیں ہوتا۔ شیطان ہمارے اوپر مسلط ہے' جو وہ کہتا ہے وہی ہم کرتے ہیں۔ ہم اس کنویں سے اسی وقت نکل سکتے ہیں جب ہم اس منزل سے ہجرت کر کے انبیاءؑ اور اولیاءؒ کی تعلیم پر عمل کریں' اور خود پرستی کو چھوڑ دیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہمیں وہ کامیابی نصیب ہوگی جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں۔

جو شخص بھی درجۂ کمال تک پہنچنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ ہجرت کرے۔

جہادِ اکبر

جو شخص انانیت کے گڑھے سے نکلنے کا خواہشمند ہو' اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ہجرت کے لیے مجاہدہ کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ کچھ صحابہ کسی جہاد سے واپس آئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ: تم جہادِ اصغر کر کے آئے ہو' وَبَقِیَ عَلَیْکُمُ الْجِهَادُ الْاَکْبَرُ ابھی جہادِ اکبر تمہارے ذمے باقی ہے۔ یہ جہادِ اکبر نفس کے خلاف جہاد ہے۔ دنیا کے باقی سب جہاد اسی جہاد کے تابع ہیں۔ اگر اس جہاد میں ہم کامیاب ہو جائیں تو پھر جو جہاد بھی ہم کریں گے وہ واقعی جہاد ہوگا لیکن اگر اس جہاد میں کامیاب نہ ہوں تو باقی سب جہاد کارِ شیطان ہیں۔

جامع تعلیمات اسلامی

اگر کوئی شخص اس لیے جہاد میں حصہ لیتا ہے کہ اسے کوئی کینٹرل جائے یا روزی کا بندوبست ہو جائے تو اس کا اجر انہی چیزوں کا حصول ہے لیکن جو شخص اللہ کے لیے جہاد کرتا ہے اس کا اجر بھی اللہ کے ذمے ہے۔ کام کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ اس کام میں جو ہم کرتے ہیں اور اس کام میں جو اولیاء کرتے ہیں، زمین و آسمان کا فرق ہے کیونکہ دونوں کا مقصد اور منشا جدا ہے۔

حکم الٰہی کی تعمیل میں خلوص دیکھا جاتا ہے

کیا یہ بلاوجہ کہا گیا ہے کہ جنگ خندق کے موقع پر امام علی علیہ السلام کی ایک ضرب جن و انس کی عبادت سے افضل تھی؟ بظاہر یہ ضرب کسی کو قتل کرنے کے لیے ایک وار سے زیادہ کچھ نہ تھی لیکن اس کا ایک اور رخ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وقت اسلام کو کفر کی متحدہ طاقت کا سامنا تھا۔ اگر اس دن مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو اسلام کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ جاتا۔ یہ معاملے کا ایک پہلو ہے۔ ایک دوسرا پہلو وہ للٰہیت ہے جو اس عمل میں مضمر تھی۔ اس وقت جب حضرت علیؑ کسی دشمن کے سینہ پر سوار تھے، اس نے آپ پر تھوک دیا۔ آپ فوراً اس کے سینہ پر سے اتر گئے کہ مبادا آپ کا عمل للٰہیت کی سطح سے گر جائے اور اس میں ذاتی انتقام کا جذبہ شامل ہو جائے۔

ایسی ضرب کی روح یقیناً سب عبادتوں سے افضل ہے۔ یہی وہ روح ہے جو عبادت کو صحیح معنی میں عبادت بناتی ہے۔ ظاہر میں تو مشرک

اور موحد، بت پرست اور وہ جو بتوں کو نہیں پوجتے سب ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں۔ ظواہر کی حد تک کوئی خاص فرق نہیں۔ ابوسفیان بھی نماز پڑھتا تھا۔ امیر معاویہ تو امام جماعت تھے اور ان کے ظاہری اعمال ایک ہی طرح کے تھے لیکن وہ چیز جو نماز کو رفعت بخشتی ہے وہ اس کی روح ہے۔ اگر یہ روح موجود ہے تو نماز عبادت الٰہی ہے ورنہ محض دھوکا اور دکھاوا ہے۔ ہمارا یہی حال ہے کہ ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔

ہماری عبادت جنت کے لیے ہے

ہماری سب عبادت سرتاسر اپنے لیے ہے۔ جو زیادہ نیک اور صالح ہیں وہ جنت کے لیے عبادت کرتے ہیں۔ جنت کو درمیان سے نکال دیجیے پھر دیکھیے کہ کون عبادت کرتا ہے۔ علیؑ البتہ رہ جاتے ہیں کیونکہ انہیں عبادت سے عشق تھا اور وہ عبادت کو گلے لگائے ہوتے تھے۔ عَشِقَ الْعِبَادَةَ وَعَانَقَهَا اصولاً جنت کے لیے عبادت کوئی بات نہیں۔ جو شخص نفسانیت سے نکل کر فنا کے مرتبہ تک پہنچ گیا۔ اس کے نزدیک جنت کی نعمتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ ان کی پروا بھی نہیں کرتا جس کو اَدْرَکَهُ الْمَوْتُ کا مرتبہ مل گیا، اس کے لیے جنت اور جہنم سب برابر ہیں۔ اَثْنٰی عَلٰی ذَاتِ اللّٰہِ تَعَالٰی وہ خدا کی حمد و ثنا اس لیے کرتا ہے کہ اس نے اللہ کو عبادت کا مستحق جانا ہے۔ یہ مرتبہ ان کو حاصل ہوتا ہے جو عبادت کے عاشق ہیں۔ وہ معبود کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ عبادت کا اہل ہے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

اور بھی مراتب ہیں جن کا ہمیں خیال بھی نہیں مگر پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی نفسانیت کو چھوڑ کر انانیت کے گڑھے سے نکل جائے۔

اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ قیام کرے، اللہ کے لیے قیام کرے، جاگ جائے اور ہماری طرح سوتا نہ رہے۔ اس وقت ہم گو بظاہر جاگ رہے ہیں، مگر دراصل ہم سو رہے ہیں۔ ہمارا جاگنا جانوروں کا سا جاگنا ہے۔ یہ انسانوں کی سی بیداری نہیں۔ ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اَلنَّاسُ نِیَامٌ وَاِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا۔ حدیث ہے یعنی "لوگ سو رہے ہیں، مرنے پر ہی جاگیں گے۔" اس وقت معلوم ہو گا کہ کس خوابِ غفلت میں تھے اور اب کیا افراتفری مچی ہے۔ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ۔ یعنی "جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔" مطلب یہ ہے کہ اس وقت گھیرے ہوئے ہے۔ آدمی پر چونکہ نشہ طاری ہے اس لیے اسے ادراک نہیں ہوتا۔ جب یہ نشہ اتر جائے گا تو وہ دیکھے گا کہ آگ ہی آگ ہے۔ اس راستے پر چلنا تو سب ہی کو ہے۔ اس میں تو چارہ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم خود ہی بیدار ہو جائیں اور جس صراطِ مستقیم پر چلنا چاہیے اس پر چلیں اور انبیاءؑ کے زیرِ تربیت ہو جائیں۔

انبیاءؑ انسان بنانے کے لیے آتے ہیں

سب انبیاءؑ اس لیے آئے کہ انسانوں کی اصلاح کریں۔ کوئی ایسا نبی نہیں آیا جس کا مقصد انسان کی اصلاح نہ ہو۔ عدل و انصاف قائم کرنے

جامعہ تعلیمات اسلامی

کے معنی بھی انسانوں کی اصلاح ہی ہیں۔ کسی چیز کو عدل اسی وقت کہہ سکتے ہیں جب وہ انسان سے صادر ہو۔ اسی طرح ظلم کا مرتکب بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ عدل قائم کرنے کا مطلب ہے ظالم کو عادل میں بدل دینا' مشرک کو مومن بنا دینا۔ انبیاءؑ کا کام ان لوگوں کی کایا پلٹنا ہے کہ اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ہاویۂ جہنم میں جا گریں۔ انبیاءؑ بتلاتے ہیں کہ صحیح راستا یہ ہے۔ اس راہ پر چلو۔ افسوس ہمارے حال پر کہ ہم نے ابھی تک صحیح راستا اختیار نہیں کیا۔ ستر برس کی عمر ہو گئی پھر بھی راہ راست پر نہیں آئے۔ ہم نے ابھی تک ہجرت نہیں کی۔ جہاں تھے وہیں ہیں گویا اسی زمین کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ شاید آخر تک یہی حال رہے مگر ضرورت اس کی ہے کہ صحیح راستے پر چلیں۔ اسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

جوانوں سے خطاب

آپ لوگ' جو جوان ہیں اس راہ کو بہتر طور پر اپنا سکتے ہیں۔ ہمیں چھوڑیے کہ ہماری طاقت ختم ہو چکی ہے۔ آپ اپنے نفس کا تزکیہ ہم سے بہتر کر سکتے ہیں۔ بڈھوں کے مقابلے میں آپ عالم ملکوت سے نزدیک تر ہیں۔ بگاڑ نے آپ میں ابھی تک اس طرح جڑ نہیں پکڑی ہے۔ ابھی بگاڑ کم ہے۔ ابھی اس کی ایسی افزائش نہیں ہوئی جیسی بڈھوں میں ہو چکی ہے لیکن دن بدن بگاڑ بڑھتا جا رہا ہے۔ جتنی دیر کریں گے اتنی ہی مشکل ہو جائے گی۔ بڈھا اگر اپنی اصلاح کرنی چاہے تو بہت مشکل ہے البتہ جوان کی اصلاح جلد ہو جاتی ہے۔

ہزاروں جوانوں کی اصلاح ہو سکتی ہے مگر ایک بڈھے کی اصلاح نہیں ہوتی اس لیے اس کام کو بڑھاپے پر مت چھوڑیے۔ جوانی ہی میں کام شروع کر دیجیے۔ ابھی سے اپنے آپ کو انبیاءؑ کی تعلیم کا تابع بنائیے۔ یہی نقطۂ آغاز ہے۔ یہیں سے سفر کرنا ضروری ہے۔ انبیاءؑ نے راستا دکھا دیا ہے۔ ہم راستے سے ناواقف ہیں جبکہ انبیاءؑ راستے سے واقف ہیں۔ وہ اس راہ کے شناسا ہیں اور جانتے ہیں کہ سلامتی کا راستا کونسا ہے۔ انھوں نے اس راستے کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ اگر آپ سلامتی چاہتے ہیں تو ان کے بتلاتے ہوئے راستے پر چلیے۔ اپنے نفس کی طرف آہستہ آہستہ توجہ کم کیجیے۔ یہ کام فوراً نہیں ہو گا لیکن آپ بتدریج نفسانیت کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ہماری سب خواہشات ایک دن خاک میں مل جائیں گی۔ ان کی طرف توجہ میں سراسر ہمارا نقصان ہے۔ وہی چیز باقی رہے گی جس کا تعلق خدا سے ہے۔ مَا عِنْدَ كُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

انسان کے پاس مَا عِنْدَكُمْ بھی ہے اور مَا عِنْدَ اللّٰهِ بھی۔ جن امور میں اس کی توجہ اپنی ذات کی طرف ہے، وہ سب مَا عِنْدَكُمْ ہے۔ وہ سب فنا ہو جائے گا البتہ جن امور میں توجہ خدا کی طرف ہے وہ اللہ کے نام سے باقی رہے گا، وہ دائمی ہے۔

نفس پر مکمّل فتح تک کوشش

ہماری اور آپ کی اس وقت جو حالت ہے، کوشش کیجیے کہ یہ

حالت بدل جائے۔ جن لوگوں نے کفار کے خلاف جہادوں میں کامیابی حاصل کی، انہوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ ان کے ساتھ کتنی جمعیت ہے۔ وہ[1] بھی تو تھے کہ جنہوں نے کہا تھا کہ اگر سارے عرب بھی میرے خلاف متحد ہو جائیں، جب بھی میں پیچھے نہیں ہٹوں گا، اس لیے کہ یہ خدا کا کام ہے اور جو چیز خدا کی ہے اس میں ناکامی کا سوال نہیں۔ پسپائی کا کیا ذکر۔ پھر پیچھے ہٹ کر جاؤ گے کہاں؟ جو لوگ جہاد اور پیش قدمی کرتے تھے، وہ اپنی اور اپنے مفاد کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے تھے۔ انہوں نے انتہائی حد تک اپنے نفس کے خلاف جہاد کیا تھا۔ جو اس سے بلند درجہ پر تھے، ان کا نفس کے خلاف جہاد بھی اسی مناسبت سے بڑھا ہوا تھا۔ جب تک نفس کے خلاف جہاد نہ ہو، کچھ نہیں ہو سکتا۔ آدمی جب تک دنیا سے منہ نہ موڑے، اپنی خواہشات کو نظر انداز نہ کر دے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ دنیا در اصل نفسانی خواہشات ہی کا نام ہے۔

ہر شخص کی خواہشات ہی اس کی دنیا ہیں۔ اسی دنیا کی مذمت کی گئی ہے، عالمِ طبیعی کی مذمت نہیں کی گئی۔

دنیا وہی ہے جو آپ کے اندر موجود ہے۔ جب آپ اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو آپ ہی خود دنیا ہوتے ہیں۔ ہر شخص کی دنیا اس کے اندر ہے۔ اسی کی مذمت کی گئی ہے۔ چاند، سورج اور نیچر کی کسی چیز کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ ان کی تو تعریف کی گئی ہے۔ یہ تو سب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور اس کی قدرت کے مظاہر ہیں۔

---

[1] امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔

جو چیز انسان کو قربِ الٰہی سے محروم رکھتی ہے وہ دنیا ہے اور یہ دنیا خود آدمی کے اپنے ہاتھ میں ہے یعنی یہ دنیا اس کی اپنے نفس کی طرف توجہ ہے۔ خدا کرے ہمیں نفسانیت کے گڑھے سے نکلنے میں کامیابی ہو اور اولیاء اللہ ہی ہیں جو اس گڑھے سے نکلنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور جنہوں نے اس بلا سے نجات پائی ہے۔ وَاَدْرَكَهُمُ الْمَوْتُ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔

گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ بِسْمِ اللّٰہِ میں اسم کس لفظ سے متعلق ہے۔ اس بارے میں چند احتمالات ہیں جو میں نے عرض کیے تھے۔

حق اور خلق

ان مسائل میں سے بعض کا سمجھنا اس امر پر موقوف ہے کہ یہ معلوم ہو کہ خدا اور مخلوق کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ ہم عموماً اس تعلق کا ذکر یا تو طوطے کی طرح رٹے رٹائے الفاظ میں کر دیتے ہیں یا کبھی کبھی دلائل بھی دیدیتے ہیں۔ اس سے اونچا درجہ کچھ دوسرے ہی لوگوں کا حق ہے۔ بہر حال موجودات کا حق تعالیٰ سے تعلق اس نوعیت

کا نہیں ہے جس طرح کا تعلق ایک موجود کا دوسرے موجود سے ہوتا ہے
مثلاً باپ کا بیٹے سے، یا بیٹے کا باپ سے۔ باپ بیٹے کا تعلق تو وہ تعلق
ہے جو دو ایسے موجودوں کے درمیان ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک
کا وجود مستقل ہو اور ساتھ ہی ان میں کچھ تعلق بھی ہو۔ اس سے برتر
تعلق کی مثال سورج اور اس کی کرنوں کی ہے۔ یہاں بھی سورج
اور اس کی کرنیں دو مختلف چیزیں ہیں اور ایک حد تک ان کا اپنا
الگ الگ وجود ہے۔ ایک اور طرح کے تعلق کی مثال انسان کی ذات
اور اس کے ذہنی و جسمانی قویٰ کی ہے مثلاً قوت باصرہ یا قوت سامعہ،
لیکن ان میں بھی انسان کی ذات سے ایک طرح کی مغایرت پائی جاتی
ہے اور یہ قوتیں اور انسان کی ذات شئ واحد نہیں ہیں۔ ان تمام مثالوں
کے برخلاف موجودات کا تعلق حق تعالیٰ سے جو سرچشمۂ وجود ہے بالکل
مختلف نوعیت کا ہے۔ جن تعلقات کا ہم نے اوپر ذکر کیا، ان میں سے
کسی پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ حق تعالیٰ اور مخلوقات کے تعلق
کو کتاب و سنت میں کئی جگہ تجلّی سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے تَجَلّٰی رَبُّهٗ
لِلْجَبَلِ یا مثلاً دعائے سمات میں وَبِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ
تَجَلَّيْتَ لِلْجَبَلِ فَجَعَلَهٗ دَكًّا۔

ایک جگہ قرآن مجید میں ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا۔
حالانکہ تَوَفّی یعنی روح قبض کرنا ملک الموت کا کام ہے۔ اگر کوئی آدمی
کسی کو قتل کر دے تو اس کے متعلق بھی کہا جاتا ہے: فلاں شخص نے
فلاں شخص کو مار ڈالا۔ ایک اور جگہ قرآن میں ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

"آپ نے (کنکریاں) نہیں پھینکیں، جب آپ نے پھینکیں" مَا رَمَیْتَ، رَمَیْتُ. یعنی آپ نے نہیں پھینکیں بلکہ ہم نے پھینکیں۔ یہ سب ایک تجلّی ہے، ایک نور ہے۔ اگر ہم اس مفہوم پر دلیل کی روشنی میں یا بغیر دلیل کے بھی غور کریں تو ان آیات سے متعلق کچھ مسائل ذہن میں آتے ہیں۔

حمد کے معانی

الحمد کے معنی کے متعلق پہلا احتمال ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ اس میں الف لام استغراق کا ہو اور حمد سے مراد ہو تمام تعریفیں یعنی اس لفظ میں کثرت کا مفہوم ہو اور اسی طرح اسم کے لفظ میں بھی کثرت کا مفہوم ہو۔ اس لحاظ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے ایک احتمالی معنی یہ ہوئے کہ جو حمد بھی ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے کیونکہ جو تعریف بھی کی جاتی ہے وہ اسی کے کسی نہ کسی جلوے کی کی جاتی ہے اور ہر جلوے میں اسی کا ظہور ہے۔ سورج کا ظہور اس کی شعاعوں میں ہے یا انسان کی ذات کا جو ظہور اس کی قوتِ باصرہ اور قوتِ سامعہ میں ہے، حق تعالیٰ کا ظہور تمام موجودات و مخلوقات میں اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اس لیے جو تعریف بھی ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے مظاہر کی ہوتی ہے اور چونکہ تمام موجودات حق تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اس لیے یہ سب اس کے اسماء اور نام ہیں۔ دوسرا احتمال ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ یہ مفہوم پہلے مفہوم کے برعکس ہوگا اور معنی یہ ہونگے کہ کسی تعریف کرنے والے کی تعریف بھی اللہ کی تعریف نہیں ہوتی۔ گو اس صورت میں بھی تمام مظاہر اسی کا ظہور ہیں اور حمد بھی انہیں مظاہر

جامعہ تعلیمات اسلامی

کی ہوتی ہے لیکن ہماری حمد نہ علی الاطلاق ہوتی ہے اور نہ اس ذاتِ مطلق کی ہو سکتی ہے۔

لیکن چونکہ تمام کثرتیں اسی وجودِ مطلق کی وحدت میں گم اور جذب ہو جاتی ہیں اور ان کا مستقل وجود باقی نہیں رہتا اس لیے اس صورت میں بھی ایک لحاظ سے حمد اسی وجودِ مطلق کی ہو گی۔ فرق صرف کثرت اور وحدت کے اعتبار کا ہے۔ اگر کثرت پر نظر کی جائے تو ہر حمد اسی کی حمد ہوتی ہے۔ اسی طرح لفظاً اسم میں بھی کثرت کا اعتبار ہو گا۔ اس لحاظ سے ہر موجود اسمِ الٰہی ہو گا اور ایک اسم دوسرے اسم سے مختلف ہو گا۔ اس احتمال کی رو سے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے معنی اس سے مختلف ہوں گے جو دوسرے احتمال کی رو سے ہوتے ہیں۔ اسم کے مفہوم میں کثرت پر نظر ہو گی، اللہ اس اسم کا وصف ہو گا جس میں مقامِ کثرت اور مقامِ تفصیل ملحوظ ہے۔ اللہ اسمِ اعظم پر حق تعالیٰ کی تجلّی ہے۔

موجودات میں تجلّی

موجودات میں اسمِ اعظم کی تجلّی ہے۔ اللہ کا نام رحمان، رحمانیت کی تجلی ہے مقامِ فعل میں۔ اسی طرح رحیم، رحیمیت کی تجلّی ہے مقامِ فعل میں۔ یہی صورت رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وغیرہ کی ہے۔ دوسرے احتمال کی رو سے حمد، حمدِ مطلق ہے بغیر کسی قید کے۔ اس احتمال کی رو سے اللہ، رحمان اور رحیم وغیرہ کا تصور بھی قدرے مختلف ہے پہلے احتمال کی رو سے اسم سے مراد سب موجودات تھے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

ہر موجود اپنے ہر عمل کے لحاظ سے ایک الگ اسم تھا اور عمل کے بدل جانے سے ایک مختلف اسم بن جاتا تھا مگر دوسرے احتمال کی رو سے حمد مطلق ہے۔ مطلق حمد اللہ، رحمان اور رحیم کے ناموں کے ساتھ۔

مطلق حمد حق تعالیٰ سے مخصوص ہے یعنی وہی اپنی حمد کرتا ہے مطلق حمد کرتا ہے کسی ایسے نام کے ساتھ جو مقام ذات کے ظہور کا نام ہے، یعنی مقامِ ذات میں اپنے ناموں کے ساتھ حمد کرتا ہے۔ اللہ مقامِ ذات میں اسم جامع ہے نہ کہ مقام ظہور میں۔ اللہ کا ہر نام مقامِ ذات میں اس کا جلوہ ہے۔ رحمان نام ہے رحمانیت کا مقامِ ذات میں۔ رحیم نام ہے رحیمیت کا مقامِ ذات میں۔ رب وغیرہ کی بھی یہی صورت ہے فلسفہ میں یعنی اعلیٰ فلسفہ میں جو عام اور معروف فلسفہ سے مختلف ہے۔ ان مقامُ معانی کے دلائل بھی موجود ہیں مگر اولیاء کی بات اور ہے۔ انھوں نے سلوک کی منازل طے کر کے ان مسائل کا ادراک اور مشاہدہ کیا ہے۔

مشاہداتِ انبیاءؑ

اولیاء اپنے مشاہدات لوگوں سے بیان نہیں کر سکتے۔ قرآن شریف بھی جو نازل ہوا ہے، وہ ہم تک متنزّل حالت (اعلیٰ وارفع حقائق کو گھٹا کر سادہ اور آسان انداز میں پیش کرنا) میں پہنچا ہے تاکہ ان لوگوں کو مخاطب کر سکے جو ابھی تک نفسانیت کی قید میں ہیں اور گمراہی کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اور ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ آپ لوگوں کے سامنے حقائق کو صاف صاف بیان

نہیں کر سکتے تھے بلکہ حقائق و معارف متنزّل حالت میں پیش فرماتے تھے۔ معانی کے لحاظ سے قرآن پاک کے مختلف مدارج ہیں۔ قرآن سات یا ستر بُطون (پوشیدہ معانی) پر نازل ہوا ہے۔ ان بُطون سے مسلسل تنزل کر کے قرآن اس درجے تک پہنچا ہے کہ وہ ہمارے لیے قابل فہم ہو اور اس کے مضامین ہماری محدود عقل میں آ سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے اونٹ کی مثال بیان فرمائی ہے: اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ (کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے پیدا کیا گیا؟) یہ ہماری کس قدر بدقسمتی ہے کہ ادنیٰ درجے کی مخلوقات جیسے سورج، آسمان، زمین اور خود انسان کے بارے میں بیان کرتے ہوئے انبیائے کرام علیہم السلام یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی زبان میں گرہ ہے اور وہ صاف الفاظ میں حقیقت کا اظہار نہیں کر سکتے: رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ وَیَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ "اے میرے پروردگار میرے لیے میرا سینہ کھول دے میرا کام آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔"

یہ گرہیں دیگر انبیاءؑ کی زبان میں بھی تھیں اور ان کے دل میں بھی تھیں جن کی وجہ سے وہ حقائق کا اس طرح اظہار نہیں کر سکتے تھے جس طرح وہ حقائق ان تک پہنچتے تھے۔ اسی لیے وہ مثالوں کی مدد سے بات کو ایک حد تک ہمیں سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ جب اونٹ کی مثال دیکر اللہ تعالیٰ کے وجود کو سمجھایا جائے تو بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارا اپنا درجہ کیا ہے۔ ہمارا اپنا درجہ بھی جانوروں کا سا ہے اور جو

جامع نعلیان اسلامی

علم و معرفت ہمیں اس طرح حاصل ہوتا ہے ظاہر ہے وہ بھی حد درجہ ناقص ہی ہے۔

انبیاءؑ کے سلسلے میں ایک جگہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا جب حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصی تربیت کی اور وہ سلوک کی منازل سے گزرے تو انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ۔ مجھے اپنی رویت عطا کریعنی میں آنکھ سے تجھے دیکھوں۔ ظاہر ہے کہ ایک بزرگ نبی خود خدا کو ظاہری آنکھ سے دیکھنے کی تو درخواست نہیں کر سکتے، اس لیے رُویت کا مطلب وہی ہو گا جو رائی یعنی دیکھنے والے اور مرئی جسے دیکھا جائے، دونوں کے مناسبِ حال ہو اور اللہ کی ایسی رُویت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کہا: رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ۔ تو جواب آیا: لَنْ تَرٰىنِیْ۔ شاید اس کا یہ مطلب تھا کہ جب تک تم موسیٰؑ ہو یعنی تمہاری ہستی فنا نہیں ہو جاتی، تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، لیکن حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مایوس نہیں کیا، اس لیے مزید کہا: اُنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ۔ پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اس پہاڑ کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس سے کوہ طور مراد ہے؟ کیا جو تجلی موسیٰ علیہ السلام پر نہیں ہو سکتی تھی، اس پہاڑ پہ ہو سکتی تھی؟ کیا اس وقت اگر کچھ لوگ کوہِ طور پر موجود ہوتے تو وہ بھی اس تجلی کو دیکھتے؟ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ اور اُنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ میں ایک وعدہ ہے۔ ایک ملاقات کا ذکر ہے۔ فرمایا: تم نہیں دیکھ سکتے وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ

جامع نعلیان اسلامی

مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرَانِیْ "لیکن پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر یہ اپنی جگہ پر رہا تو تم مجھے دیکھو گے۔" احتمال یہ ہے کہ اپنی جگہ رہنے سے مراد وہیں ٹوٹ پھوٹ جانا ہو اور پہاڑ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نفس میں جو کچھ انانیت باقی رہ گئی تھی وہ ہو۔ تجلّی کے نتیجے میں پہاڑ ڈھے گیا، یعنی وہ انانیت کی حالت بالکل ختم ہوگئی وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا یعنی موسیٰ علیہ السلام فنائیت کے درجے تک پہنچ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ ہمارے لیے تو محض ایک قصہ ہے لیکن انبیاءؑ کے لیے ایک مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ چونکہ ہم ابھی تک انانیت کے ظلمت کدہ میں اسیر ہیں اس لیے یہ تجربہ ہمارے لیے قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ پہاڑ اور طور کی بات ہم جیسوں کے لیے کی گئی ہے۔

تجلّی کے معنی

ہم جیسوں کے خیال میں تجلّی ایک نور تھا جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر دیکھا۔ دوسروں نے بھی شاید دیکھا ہو۔ کیا خوب! گویا وہ بھی کوئی ایسا نور تھا جسے سب محسوس کر سکتے اور دیکھ سکتے تھے۔ جبرئیل امین رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے لیکن کیا وہاں موجود دوسرے لوگ بھی اسے سن سکتے تھے؟ ہم اصلیت کی پرچھائیں سے بھی غافل ہیں۔ ہمارا علم دور سے سنی سنائی باتوں تک محدود ہے۔

انبیاءؑ کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے کوئی خواب دیکھا ہو

یا کوئی مشاہدہ کیا ہو لیکن نہ تو وہ خود اپنی بات کہہ سکتا ہو اور نہ دوسروں میں اس کی بات سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ یہی حال انبیاءؑ کا ہے کہ نہ وہ کہہ سکتے ہیں نہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہے لیکن ہمارے لیے نہیں کیونکہ ہم صرف وہی باتیں سمجھ سکتے ہیں جو ہمارے سمجھنے کی ہیں۔ قرآن میں سب کچھ ہے، شرعی اور ظاہری احکام بھی اور وہ قصے بھی جن کے مغز تک تو ہماری رسائی نہیں البتہ ہم ان کا ظاہری مطلب سمجھ لیتے ہیں۔

کچھ باتیں ایسی ہیں کہ ان سے ایک حد تک تو سب استفادہ کر سکتے ہیں لیکن إِنَّمَا يَعْرِفُ الْقُرْآنَ مَنْ خُوطِبَ بِهِ (قرآن کو وہی سمجھتا ہے جو اس کا مخاطب ہے) صحیح استفادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کر سکتے تھے۔ دوسرے اس سے محروم ہیں البتہ وہ نفوس قدسیہ جنہیں آپ نے تعلیم دی اور وہ اولیاء جو آپ کی تعلیم سے بہرہ مند ہوئے وہ ضرور سمجھتے ہیں۔

قرآن پاک روح الامین کے توسط سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر نازل ہوا جیسا کہ خود قرآن میں ہے کہ: نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ. اور ہر بار اس کا نزول پہلے سے متنزّل حالت میں ہوا یہاں تک کہ رسول اکرمؐ تک پہنچا۔ خود رسول اکرمؐ نزول کے اس مقامِ تنزل پر ہیں جو ایک ایسا مقام ہے کہ خود 'اُس' سے لیتے ہیں۔ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ (ہم نے اس کو نازل کیا شب قدر میں) یعنی ہر شب قدر میں وہی جلوہ نازل ہوتا ہے لیکن مقام تنزل میں اونچے مقام پر روح الامین ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے قلب پر وارد ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ

جامع تعلیمات اسلامی

بہ اعتبارِ مراتب نازل ہو، ایک بطن سے دوسرے بطن میں اور اس حد سے اس حد تک اور یہاں تک پہنچ جائے کہ الفاظ کی شکل اختیار کر لے۔

قرآن کی ماہیت

اصل میں قرآن الفاظ کے مجموعہ کا نام نہیں ہے، نہ کوئی ایسی چیز ہے جس کو دیکھا یا سنا جا سکے یا الفاظ میں ادا کیا جا سکے۔ نہ وہ کسی کیفیت کا نام ہے لیکن اسے ایک آسان شکل دیدی گئی ہے تاکہ ہم جیسے اندھے اور بہرے بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ جو لوگ قرآن سے واقعی مستفید ہوئے تھے، ان کی تربیت ایک بالکل مختلف انداز پہ ہوئی تھی۔ ان کا کتابُ اللہ سے فیض حاصل کرنے کا طریقہ بھی کچھ اور ہی تھا۔ جس سرچشمہ سے قرآن نازل ہوا ہے، اس سرچشمہ کی طرف ان کی توجہ کی نوعیت بھی اس صورتِ حال سے مختلف تھی جو ہمارے یہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جلوہ عالمِ غیب سے ظاہر ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ متنزل ہو کر عالمِ طبیعی تک پہنچتا ہے۔ جس طرح عالم طبیعی یا عالمِ جسمانی وظاہری میں اور عالمِ غیب کے بے شمار مراتب اور مدارج میں فرق ہے، اسی طرح ہم جیسوں کے ادراک میں اور اُن کے ادراک میں جو ہم سے بالاتر ہیں، اور اُن کے ادراک میں جو اُن سے بھی بالاتر ہیں اور پھر اُن کے ادراک میں جو اور بھی بالاتر ہیں، فرق ہے۔ ادراک کا بلند ترین مرتبہ اولیاءِ خاصانِ خدا اور انبیاءؑ کو حاصل ہے۔ وہ اس مرتبے پہ ہیں کہ ان کے لیے وہ جلوہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تھا اور

جس کا ذکر قرآن میں ہے : تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ اور دُعائے سمات میں ہے کہ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ تَجَلَّيْتَ لِلْجَبَلِ اسی سلسلے میں جب درخت پر تجلی ہوئی تو آواز آئی : يَا مُوْسٰى اِنِّیْ اَنَا اللّٰهُ یہ سب صحیح ہے۔ ان میں سے ہر چیز اپنی جگہ مکمل ہے۔ رہا یہ سوال کہ اگر ہم قرآن کو سیکھنا چاہیں تو کیا کریں، تو اس معنی میں یہ مسائل سیکھنے سکھانے کے نہیں ہیں۔

قرآن کی تفسیر

جب ہم قرآن اور اس کی تفسیر پر نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں تو ہمارے سامنے یہی مشہور اور متداول تفاسیر ہوتی ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ ان میں سے بعض تفاسیر میں ان مضامین کا بھی کچھ ذکر ہے لیکن اس کی صورت اندھے بہروں کے پڑھنے پڑھانے کی ہے۔ قرآن میں سب مسائل موجود ہیں لیکن اسی کے لیے جو اس کو سمجھ سکے۔ اِنَّمَا يَعْرِفُ الْقُرْاٰنَ مَنْ خُوْطِبَ بِهٖ (قرآن کو وہی جانتا ہے جو اس کا مخاطب ہے)۔ اس مرتبہ کی طرف قرآن کی ان آیات میں اشارہ ہے : نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ اور اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا جو قرآن کے مخاطب اولین ہیں کوئی اور قرآن کی حقیقت کا مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ یہاں سوال عقلی ادراک کا نہیں۔ دلیل و برہان کا یہاں کچھ دخل نہیں۔ یہ تو مشاہدہ کا سوال ہے اور مشاہدہ بھی غیبی مشاہدہ۔ یہ مشاہدہ نہ آنکھ سے ہوتا ہے نہ ذہن سے اور

نہ ہی عقل سے بلکہ یہ قلب سے ہوتا ہے اور قلب بھی نبی کا جو قلبِ عالم ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ قرآن کے مخاطب کی حیثیت سے اسے جانتے پہچانتے ہیں۔ مگر وہ بھی صرف مثالوں کے پیرائے میں اور الفاظ کے پردے میں ہی بیان کر سکتے ہیں۔ جو آدمی اندھا ہو ہم اسے کیسے سمجھا سکتے ہیں کہ سورج کی روشنی کیا ہے؟ ہم اس کو کس زبان سے سمجھائیں گے؟ ہم الفاظ کہاں سے لائیں گے؟ صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ روشنی سے اُجالا ہو جاتا ہے۔ وہ جس نے نور دیکھا ہے، اُسے جس نے نور نہیں دیکھا کیا بتلاتے؟ جس کی زبان میں گرہ ہے وہ اس سے کیا کہے جس کے کانوں میں گرہ ہے۔ انبیاءؑ کی زبان میں ایسی ہی گرہ تھی اور اس لیے تھی کہ سننے والوں میں ان کی بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت مفقود تھی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُلجھن

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس گرہ کی وجہ سے سب سے زیادہ اُلجھن اور پریشانی کا سامنا تھا۔ آپ کو پریشانی یہ تھی کہ جو قرآن آپ کے قلب پر وحی الٰہی کے ذریعہ نازل ہوا تھا۔ آپ اسے کس کو سمجھائیں؟

شاید بہت سی باتیں سوائے اس شخص کے جو ولایت "تامّہ" کے درجے پر فائز تھا اور کسی کے سامنے بیان نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے کہ آپ نے فرمایا: مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ مِثْلَ مَا اُوْذِیْتُ. (کسی نبی نے ایسی تکلیف نہیں اٹھائی جیسی کہ میں نے اٹھائی ہے) تو ممکن ہے

جامع تعلیمات اسلامی

اس کے ایک معنی یہ بھی ہوں کہ جو کچھ آپ دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے، وہ نہیں پہنچا سکتے۔ اگر کسی شخص تک کوئی بات پہنچے اور وہ اسے دوسروں تک پہنچانا چاہے مگر نہ پہنچا سکے، تو ظاہر ہے کہ اسے اس کا شدت سے احساس ہوگا کہ اُسے دُوسروں سے بہت زیادہ معلوم ہے مگر خواہش کے باوجود وہ ان تک اپنی بات نہیں پہنچا سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی باپ چاہتا ہے کہ اس کا بچہ سورج کو دیکھے لیکن بچہ نابینا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے اس کا کتنا احساس ہوگا؟ باپ دل و جان سے چاہتا ہے کہ بچے کو سمجھائے لیکن آخر کیا کہے کہ بچہ سورج اور اس کی روشنی کو سمجھ لے؟ مفہوم کو جس عنوان سے بھی بیان کرے، مفہوم واضح نہیں ہو سکتا۔ وہ بچے کے نابینا ہونے اور الفاظ کی نارسائی کے سبب سے مجبور ہے۔

اَلْعِلْمُ هُوَ الْحِجَابُ الْاَكْبَرُ. یعنی سب سے بڑی رکاوٹ یہی علم ہے جو انسان کو عقلی مسائل اور کلیات میں الجھا کر معرفت کی راہ پر چلنے سے باز رکھتا ہے۔ اولیاء کے لیے تو علم سب سے بڑا حجاب ہے۔ علم جتنا زیادہ ہوگا، اتنی ہی بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔ انسان چونکہ خود پرست ہے اس لیے وہ اپنے محدود علم پر پھولا نہیں سماتا اور سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی ہے۔ ہاں اگر اللہ توفیق دے اور آدمی جلد اپنی خام خیالی سے باز آجائے تو اور بات ہے۔

علم میں اجارہ داری کا رجحان

جس شخص نے جو علم پڑھ اور سیکھ لیا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ یہی علم سب کچھ

جامع تعلیمات اسلامی

ہے اور سب کمالات اسی پر موقوف ہیں۔ فقیہہ سمجھتا ہے کہ فقہ کے سوا دنیا میں اور کوئی علم ہے ہی نہیں۔ عارف خیال کرتا ہے کہ جو کچھ ہے عرفان ہے۔ فلسفی کا خیال ہے کہ فلسفہ کے ماسوا سب بیکار ہے۔ انجینئر سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے انجینئری ہی ہے۔ آجکل علم اس کو سمجھا جاتا ہے کہ جس کا ثبوت مشاہدہ اور تجربہ وغیرہ سے ہو۔ باقی کو علم سمجھا ہی نہیں جاتا۔ غرض علم ہم سب کے لیے ایک بڑا حجاب ہے۔ اگرچہ اور بھی بہت سے حجابات ہیں لیکن علم حجاب اکبر ہے۔

جس علم کو چراغ راہ ہونا چاہیے تھا وہی سدّ راہ ہے۔ جس علم سے ہدایت کی توقع تھی وہی ہدایت کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ سب رسمی علوم کا یہی حال ہے۔ علوم انسان کو وہ کچھ نہیں بننے دیتے جو اُسے بننا چاہیے۔ وہ آدمی میں خود پرستی کی قبیح خصلت پیدا کرتے ہیں۔ غیر تربیت یافتہ ذہن پر علم کا یہی اثر ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔ جتنا علم کا انبار بڑھتا جاتا ہے، اس کے نقصانات بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ سنگلاخ بنجر زمین میں بیج ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بنجر زمین اور وہ غیر تربیت یافتہ دل و دماغ جس پر پردہ پڑا ہوا اور جو خدا کے نام سے گھبراتا ہو، برابر ہیں۔ بعض لوگ فلسفیانہ مسائل سے ایسے ڈر کر بھاگتے ہیں جیسے یہ مسائل کوئی سانپ ہیں، حالانکہ فلسفہ علومِ رسمیہ میں شامل ہے اور فلسفی بھی عرفان سے اسی طرح بھاگتے ہیں۔ عارفوں کا بھی یہی حال ہے بلکہ سب ہی علوم کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ:

سراسر قیل است و قال

علوم، اللہ کی یاد میں رکاوٹ بنتے ہیں

مجھے نہیں معلوم کہ ہمیں کیا بننا چاہیے مگر کم از کم کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری تربیت ایسی ہو کہ رسمی علوم خدا کی یاد میں رکاوٹ نہ بنیں۔ یہ خود اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے۔ علم میں مشغولی کی وجہ سے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم خدا اور اس کی یاد سے غافل ہو جائیں۔ یہ نہ ہو کہ علم میں مشغولی کے سبب ہم میں ایسا غرور پیدا ہو جائے جو ہمیں سرچشمۂ کمال سے دُور کر دے۔ اس طرح کا غرور دانشوروں میں عام ہے خواہ ان کا تعلق طبی علوم سے ہو خواہ شرعی یا عقلی علوم سے ہو۔ اگر قلب کا تزکیہ نہ ہو تو ایسا غرور پیدا ہونا قدرتی بات ہے جو انسان کو قطعاً خدا سے دُور رکھتا ہے۔

جب آدمی مُطالعہ میں مشغول ہوتا ہے اس وقت تو وہ مطالعہ میں مستغرق ہوتا ہے لیکن جب وہ نماز میں مشغول ہوتا ہے تو وہ نماز میں مستغرق نہیں ہوتا۔ یہ کیا بات ہے؟ اللہ بخشے میرا ایک دوست تھا۔ وہ جب کوئی بات بھُول جاتا تھا تو کہتا تھا، مجھے یہ بات یاد نہیں آرہی۔ ذرا نماز کے لیے کھڑا ہو جاؤں تو پھر یاد آجائیگی۔ گویا جب آدمی نماز شروع کرتا ہے تو وہ بالکل نماز میں نہیں ہوتا۔ اس کی توجہ خدا کی طرف نہیں ہوتی۔ اس کا دل کہیں اور ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی علمی مسئلہ ہی کو حل کرنے کی فکر میں ہو۔ وہی علم جو مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ تھا، انسان کو مقصد تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ علم شرعی ہو، علم تفسیر ہو یا علم توحید یہ سب ایک غیر تربیت یافتہ اور غیر تزکیہ شدہ انسان کے لیے رکاوٹ بن جاتے ہیں اور مقصد تک

جامع تعلیمات اسلامی

پہنچنے میں مانع ہوتے ہیں علوم شرعیہ ہوں یا مسائل شرعیہ یہ سب عمل کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ خود عمل بھی ذریعہ ہی ہے، مقصد نہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ نفس بیدار ہو جائے اور ظلمانی حجابات سے نکل کر نورانی حجابات تک پہنچ جائے جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنَّ سَبْعِیْنَ اَلْفَ حِجَابٍ مِنْ نُوْرٍ نور کے ستر ہزار حجاب ہیں۔ ظلمت کے بھی ستر ہزار ہی حجاب ہیں اور جو نور کے حجاب ہیں، وہ بھی آخر حجاب ہی ہیں۔ ہم ابھی ظلمانی حجابوں سے بھی باہر نہیں نکلے۔ نورانی حجاب تو دور کی بات ہے۔ ہم تو ابھی تک ظلمانی حجابات ہی میں پڑے کلبلا رہے ہیں۔ اللہ ہی جانے ہمارا کیا انجام ہوگا؟

علوم نے بھی ہمارے نفوس پہ کچھ برا ہی اثر ڈالا ہے۔ ان میں چاہے شرعی علوم ہوں یا وہ عقلی علوم جن کو یہ بیچارے اندھیروں میں بھٹکے ہوئے ذہنیات کا نام دیتے ہیں۔

ذہنیات اور عینیات

یہ لوگ عقلی علوم کو ذہنیات کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کا خارج میں وجود نہیں۔ بہرحال سب علوم مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ جو علم اصل مقصد تک پہنچنے میں رکاوٹ ہے، وہ علم ہی نہیں ہے۔ جو علم آدمی کو اس مقصد سے دور رکھے جس کے لیے انبیاءؑ آئے ہیں، وہ حجاب ہے، ظلمت ہے۔ انبیاءؑ اس لیے آئے ہیں کہ وہ لوگوں کو اس دنیا کی ظلمتوں سے نکال کر نور کے واحد سرچشمہ تک پہنچا دیں نہ کہ اِس طرف ظلمت ہو اور اس طرف نور بلکہ مطلق نور ہو۔ انبیاءؑ کا ہدف یہ ہے کہ انسان نورِ مطلق میں فنا ہو جائے۔ قطرہ دریا میں

مل کر اپنا وجود کھو دے۔ یاد رہے کہ یہ مثال بھی صورتِ حال پر پوری طرح منطبق نہیں ہے۔

تمام انبیاءؑ اسی غرض سے آئے ہیں۔ تمام علوم اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اصل وجود اسی نُور کا ہے۔ ہم محض عدم ہیں۔ ہماری اصل وہاں سے ہے۔ عینیت یعنی وجود نور سے ہے کہ سب انبیاءؑ اسی لیے آئے ہیں کہ ہمیں ظلمتوں سے نکال کر نُورِ واحد تک پہنچا دیں۔ ظلمانی اور نورانی حجابات سے نکال کر نورِ مطلق سے ملا دیں۔

کبھی کبھی علمِ توحید یا علمِ کلام بھی حجاب بن جاتا ہے۔ گو اس علم میں حق تعالیٰ کے وجود پر دلائل قائم کیے جاتے ہیں لیکن یہ دلائل بھی بعض اوقات خُدا سے دُور کر دیتے ہیں۔ انبیاءؑ کا یہ طریقہ نہیں تھا۔ اولیاء اور انبیاءؑ اس طرح دلائل نہیں دیتے تھے۔ وہ دلائل سے واقف تھے لیکن واجب الوجود کو ثابت کرنے کے لیے اُن کا طریقہ بُرہانی نہیں تھا۔

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام خدا سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: مَتیٰ غِبْتَ؟ تو غائب ہی کب تھا؟ (جس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت ہو)

اندھی ہو جائے وہ آنکھ جو یہ نہ دیکھے کہ تو موجود ہے اور تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ واقعی ایسی آنکھ اندھی ہے۔

خُدا کے لیے قیام

قیام کا پہلا درجہ یہ ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ ۚ اَنْ

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ۔ "کہہ دیجیے: میں تم کو ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کے لیے قیام کرو۔" اصحابِ سیر نے اسے پہلی منزل قرار دیا ہے لیکن شاید یہ تمہید ہی ہو اور منزل نہ ہو۔ منازل السائرین میں بھی اسے پہلی منزل قرار دیا گیا ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ دراصل تمہید ہو اور منزل بعد میں آئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ایک محبوب شخصیت کے توسط سے فرماتا ہے کہ میں تمہیں فقط ایک نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ تم اللہ کے لیے قیام کرو۔ یہیں سے سب باتیں اور سب مسائل شروع ہوتے ہیں کہ آدمی جاگ جائے اور اللہ کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔ جو لوگ نیند کے ماتے ہیں، سو رہے ہیں، بے ہوش ہیں، اُن سے کہا گیا ہے کہ بس ایک کام کرو اور وہ یہ کہ خدا کے لیے قیام کرو اور یہ قیام صرف خدا کے لیے ہو۔ یہی وہ ایک نصیحت ہے جس پر ہم نے ابھی تک کان نہیں دھرا اور خُدا کے لیے چلنا شروع نہیں کیا۔ ہم چلتے ہیں لیکن اپنے لیے۔ جو لوگ بہت اچھے اور نیک ہیں، وہ بھی اپنے ہی لیے ہیں۔ کچھ اولیاءُ اللّٰہ ہیں جن کا طریقہ مختلف ہے۔ یہ نصیحت ہمارے لیے ہے جو سو رہے ہیں۔ وہ تو عالمِ بالا میں پہنچ چکے۔ ہمیں بھی وہیں لے جایا جائے گا۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم یہیں رہیں گے۔ جو موکل فرشتے ہمارے قویٰ پر مسلّط ہیں وہ ہمیں اس طرف لیجا رہے ہیں۔ یہ قویٰ خود ہمیں ہماری زندگی کی ابتدا ہی سے اس طرف دھکیل رہے ہیں۔ ایک اور جگہ لیجا رہے ہیں۔ ہم جائیں گے لیکن کیا ان ہی ظلمتوں اور حجابوں کے ساتھ چلے جائیں گے؟

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

دنیا کی محبت فتنوں کی جڑ ہے

دنیا کی محبت سب چیزوں کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ ساتھ سب غلطیوں کی جڑ بھی ہے حُبُّ الدُّنیَا رَأسُ کُلِّ خَطِیئَۃٍ۔ مشہور مقولہ ہے۔ دنیا کی محبت کی وجہ سے بعض اوقات آدمی کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ موحد ہونے کے باوجود اگر اُسے یہ خیال ہو جائے کہ خدا نے فلاں چیز اس سے لے لی ہے تو اس کے دل میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ جب آدمی کا آخری وقت ہوتا ہے اور وہ اس دنیا سے جانے والا ہوتا ہے تو شیاطین جو نہیں چاہتے کہ آدمی کا ایمان پر خاتمہ ہو، اس کی محبوب چیزیں اس کے سامنے لاتے ہیں مثلاً اگر کوئی طالب علم ہے اور کتابوں سے محبت کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کی پسندیدہ کتابیں لاکر کہتے ہیں کہ اپنے عقیدہ سے پھر جاؤ ورنہ ہم ان کتابوں کو آگ لگا دیں گے۔ یہی صورت اس شخص کی ہوتی ہے جسے اپنے بچے سے محبت ہو یا اور کسی چیز سے دلچسپی ہو۔

یہ مت سمجھیے کہ دنیا دار وہ ہیں جن کے پاس مثلاً دولت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے پاس بہت دولت ہو لیکن وہ پھر بھی دنیا دار نہ ہو یا مثلاً ایک طالب علم کے پاس فقط ایک کتاب ہو اور اس کتاب سے دلی لگاؤ کے سبب وہ دنیا دار ہو۔ دنیاداری کا معیار وہ لگاؤ اور تعلق ہے جو انسان کو دنیا کی چیزوں سے ہو۔ اس لگاؤ کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ آخری وقت میں جب انسان یہ دیکھے کہ وہ اپنی پسندیدہ چیزوں سے جدا ہو رہا ہے تو وہ خدا سے

جامعہ تعلیمات اسلامی جامعہ تعلیمات اسلامی

جامع تعلیمات اسلامی

دشمنی پر اُتر آئے اور دشمنِ خدا بن کر اس دنیا سے رخصت ہو اس لیے ضروری ہے کہ لگاؤ کو کم کیا جائے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب ہم سب کو ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہے تو دنیا سے لگاؤ ہونے نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

فرض کیجیے کہ یہ آپ کی کتاب ہے۔ اب اس کتاب سے آپ کو دلی لگاؤ ہو یا نہ ہو یہ کتاب آپ ہی کے پاس رہے گی۔ آپ اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ آپ اس گھر سے دل لگائیں یا نہ لگائیں یہ گھر آپ ہی کا ہے۔ آپ اسے استعمال کر سکتے ہیں، اس لیے لگاؤ کم کیجیے، جہاں تک ہو سکے لگاؤ ختم ہی کر دیجیے۔ اسی لگاؤ کے سبب مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ دنیا سے لگاؤ آدمی کو اپنی ذات سے محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ حُبِّ نفس، حُبِّ دنیا اور حُبِّ جاہ ہی ہے جو انسان کو ہلاکت تک پہنچاتی ہے۔ کرسی کی محبت، محراب و منبر کی محبت یہ سب دنیا ہے۔ دنیا سے لگاؤ ہے۔ یہ سب حجاب ہیں کہ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ہم بیٹھ کر یہ نہ کہنے لگ جائیں کہ جن کے پاس یہ ہے اور وہ ہے وہ لوگ دنیادار ہیں بلکہ یہ دیکھیں کہ خود ہمارے پاس جو کچھ ہے ہمیں اس سے کتنا لگاؤ ہے۔ ہمارا یہی لگاؤ اور دلچسپی ہے جس کی وجہ سے ہم دوسروں پر اعتراض کرتے ہیں۔

حُبِّ نفس

اگر حُبِّ نفس اور خود غرضی نہ ہو تو آدمی دوسروں کی عیب جوئی نہیں کرتا۔ یہ جو ہم میں سے بعض لوگ دوسروں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ ہم حُبِّ نفس کی وجہ سے اپنے آپ کو مہذب، درست اور مکمل

سمجھتے ہیں اور دوسروں کو عیب دار اور ناقص تصور کرتے ہیں اسی لیے ان میں کیڑے نکالتے ہیں۔ ایک شعر ہے، میں شعر تو نہیں پڑھوں گا کیونکہ اس پر ایک طرح سے اعتراض ہو سکتا ہے، مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تو وہی کچھ ہوں جو تو کہتا ہے مگر کیا تو بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ تو اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔

ہم یہاں جامعہ میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم یہاں خدا کے لیے آئے ہیں۔ ہم علم حاصل کرتے ہیں، ہم شریعت کا درس لیتے ہیں۔ ہم جُندُاللہ ہیں ہم نے اپنا نام جندالله رکھ لیا ہے۔ کیا ہم وہی ہیں جو ہم ظاہر کرتے ہیں؟ کم از کم ظاہر و باطن تو یکساں ہو۔

کیا نفاق اس کے سوا کسی اور چیز کا نام ہے؟ نفاق صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دیندار ظاہر کرے اور حقیقت میں ابوسفیان کی طرح دیندار نہ ہو۔ یہ بھی نفاق ہے کہ آدمی یہ کہے کہ میں ایسا ہوں اور ویسا ہوں اور دراصل وہ کچھ نہ ہو۔ ایسے لوگ منافق ہیں۔ کچھ منافقت کے اُس درجے پر ہیں اور کچھ اِس درجے پر۔ آخری بات یہ ہے کہ جب آدمی دنیا سے جائے تو اس کے متعلق یہ نہ کہا جائے کہ یہ لوگ آخرت کی طرف بُلاتے ہیں مگر دنیا کی طرف نہیں۔ انبیاء کی دعوت بھی وہاں کے لیے تھی مگر وہ دنیا میں بھی عدل و انصاف قائم کرتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو خاص الخاص اللہ والے تھے مگر فرماتے تھے۔ لیغان علی قلبی لاستغفر الله فی کل یوم سبعین مرة "اپنے دل میں کدورت آنے کے سبب میں دن میں ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں"۔ ایسے شخص کے لیے جو اپنے محبوب کے سامنے دائم الحضور رہنا چاہتا ہو غیروں

سے ملنا جلنا کدورت کا باعث ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک آدمی آپ کے پاس آتا ہے۔ بہت اچھا اور صحیح آدمی ہے۔ وہ آپ سے مسئلہ پوچھنا چاہتا ہے لیکن یہی بات آپ کو اپنے محبوب کے حضور سے باز رکھتی ہے لیکن یہی لمحے آپ کو اس مرتبہ سے جس کے آپ خواہاں ہیں، باز رکھتے ہیں۔ اگرچہ مسئلہ بتانا یا ہدایت کرنا آپ کے نزدیک محبوب کے مظاہر ہیں سے ہے لیکن آپ جو یہ چاہتے ہیں کہ اس مرتبۂ دائم الحضوری میں ہوں اُس سے یہ آپکو باز رکھتا ہے

"اپنے دل میں کدورت آنے کے سبب میں اللہ سے ہر روز ستر بار استغفار کرتا ہوں"۔ اس طرح کے الفاظ رسول اکرمؐ سے منقول ہیں مگر اس قسم کی باتوں میں پڑنا ہمارے لیے حجاب ہے اور اس حجاب سے باہر نکلنا ضروری ہے۔ کم از کم جیسا ہم اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں، ویسے ضرور نہیں۔ اگر ہمارے ماتھے پر سجدہ کا نشان ہے تو پھر ہم نماز میں دکھاوا نہ کریں۔ اگر ہم تقدس کا جامہ پہنے ہوئے ہیں تو سُود نہ کھائیں، کسی کو دھوکا نہ دیں، وغیرہ وغیرہ۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روحانی علوم آدمی کو نکما کر دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ جس شخص نے لوگوں کو ان روحانی علوم کی تعلیم دی اور جس کی مانند رسول اللہؐ کے بعد کوئی حقائق سے واقف نہیں تھا، اس نے جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی، تاریخ کے مطابق وہ اسی دن اپنا بیلچہ اٹھا کر کام پر چلا گیا۔ ان باتوں میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے۔

جو صاحبان لوگوں کو بخیالِ خویش دعا، ذکر اور اس طرح کی چیزوں سے روکتے ہیں تاکہ لوگ دنیوی کاموں میں مشغول رہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ یہ دعا وغیرہ ہی ہیں جو آدمی کو انسان

جامعہ تعلیمات اسلامی

بناتی اور اسے جینا سکھاتی ہیں تاکہ دنیا اس سے اس کے شایان شان سلوک کرے۔ انبیاءؑ جو اہلِ ذکر و فکر بھی تھے اور جو نماز اور دعا میں بھی مشغول رہتے تھے، انہوں نے ہی دنیا میں عدل قائم کیا ہے۔

ظالموں کے خلاف قیام بھی انہوں نے ہی کیا ہے۔ یہی کام حضرت امام حسینؑ نے بھی کیا۔ آپ ان کی دعائے یوم العرفہ دیکھیے کہ کیا ہے!

یہی دعائیں ان باتوں کا سرچشمہ ہیں۔ یہی دعائیں انسان کو خدا کی طرف توجہ دلاتی ہیں اور مبدائے غیبی کی طرف ملتفت کرتی ہیں۔ اگر انسان دعاؤں کو صحیح طریقے سے پڑھے تو خدا کی طرف توجہ کی برکت سے اس کا اپنی ذات سے لگاؤ کم ہو جاتا ہے لیکن اس سے اس کی کارگزاری پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا بلکہ اسکی سرگرمی بڑھ جاتی ہے لیکن اس کی یہ سرگرمی اپنے لیے نہیں ہوتی۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے بھی اسے مستعد ہونا چاہیے۔

یہ لوگ دعاؤں کی کتابوں پر جو نکتہ چینی کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیچارے ناواقف ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ یہ دعاؤں کی کتابیں کیسے انسان کی تعمیر کرتی ہیں۔ یہ دعائیں ہمارے ائمہؑ سے مروی ہیں جیسے مناجاتِ شعبانیہ، دعائے کمیل، دعائے روز عرفہ، دعائے سمات وغیرہ۔ یہ دعائیں کس طرح کے انسان بناتی ہیں؟ جو دعائے شعبانیہ پڑھتا ہے وہ تلوار بھی اٹھاتا ہے۔

روایات کے مطابق دعائے شعبانیہ سب ائمہ پڑھتے تھے۔ میں نے باقی دعاؤں کے متعلق یہ نہیں دیکھا کہ کہیں یہ آیا ہو کہ انکو سب ائمہؑ پڑھتے تھے۔ وہی جو دعائے شعبانیہ پڑھتے تھے تلوار بھی چلاتے تھے اور کفار سے جنگ بھی کرتے تھے۔ یہ دعائیں آدمی کو تاریکی سے نکالتی ہیں اور جب کوئی شخص

تاریکی سے باہر آگیا تو وہ انسان بن گیا۔ پھر وہ ہر کام خدا کے لیے کرتا ہے۔ تلوار چلاتا ہے تو خدا کے لیے، قتال کرتا ہے تو خدا کے لیے۔ قیام کرتا ہے تو خدا کے لیے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ دعائیں آدمی کو نکما اور بیکار کر دیتی ہیں۔ جو حضرات ایسی باتیں کرتے ہیں، ان کے نزدیک جو کچھ ہے یہی دنیا ہے۔ یہاں سے آگے کی ہر بات ان لوگوں کی نظر میں محض خیالی باتیں ہیں لیکن ایک وقت آئیگا جب وہ دیکھیں گے کہ وہ جن باتوں کو محض خیالی کہتے تھے حقیقی وجود ان ہی کا ہے اور در اصل خیالی باتیں وہ ہیں جن کو وہ حقیقی سمجھتے تھے، کیونکہ یہی دعائیں، یہی خطبے، یہی نہج البلاغہ اور یہی مفاتیح الجنان (یعنی یہی دعاؤں کی کتابیں) شخصیت کی تعمیر میں آدمی کی مدد کرتی ہیں۔

ہر عمل خدا کے لیے ہونا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
غالبؔ

پس جب کوئی آدمی واقعی انسان بن جاتا ہے تو وہ ان مسائل پر خود بخود عمل کرنے لگتا ہے۔ وہ کھیتی کرتا ہے لیکن اس کی کھیتی خدا کے لیے ہوتی ہے، وہ جنگ بھی کرتا ہے لیکن اس کی جنگ کفار اور ظالموں کے خلاف ہوتی ہے۔ یہی لوگ اصحاب توحید اور دعا خواں ہوتے ہیں۔ جو لوگ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام کے ہمرکاب تھے، وہ عموماً عبادت بھی خوب کرتے تھے۔

خود حضرت امیر المومنین علیہ السلام عین معرکۂ کارزار میں نماز پڑھتے تھے۔ ایک طرف جدال و قتال کا ہنگامہ برپا ہوتا تھا۔ دوسری طرف وہ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے۔ لڑتے بھی تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ جب معرکۂ کارزار گرم تھا کسی نے آپ سے کچھ پوچھا۔ آپ کھڑے ہو گئے اور توحید پر تقریر کی۔ کسی نے کہا: اس وقت بھی تقریر؟ آپ نے فرمایا: اسی کے لیے تو ہم جنگ کرتے ہیں۔ حسب روایت آپ نے کہا: ہماری جنگ دنیا کے لیے نہیں ہے۔ ہم معاویہ سے اس لیے جنگ نہیں کرتے کہ شام پر قبضہ کرلیں۔ شام کیا چیز ہے؟

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جنابِ امیر علیہ السلام تمام عراق فتح کرنے کے خواہاں نہیں تھے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ وہاں کے لوگوں کو انسان بنائیں، لوگوں کو متکبرین سے نجات دلائیں۔ یہی لوگ یہ دعائیں پڑھتے تھے۔ یہ دعائے کمیل جنابِ امیر علیہ السلام ہی سے منقول ہے۔ کمیل ہی کو دیکھ لیجئے وہ بھی تلوار چلاتے تھے۔

قلوب پر دعا کا اثر

اس لیے کہ لوگ دعا نہ کریں اور دعائیں اور دعاؤں کی کتابیں نہ پڑھیں ایک دن ان خبیث لوگوں نے جو "کسروی" جیسے شیطانوں کے پیروکار تھے، عرفان اور ادعیہ کی کتابیں اکٹھی کرکے انہیں آگ لگا دی۔ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ دعا کیا ہے اور انسان کے دل پر دعا کا کیا اثر ہوتا ہے۔ انہیں نہیں معلوم کہ سب خیرات و برکات دعا خوانوں ہی کی وجہ سے ہے۔ یہی لوگ ہیں جو کسی نہ کسی طرح دعائیں پڑھتے اور ذکر خدا کرتے ہیں۔

اگرچہ یہ لوگ توتے کی طرح پڑھتے ہیں۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے اور یہ بہر حال ان لوگوں سے بہتر ہیں جو بالکل نہیں پڑھتے۔

ایک نمازی، گو اس کی نماز کتنے ہی گھٹیا درجے کی ہو، بے نمازی سے بہر حال بہتر ہے، وہ زیادہ مہذب ہے۔ وہ چوری نہیں کرتا۔ مجرموں کی فہرست پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ان میں کتنے دینی علوم کے طلبہ ہیں اور کتنے دوسرے لوگ؟ کتنے ملاؤں نے چوری، شراب نوشی اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کیا ہے؟ البتہ اسمگلروں کے گروہ میں کچھ ملا او رصوفی صورت لوگ ہوتے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ بدمعاش نہ نماز پڑھتے ہیں اور نہ کچھ اور کرتے ہیں، انہوں نے فقط اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے ایسی صورت بنا رکھی ہے۔ جو لوگ ایسے ہیں کہ دعائیں پڑھتے ہیں اور اسلام کے ظاہری احکام پر عمل کرتے ہیں ان میں ایسے لوگ جن پہ کوئی فرد جرم عائد کی گئی ہو یا تو ہیں ہی نہیں یا بہت کم ہیں۔

ان ہی لوگوں سے اس دنیا کا نظام برقرار ہے۔ دعا کو ختم نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات غلط ہو گی کہ ہمارے نوجوانوں کی توجہ دعاؤں سے یہ کہہ کر ہٹا دی جائے کہ ان کے بجائے قرآن کی تلاوت کو رواج دیا جانا چاہیے۔ جو چیز قرآن کی راہ ہموار کرتی ہے اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے کہ قرآن پڑھنا چاہیے اور دعا اور حدیث کو چھوڑ دینا چاہیے۔

دُعا اور حدیث کے بغیر قرآن

اگر دعا اور حدیث کو چھوڑ کر قرآن کو لانے کی کوشش کی جائے تو یہ

جامعہ تعلیمات اسلامی

لوگ قرآن کو بھی نہیں لا سکیں گے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں دعائیں نہیں قرآن چاہیے وہ کبھی قرآن کو رواج نہیں دے سکتے۔ یہ سب شیطانی وسوسے اور دھوکا دہی کی باتیں ہیں۔ جو ان کو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ اہل حدیث، اہلِ ذکر اور اہلِ دعا تھے انھوں نے اس معاشرے کی زیادہ خدمت کی ہے یا انھوں نے جن میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی اور جو یہ کہتے تھے کہ محض قرآن ہی کافی ہے؟ کس نے زیادہ خدمت کی ہے؟ یہ سب خیرات و مبرات جو آپ دیکھ رہے ہیں، ان ہی مومنین کے کارنامے ہیں۔ یہ سب اوقاف جو خیرات کے لیے یا غریبوں کی دستگیری کے لیے ہیں یہ ان ہی نماز پڑھنے والوں اور قرآن پڑھنے والوں کے عطیات ہیں، دوسروں کے نہیں۔

سابقہ دور کے متمول امراء میں سے جو نمازی تھے انھوں نے ہی مدرسے قائم کیے اور ہسپتال وغیرہ بنوائے۔ یہ طریقہ ختم نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو رواج دینا چاہیے۔ لوگوں کو اس کی ترغیب دینے کی ضرورت ہے کہ وہ ایسے نیک کاموں کی طرف توجہ باقی رکھیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ دعائیں روحانی کمال حاصل کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہیں، یہ ملک کے انتظام میں بھی مدد دیتی ہیں۔ ملک کے نظم و نسق کے لیے کبھی اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی جا کر چوروں کو پکڑے اور کبھی اس کی کہ خود چوری نہ کرے۔ جو لوگ مسجدوں میں جاتے اور دعائیں کرتے ہیں وہ قانون شکنی نہیں کرتے اور امنِ عامہ میں خلل نہیں ڈالتے۔ یہ خود معاشرے کی ایک بڑی خدمت ہے۔ معاشرہ افراد سے بنتا ہے۔ فرض کیجیے اگر معاشرے میں آدھے افراد بھی ایسے ہوں جو دعا، ذکر وغیرہ میں مشغولی کے سبب جرائم سے اجتناب کریں تو کتنی اچھی بات ہے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

مثلاً ایک کاریگر ہے، وہ اپنا کام کرتا ہے، روزی کماتا ہے اور کوئی گناہ نہیں کرتا مگر جو لوگ قتل و غارتگری کرتے ہیں، انہیں روحانی امور سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اگر روحانیت سے دلچسپی ہوتی تو وہ ایسے کام نہ کرتے۔

معاشرے کی تربیت ان ہی دعاؤں وغیرہ سے ہوتی ہے۔ یہ دعائیں خدا کی اور اس کے رسول کی بتلائی ہوئی ہیں۔ اسی کو ایک جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ۔ کہہ دیجیے: اگر تمہاری دعا نہ ہو تو میرے پروردگار کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہوگی۔ اگر آپ قرآن پڑھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن خود دعا کی تعریف کرتا ہے۔ لوگوں کو دعا کی ترغیب دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر تم دعا نہ کرتے ہوتے تو ہمیں تمہاری کوئی پروا نہ ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ قرآن کو بھی نہیں مانتے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہمیں دعا نہیں چاہیے، اسے قرآن سے بھی دلچسپی نہیں یعنی وہ قرآن کو مانتا ہی نہیں۔ قرآن میں تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اُدْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ لوگوں کو چاہیے کہ مجھے پکاریں اور مجھ سے دعا مانگیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اہلِ دعا، اہلِ ذکر اور اہلِ قرآن میں شامل فرمائے!

ہم نے اب تک بسم اللہ کے بارے میں جو گفتگو کی ہے، اس سے ایک بات اور معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ بسم اللہ کی 'با' سببیت کے معنی میں نہیں، جیسا کہ اہلِ ادب کہتے ہیں۔ دراصل حق تعالیٰ کی فاعلیت میں سببیت و مسببیت اور علیت و معلولیت ہے ہی نہیں۔ خالق و مخلوق کے درمیان رشتہ کی بہترین تعبیر وہی ہے جو قرآن میں ہے۔ قرآن میں اسے کہیں تجلی سے تعبیر کیا گیا ہے تَجَلّٰى رَبُّهٗ کہیں ظہور کہا گیا ہے اور کہیں حق تعالیٰ کے متعلق کہا گیا ہے: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔ یہ معاملہ سببیت و مسببیت سے مختلف ہے کیونکہ سببیت و مسببیت میں ایک تمایل کا رجحان پایا جاتا ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ کے مناسب نہیں ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ اور موجودات کا جو رشتہ ہے اس کے لیے یہ تعبیر صحیح نہیں۔

اس لیے ہم یا تو سببیت کے معنی کو اتنی وسعت دیں کہ اس میں تجلی اور ظہور بھی شامل ہو جائیں یا پھر یہ کہیں کہ یہاں "با" سببیت کی نہیں ہے اور بسم اللہ کذا کے معنی ہیں۔ بظھورہ کذا، یا تجلّی کذا یا الحمد بسم اللہ یا کچھ اور اسی طرح کی تقدیرِ عبارت مراد لی جائے۔ اسی طرح بسم اللہ الحمد للہ کے یہ معنی نہیں کہ اسم سبب ہے اور حمد مسبب۔ بہرحال مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ مسببیت اور علیت کے الفاظ قرآن وسنت میں کہیں آئے ہوں۔ یہ ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جو فلاسفہ کی زبان پر ہے۔ اس معنی میں قرآن وسنت میں علیت اور سببیت کے الفاظ نہیں آئے بلکہ خلق، ظہور اور تجلّی وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

ایک پہلو اور بھی ہے اور اس کے بارے میں بھی ایک روایت ہے۔ یہ باء کے نیچے نقطہ کا معاملہ ہے۔ ایک روایت ہے، معلوم نہیں کہ یہ روایت کہیں آئی ہے یا نہیں۔ شواہد تو یہی ہیں کہ یہ روایت کہیں نہیں آئی۔ بہرحال ایک روایت ہے کہ حضرت امیرالمومنینؑ نے فرمایا "انا نقطة تحت الباء" کہ باء کے نیچے کا نقطہ میں ہوں۔ اگر یہ روایت واقعی کہیں آئی ہو تو اس کی تاویل یوں کی جا سکتی ہے کہ باء کے معنی ہیں ظہورِ مطلق۔ نقطہ سے مراد ہے اس کا تعینِ اول جو عبارت ہے مقامِ ولایت سے۔ اگر اس قسم کی بات کہیں آئی ہے تو ممکن ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کا مقصد یہ ہو کہ مقامِ ولایت (ولایتِ کلی کے معنی میں) ظہورِ مطلق کا تعینِ اول ہے۔ جس طرح نقطہ "باء" کا تعین کرتا ہے۔

اسم تجلّی مطلق ہے

اسم تجلّی مطلق ہے۔ اس کا اولین تعین ولایتِ احمدی وعلوی وغیرہ سے

جامعہ تعلیمات اسلامی

ہوتا ہے۔ اگر یہ بات کہیں حدیث میں نہ بھی آئی ہو جب بھی مسئلہ اسی طرح ہے۔ تجلّی مطلق کے تعینِ اوّل سے مراد وجود کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے اور وجود کا اعلیٰ ترین مرتبہ ولایتِ مطلقہ ہے۔ صورت یہ ہے کہ اسمِ الٰہی کبھی مقامِ ذات کا عنوان ہوتا ہے۔ مقامِ ذات کا جامع اسم "اللہ" ہے اور کبھی صفات کے ظہور کا جیسے رحمانیت، رحیمیت وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اسماء، اسمِ اعظم اللہ کی تجلیات ہیں۔ ان میں سے بعض اسماء مقامِ ذات کے نام ہیں، بعض اسماء تجلیاتِ فعلی ہیں۔ پہلی قسم کے اسماء کو مقامِ احدیت، دوسری قسم کے اسماء کو مقامِ واحدیت اور تیسری قسم کے اسماء کو مقامِ مشیئت کہا جاتا ہے۔ یہ سب اصطلاحات ہیں۔ سورۂ حشر کے آخر کی تین آیات میں اسماء کی شاید یہی تقسیم ہے۔

(۱) هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۲) هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۳) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ

احتمال یہ ہے کہ ان تین آیات میں اسماء کے انہی تین مقامات کی طرف اشارہ ہے۔ پہلی آیت میں وہ اسماء ہیں جو مقامِ ذات کے مناسب ہیں۔ دوسری آیت میں وہ اسماء ہیں جو تجلّی اسمی سے مناسبت رکھتے ہیں اور تیسری آیت میں وہ اسماء ہیں جو تجلّی فعلی سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اب جلوۂ الٰہی کے تین درجے ہوئے۔ ایک جلوۂ ذات برائے ذات، دوسرا جلوہ در مقامِ اسماء

اور تیسرا جلوہ در مقامِ ظہور۔ شاید هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ سے ہر دوسری ہستی کی نفی ہوتی ہے کیونکہ اول بھی وہی ہے اور آخر بھی وہی هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور جو کچھ ہے وہی ہے' یہ نہیں کہ ظہور اس سے ہے۔ وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے۔

جلوہ' جلوے والے سے جُدا نہیں

جلوے کے مراتب ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ جلوہ' جلوے والے سے الگ کوئی چیز ہو۔ گو اس کا تصور مشکل ہے لیکن تصور کے بعد اس کی تصدیق آسان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ " اللہ " اس تجلی کا نام ہو جو مقام صفات میں ہے۔ اگر ایسا ہو تو بسم اللہ میں اسم سے مراد تجلی کے مجموعی جلوے کا ظہور ہو گا۔ جن دو احتمالوں کا ہم نے پہلے ذکر کیا تھا ان کے انطباق میں اس صورت میں بھی کوئی دشواری نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے جُدا نہیں ہیں۔ ان مسائل و مباحث کے ضمن میں ایک ضروری بات یہ ہے کہ کبھی تو ہم کسی واقعہ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ ہمارا ادراک کیا کہتا ہے اور کبھی اس لحاظ سے کہ عقل کیا کہتی ہے اور کبھی اس لحاظ سے کہ دل کا تاثر کیا ہے اور کبھی ہم اصل واقعہ کو مقامِ شہود میں دیکھتے ہیں۔ سب روحانی امور کا یہی حال ہے۔

ہمارے ادراک کی آخری حد یا تو ادراکِ عقلی ہے یا ادراکِ بُرہانی یا نیم بُرہانی۔ ہم واقعہ کا ادراک اپنی عقل کے مطابق کرتے ہیں۔ ان مسائل میں ایک

جامعہ تعلیمات اسلامی

ورجہ یہ ہے کہ ہم بس اتنا سمجھ لیں کہ اللہ کی ذات مقدس اور اس کا جلوہ ہے۔ ہم جس طرح بھی ادراک کریں' آخر میں بات یہیں تک رہتی ہے۔

اصل حقیقت صرف ذاتِ مقدس اور اسکا جلوہ ہے

اصل مسئلہ صرف ذاتِ مقدس اور اس کے جلوے کا ہے۔ رہی یہ بات کہ مقامِ ذات' مقامِ صفات یا مقامِ فعل میں اس کی تجلی کی نوعیت کیا ہے تو جو آیات ہم نے نقل کی ہیں' ان سے اتنا ہی پتا چلتا ہے کہ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۔مسئلہ کی حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے مقابل کوئی دوسرا وجود نہیں۔ وجودِ مطلق کے مقابل کسی وجود کا ہونا ہے بھی بے معنیٰ بات۔ ہم کبھی کبھی اپنے ادراک کے مطابق کچھ حساب لگاتے ہیں کہ ہمارا اپنا ادراک کیا ہے' ہماری عقل کیا کہتی ہے اور کیا ہمارا ادراکِ عقلی ہمارے دل میں اس حد تک جاگزیں ہو گیا ہے کہ نہیں کہ اس کا نام ایمان ہو جائے اور آیا ہم نے اپنا روحانی سفر شروع کر دیا ہے یا نہیں کہ اس کا نام عرفان یا معرفت ہو جائے۔ اسی طرح اور جو کچھ انسان کے بس میں ہو۔ بہر حال یہ معاملہ واقعات کی نسبت ہمارے ادراک کا ہے۔

اصل حقیقت جو کچھ ہے' وہی ہے

غور کرنے سے حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو کچھ ہے' وہی ہے۔ اس کا جلوہ بھی خود وہی ہے۔ ہم کوئی ایسی مثال نہیں دے سکتے جو اصل حقیقت پر منطبق ہو جائے۔ ظل اور ذی ظل (سایہ اور جس کا

جامعہ تعلیمات اسلامی

سایہ ہو) کی مثال بھی ناقص ہے۔

ذات اور جلوے کی مثال دریا اور موج کی ہے

شاید سب مثالوں سے نزدیک ترین مثال دریا اور موجِ دریا کی ہے۔ موج دریا سے الگ نہیں لیکن موج تو دریا ہے لیکن دریا موج نہیں ہے جب دریا متموج ہوتا ہے تو اس میں موجیں اٹھتی ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں دریا اور اس کی موجیں الگ الگ محسوس ہوتی ہیں لیکن موج ایک عارضی چیز ہے کہ وہ پھر دریا میں مل جاتی ہے۔ دراصل دریا کے علاوہ کوئی چیز نہیں دریا کی موج بھی دریا ہی ہے۔ یہ دنیا بھی ایک موج کی طرح ہے۔

بہرحال یہ مثال بھی اسی قسم کی ہے جس کے متعلق کسی نے کہا ہے کہ:

خاک بر فرقِ من و تمثیلم

دراصل کوئی مثال ہے ہی نہیں۔ ہم اپنے ادراک کے مطابق ان مسائل پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ ایک تو ان مسائل کے کلی تصورات ہیں جیسے اسمِ ذات' اسمِ صفات' اسمِ افعال اور فلاں فلاں مقام۔ یہ سب مفہوم ہیں جن کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ادراک کے بعد ان مفہوموں کو دلیل اور برہان سے ثابت کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔ اس کا ثبوت دیا جائے کہ حق تعالیٰ کی ذات اور اس کا جلوہ الگ الگ نہیں ہیں۔ جب اس امر کے دلائل دیے جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ خالص وجود ہے' وجودِ مطلق ہے اور وجودِ مطلق بلا تعیین ہے۔ اس کے وجود کے ساتھ کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی اور نہ کسی طرح اس کا تعیین کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر وجود کسی طرح محدود

ہو یا اس میں کوئی نقص ہو تو وہ وجودِ مطلق نہیں ہو سکتا۔ وجودِ مطلق وہی ہے جس کا تعین نہ ہو اور جس میں کوئی نقص اور کمی نہ ہو۔ جب وجودِ مطلق ہر طرح کے نقص اور تعین سے مبرا ہو گا تو لامحالہ تمام وجود ہو گا۔ "تمام" بھی ناقص ہے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں کسی حیثیت سے کوئی کمی ہو۔ وجودِ مطلق کے تمام اوصاف بھی مطلق ہیں، متعین نہیں۔ نہ اس کی رحمانیت ایک متعین رحمانیت ہے، نہ اس کی رحیمیت ایک متعین رحیمیت ہے اور نہ اس کی الوہیت ایک متعین الوہیت ہے۔

کسی بھی کمال کے فقدان کے معنی تعین ہیں

جب وہ نورِ مطلق اور وجودِ بلا تعین ہے تو یہ بھی لازمی ہے کہ وہ سب کمالات کا جامع اور مستجمع جمیع الصفات ہو کیونکہ کسی بھی کمال کے فقدان کا نتیجہ تعین ہے۔ اگر مقامِ ذاتِ ربوبیت میں ایک نقطہ یا شوشہ کی بھی کمی یا عیب ہو تو اس پر مطلق کا اطلاق نہیں ہو گا۔ اس صورت میں حق تعالیٰ کی ذات ناقص ہو جائے گی اور جب ناقص ہو جائے گی تو ممکن ہو گی نہ کہ واجب۔ واجب کے لیے کمالِ مطلق اور جمالِ مطلق ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ جب ہم اپنی ناقص عقل کے مطابق اللہ کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ نام ہے اس ذاتِ مطلق کا جس کے سب جلوے ہیں، جو جامع جمیع اسماء وصفات اور جامعِ جمیع کمالات ہے۔ وہ کمالِ مطلق اور کمالِ بے تعین ہے اور چونکہ کمالِ مطلق اور کمالِ بے تعین ہے اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں کسی چیز کی کمی ہو ورنہ تو وہ ممکن ہو جائیگا۔ واجب

نہیں رہے گا۔ ممکن اسی کو کہتے ہیں جو ناقص ہو۔ ممکن خواہ کسی بھی مرتبہ کمال کو
کیوں نہ پہنچ جائے، جب مطلق نہیں تو ممکن ہی رہے گا۔ وجود مطلق مستجمع
جمیع الصفات اور واجد جمیع الکمالات ہے۔ دلیل کہتی ہے کہ صرف الوجود
کل الاشیاء ولیس بشیءٍ منہا۔ وہ وجودِ خالص ہے سب کچھ ہے
لیکن بغیر تعین کے۔ سارے وجود اسی کے ہیں لیکن بہ طریق تعین نہیں بلکہ بہ
طریق کمالِ مطلق۔ چونکہ اس کے اسماء اس سے جُدا نہیں اس لیے اس کے
اسمائے صفات بھی اسمائے ذات ہی ہیں۔ وہ سب خصوصیات جو اللہ میں
ہیں رحمان میں بھی ہیں۔ رحمان بھی چونکہ کمال مطلق اور رحمتِ مطلق ہے اس
لیے اس میں بھی وجود کے سب کمالات ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ مطلق نہیں ہوگا۔
قرآن شریف میں ہے: اُدْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ اللہ کہہ کر پکارو
یا رحمان کہہ کر۔ ایک دوسری آیت میں ہے: اَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ
الْحُسْنٰى۔ جس نام سے بھی پکارو اس کے سب ہی نام اچھے ہیں۔ اللہ ہو
یا رحمان ہو یا رحیم ہو یا باقی نام، سب نام اچھے اور پیارے ہیں۔ تمام اسمائے
حسنیٰ حق تعالیٰ کی سب صفات کے جامع ہیں۔ چونکہ وہ مطلق ہے اس لیے
کسی طرح محدود نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اسم اور مسمّٰی یا ایک نام اور دوسرے
نام میں کسی طرح مغایرت ہو۔

حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ ان ناموں جیسے نہیں جو ہم مختلف چیزوں کے
مختلف اعتبار سے رکھ لیتے ہیں۔ اس کے نور و ظہور کی بھی یہ شکل نہیں کہ ایک
لحاظ سے نور ہو اور ایک لحاظ سے ظہور۔ ظہور بعینہٖ نور ہے اور نور بعینہٖ ظہور۔
اگرچہ یہ مثال بھی ناقص ہے۔ وجودِ مطلق کمالِ مطلق ہے اور کمالِ مطلق ہر لحاظ

جامعہ تعلیمات اسلامی

سے مطلق ہے۔ اس کے سب اوصاف علی الاطلاق ہیں۔ اس کی ذات اور صفات میں کسی طرح کی جدائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مشاہدہ کا قدم دلیل و برہان سے آگے ہے

عام طور پر بات بات پر کہا جاتا ہے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں یا دلیل یہ کہتی ہے۔ ایک عارف نے بھی کہا ہے: میں جہاں بھی گیا' یہ اندھا بھی اپنی لاٹھی لیکر وہاں آ گیا۔ اندھے سے اس عارف کی مراد شیخ الرئیس بوعلی سینا تھے۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جو دلائل کی مدد سے حقیقت کا ادراک کرتا ہے' اس کی مثال اندھے کی سی ہے جو اپنی لاٹھی کی مدد سے راستہ تلاش کرتا ہے۔ میں نے یہ دیکھا کہ میں جہاں بھی مشاہدہ اور عرفان کی مدد سے پہنچا یہ اندھا بھی اپنی لاٹھی کھڑکھڑاتا ہوا آ پہنچا۔ کہتے ہیں کہ اندھے سے مراد بوعلی سینا ہے اور لاٹھی سے مراد دلیل و برہان ہے۔

اہل برہان اندھے ہیں

اہل برہان اندھے اس لیے ہیں کہ انھیں مشاہدہ کی قوت حاصل نہیں۔ اگرچہ انھوں نے بھی توحیدِ مطلق اور وحدت مطلق کے مسائل کو دلائل کی مدد سے ثابت کیا ہے۔ وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ مبداءِ وجود کمالِ مطلق ہے۔ پھر بھی معاملہ دلیل و برہان کا ہے اور دلیل کی دیوار کے پسِ پشت اہل برہان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کوشش سے قلب اس کا ادراک کرتا ہے کہ واجب الوجود صرف الوجود اور کل شئی ہے۔ قلب کی مثال بچے کی سی رہتی ہے۔ بات کو سمجھانے

جامعہ تعلیمات اسلامی

کے لیے ایک ایک لفظ کا لقمہ اس کے منہ میں دینا پڑتا ہے۔ جو شخص دلائل کی مدد سے مسائل کا عقلی ادراک کرتا ہے اسے دل میں بٹھانے کے لیے تکرار اور مجاہدہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایمان' ادراکِ قلبی کا نام ہے

جب دل نے یہ بات قبول کر لی کہ اللہ تعالیٰ صرف الوجود اور کل الکمال ہے تو اب یہ ایمان بن گیا۔ پہلے یہ ادراکِ عقلی تھا۔ دلیل دبرہان سے ادراکِ عقلی حاصل ہوا۔ دل میں مفہوم کا ایک تصور قائم ہوا۔ جب دل نے حقیقت کو قبول کر لیا' خواہ عقلی دلائل سے یا قرآنی تعلیم سے تو پھر اسی کا نام ایمان ہو گیا۔ عقل نے ایک بات معلوم کی اور پھر دل کو سکھائی۔ جب تکرار اور ریاضت سے دل میں یہ راسخ ہو گیا کہ لَيْسَ فِي الدَّارِ غَيْرُهٗ دَيَّارٌ۔ یعنی خدا کے سوا اس جہان میں کچھ ہے نہیں' تو یہی ایمان ہے۔ یوں تو لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ کا درجہ بھی انبیاءؑ کے مشاہدہ سے کم ہے۔ یہ بھی ایک درجہ ہے لیکن حق تعالیٰ کے جمال کا مشاہدہ اس سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تجلی ہوئی تھی تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں جو امور قابلِ غور ہیں ان میں تیس دن' پھر چالیس دن اور اس کے بعد کے واقعات ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے خسر حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چلے تو انھوں نے کچھ دُور جا کر اپنی بیوی سے کہا: اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا۔ یہ آگ جس کا احساس انھیں ہوا تھا' اُن کے بیوی بچوں نے قطعاً نہیں دیکھی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے

کہا میں جاتا ہوں، تمہارے لیے آگ کا ایک شعلہ لے آؤں گا۔ لَّعَلِّیٓ اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡهَا بِقَبَسٍ شاید میں تمہارے لیے اس کا ایک شعلہ لا سکوں۔

جب وہ آگ کے قریب پہنچے تو ندا آئی۔ اِنِّیٓ اَنَا اللّٰہُ یہ اسی آگ میں سے آواز آئی تھی جو درخت میں لگی ہوئی تھی۔ یہ مشاہدہ تھا۔ جہاں اندھا اپنی لاٹھی کے سہارے سے پہنچا تھا اور عارف اپنے دل کی مدد سے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی کا مشاہدہ کر لیا۔

یہ کہنے سننے سے اونچی باتیں ہیں

یہ باتیں ہم کہتے ہیں اور آپ سنتے ہیں لیکن حقائق اس سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔ اِنِّیٓ اَنَا اللّٰہُ۔ جو نور درخت میں تھا اسے سوائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا جیسا کہ جو وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر آتی تھی کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کیا ہے؟ وحی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں تھی۔ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر نازل ہوتا تھا۔ پورا قرآن یکبارگی آپ کے قلب پر نازل ہو جاتا تھا۔ کس طرح؟ کون جانے۔ اگر قرآن یہی ہے تیس پارے، تو کسی معمولی دل پر تو ایک دفعہ میں نازل نہیں ہو سکتا۔

دل کا بھی کچھ اور ہی مسئلہ ہے

دل کا بھی کچھ اور مسئلہ ہے۔ قرآن ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت قلب

پروردہ ہوتی ہے۔ قرآن ایک راز ہے۔ راز در راز۔ ایک سربستہ راز۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ اپنے ارفع مقام سے نیچے اترے تاکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پر نازل ہو سکے۔ پھر اور نیچے اُترے تاکہ اسے دوسرے بھی سمجھ سکیں۔ انسان کا بھی یہی حال ہے۔ انسان بھی ایک راز اور سربستہ راز ہے۔ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے، اس کے لحاظ سے تو انسان محض ایک جانور ہے اور جانور بھی ایسا کہ دوسرے جانوروں سے بدتر، لیکن اس جانور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ انسانیت تک پہنچ سکتا ہے۔ کمال کے مدارج طے کر کے کمالِ مطلق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور وہ کچھ بن سکتا ہے جو ہمارے وہم و گمان میں بھی مافوق ہے۔ پھر عدم کا راستا لیتا ہے۔

جو کچھ ہم محسوس کرتے ہیں وہ سب اعراض یا کیفیات ہیں

پورا انسان ایک راز ہے۔ اس دنیا میں ظاہر میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ ہم اجسام کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ہم جوہر کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ہم جس چیز کا ادراک کرتے ہیں وہ جوہر نہیں عرض ہوتی ہے مثلاً ہماری آنکھیں رنگ اور اسی قسم کی چیزیں دیکھتی ہیں، ہمارے کان آواز سنتے ہیں، ہماری زبان ذائقہ محسوس کرتی ہے اور ہمارے ہاتھ چیزوں کو چھوتے ہیں۔ یہ سب ظاہری چیزیں ہیں۔ اعراض ہیں۔ اصل جسم کہاں ہے؟ جب ہم کسی چیز کا بیان کرتے ہیں تو اس کے عرض، طول اور عمق کا ذکر کرتے ہیں۔ عرض طول اور عمق بھی اعراض ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس چیز میں کشش ہے۔ کشش بھی ایک عرض ہے۔ ہم جب کسی چیز کو بیان کرنے کے لیے اس کے

جن اوصاف کا بھی تذکرہ کریں گے وہ سب عرض ہی ہوں گے۔ پھر خود جسم کہاں ہے؟ جسم بھی ایک راز ہے۔ احدیت کے راز کا سایہ۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ محض اسماء و صفات ہیں ورنہ یہ عالم سرتاسر عالمِ غیب ہے۔ شاید اسی مفہوم کے ایک درجے کو غیب و شہادت سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس کائنات میں غیب و شہادت ساتھ ساتھ ہیں۔ جو چیزیں ہم سے غیب ہیں یعنی جن کا ہم ادراک نہیں کر سکتے وہی غیب ہیں۔ جس چیز کی بھی ہم تعریف کرنا چاہیں، سوائے اس کے اسماء، اوصاف اور آثار وغیرہ بیان کرنے کے اور کیا کر سکتے ہیں؟ جو چیز کہ خلِّ سِرِّ مطلق ہے اس کا بشر ادراک نہیں کر سکتا کیونکہ انسانی ادراک ناقص ہے۔ البتہ وہ ادراک کر سکتا ہے جو ولایت کے ذریعہ اس مرتبہ پر پہنچ گیا ہو جہاں حق تعالیٰ کی تجلی پورے طور پر اس کے قلب پر پڑ رہی ہو۔ یہ غیب و شہادت کا سوال ہر جگہ موجود ہے اس لیے اس طرح کی تعبیریں سب کی زبان پر ہیں جیسے عالمِ غیب، عالمِ ملکوت، عالمِ عقول وغیرہ۔

رسولِ اکرمؐ اسمِ اعظم ہیں

اللہ تعالیٰ کے تمام نام ایک راز بھی ہیں اور ظاہر بھی ہیں۔ ان کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ یہی مفہوم ہے۔ هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ کا۔ جو ظاہر ہے وہ باطن بھی ہے اور جو باطن ہے وہ ظاہر بھی ہے۔ اس بنا پر حق تعالیٰ کے تمام اسماء میں وجود کے سب مراتب ہیں۔ ہر اسم میں تمام اسماء کا مفہوم شامل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ رحمان ایک صفت یا ایک اسم ہو،

اور رحیم اس سے الگ اور اس کے مقابل ایک اسم ہو۔ اسی طرح منتقم ایک علیحدہ اسم ہو۔ یہ تمام اسماء ہر چیز پر حاوی ہیں۔

اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى. تمام اسمائے حسنیٰ رحمان کے بھی ہیں، رحیم کے بھی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک نام کا ایک مطلب ہو اور دوسرے نام کا کچھ اور مطلب۔ اگر ایسا ہو تو رحمان حق تعالیٰ کی ذات کی ایک حیثیت کا بیان ہوگا اور مثلاً رحیم کسی دوسری حیثیت کا۔ اسطرح حق تعالیٰ کی ذات مجمع حیثیات ہو جائیگی۔ وجودِ مطلق میں یہ چیز محال ہے۔ وجودِ مطلق کی مختلف حیثیتیں نہیں ہوتیں۔ وجودِ مطلق اسی وجودِ مطلق کے لحاظ سے رحمان بھی ہے اور رحیم بھی۔ اسکی تمام ذات رحمان ہے اور تمام ذات رحیم۔ تمام ذات نور ہے اور تمام ذات اللہ۔ ایسا نہیں ہے کہ اسکی رحیمیت کچھ چیز ہو اور رحمانیت اس سے مختلف کچھ اور۔ جو شخص معرفت کے ذریعے سے اس بلند ترین مقام تک پہنچے کہ خود ذاتِ حق، نہ کہ محض اسکا جلوہ اس شخص کے قلب پر متجلّی ہو تو وہ خود بھی اسم اعظم ہوگا اور اسم اعظم کے جلوے سے متجلی بھی۔ یہ وہی قلب ہو سکتا ہے کہ جس پر قرآن نازل ہوا ہو، جو وحی کا سرچشمہ ہو اور جس میں جبرئیلؑ آتے رہے ہوں۔ ایسے قلب پر جو جلوہ ہوگا وہ تمام جلووں پر محیط ہوگا۔ یہ اسمِ اعظم خود رسولِ پاکؐ کی ذات ہے۔ نَحْنُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى رسولِ خداؐ مقامِ تجلی میں اعظم الاسماء ہیں۔

ہمارے وجود بھی تجلّی ہیں

جن موضوعات پر آج کی صحبت میں گفتگو ہوئی ان میں ایک مسئلہ تو سببیت کا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ کے بارے میں سببیت کا سوال اٹھانا

غلط ہے۔ اس کی ہمیں کوئی مثال نہیں ملتی سوائے دُور دراز کی بعض مثالوں کے۔ ایک مسئلہ نقطہ تحت الباء کا تھا۔ اگر یہ روایت واقعی کہیں آئی ہو تو میں نے اس کے متعلق کچھ عرض کیا تھا۔ اس کے علاوہ اسم بہ مراتب اسم ذات، اسم درمقام صفات، اسم درمقام تجلیِ فعلی، تجلیِ ذات برذات، تجلیِ ذات برصفات، تجلیِ ذات برموجودات (تجلی برموجودات نہیں) جیسے مسائل بھی زیر بحث آئے۔ جب ہم لوگ تجلی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارا وجود بھی ایک تجلی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ یہاں سو آئینے رکھ دیجیے۔ ہر آئینے میں اسی ایک سورج کی روشنی منعکس ہوگی۔ ایک لحاظ سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سو روشنیاں ہیں مگر دراصل ہر آئینے میں وہی ایک روشنی ہے۔ اسی ایک سورج کا جلوہ ہے جو سو آئینوں میں نظر آرہا ہے مگر چونکہ سورج کی روشنی محدود ہے اس لیے یہ مثال بھی دُور دراز کی ہے۔

تعینات جلوے کا لازمی نتیجہ ہیں

تمام تعینات یعنی محدود اور متعین موجودات میں حق تعالیٰ ہی کا جلوہ اور نور ہے۔ وہی ایک نور سب موجودات میں جلوہ فگن ہے۔ یہ نہیں کہ ہر متعین موجود کے لیے ایک الگ نور ہو۔ تعینات، نور کے جلوۂ فعلی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اس صورت میں بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ میں اسم سے مراد مقام ذات کا اسم ہے اور اللہ جلوۂ ذات ہے جس میں تمام جلوے شامل ہیں۔ اس جامع جلوے ہی کا نام اللہ ہے۔ رحمان اور رحیم بھی اسی جامع جلوے کے نام ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ رحمان اس کی ایک صفت کا نام ہو اور رحیم

دوسری صفت کا 'بلکہ اللہ' رحمان اور رحیم تینوں ایک ہی جلوے کے نام ہیں۔ سب ایک ہی جلوہ ہے۔ وہی مکمل جلوہ ذات اللہ بھی ہے' رحمان بھی اور رحیم بھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت ممکن ہی نہیں' کیونکہ اگر یہ صورت نہ ہو تو حق تعالیٰ کی ذات محدود ہو جائے گی اور محدود ہوگی تو ممکن ہو جائیگی' واجب نہیں رہے گی۔

اس تفصیل کے مطابق جو ہم نے ابتدا میں حمد کے متعلق عرض کی تھی" حمد اللہ کی ہوگی"۔ اللہ حق تعالیٰ کے جامع ظہور یا جامع جلوے کا نام ہے۔ رحمان اور رحیم بھی بعینہٖ اسی جامع جلوے کا نام ہیں۔ حمد سے مراد ہر حمد بھی ہو سکتی ہے اور حمدِ مطلق بھی۔ اسم "اللہ" کے متعلق تین احتمال ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کے جلوۂ جامع کا نام مقام ذات میں بھی ہو سکتا ہے۔ مقام صفات میں بھی (جسے مشیتِ مطلق کہتے ہیں اور ہر چیز اسی سے ہوتی ہے) اور مقامِ فعل میں بھی۔ جب ہم ان احتمالاتِ مختلف کو مثلاً بسم اللہ کی آیت پر منطبق کرتے ہیں تو ہر احتمال کی صورت میں ایک خاص طرزِ کلام ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پہ ہم نے "اللہ" کے متعلق گفتگو کی جو ایک اسم جامع ہے مقام ذات میں بھی' مقام صفات میں بھی اور مقامِ تجلیِ فعلی میں بھی۔ ہم نے بسم اللہ پر گفتگو کرتے ہوئے اسم' اللہ' باء اور نقطہ کے متعلق عرض کیا اور رحمان اور رحیم کے متعلق چند بہت ہی مختصر مگر ضروری باتیں بیان کیں۔

یقین ضروری ہے

ہمیں امید ہے کہ اس طرح کے مسائل پہ بحث کی ضرورت کا اعتراف

کیا جائے گا۔ بعض لوگ اس کا بالکل ہی انکار کرتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو سرے سے عرفانی مسائل کے ہی منکر ہیں۔ جو لوگ ابھی حیوانیت کی منزل میں ہیں انھیں یقین نہیں آسکتا کہ اس منزل سے ماوراء بھی کچھ ہے جس کے وہ ابھی قائل نہیں۔ ہمارے لیے روحانی امور پر یقین ضروری ہے۔ یہی پہلا مرحلہ ہے اس کا کہ انسان اپنے آپ کو حرکت میں لائے۔ پہلی بات یہ ہے کہ آدمی انکار نہ کرے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی ہر بات کا انکار کردے جو اسے معلوم نہ ہو۔ غالباً شیخ الرئیس بوعلی سینا کا قول ہے کہ جو شخص بغیر کسی دلیل کے کسی بات کا انکار کرتا ہے وہ فطرتِ انسانی سے خارج ہے۔

عقیدہ کی بنیاد دلیل پر ہونی چاہیے

جس طرح کسی چیز کا ثبوت دلیل کا محتاج ہے اسی طرح کسی بات سے انکار کے لیے بھی دلیل کی ضرورت ہے ورنہ یہ کہو کہ مجھے معلوم نہیں لیکن کچھ ضدی طبیعتیں ایسی ہیں کہ وہ ہر چیز کا انکار کردیتی ہیں۔ چونکہ یہ لوگ سمجھتے نہیں اس لیے فطرتِ انسانی سے خارج ہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ اگر کسی چیز کو تسلیم کرے تو دلیل سے تسلیم کرے اور اگر رد کرے جب بھی دلیل سے رد کرے ورنہ یہ کہدے کہ مجھے معلوم نہیں اور چونکہ میں نہیں جانتا اس لیے ممکن ہے ایسا ہو اور ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ جو کچھ سنو اس کے متعلق یہ ضرور مانو کہ ممکن ہے صحیح ہو اور ممکن ہے کہ صحیح نہ ہو لیکن انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے؟ اس عالم کے ماوراء تک ہماری رسائی نہیں ہے۔ خود اس دنیا کے

متعلق بھی ہماری معلومات ناقص ہیں۔ کچھ مسائل اس وقت معلوم ہیں۔ بعد میں کچھ اور مسائل ظاہر ہوں گے۔ اب سے سو سال پہلے تک یہ دنیا کتنی نامعلوم تھی۔ اس میں کتنی باتیں ایسی تھیں جن کا کسی کو علم نہیں تھا۔ اب بہت سی باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ آئندہ اور بہت سی باتوں کا انکشاف ہو گا۔ ابھی تک ہم اس کائنات کو نہیں سمجھے۔ انسان اس کائنات کا ادراک نہیں کر سکا ہے پھر اولیاء کے مشاہدات کا انکار کیوں کرتا ہے؟ جو شخص حقائق و معارف کا انکاری ہے، اس کا دل حقائق و انوار کی تجلی سے محروم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ جو کچھ اہلِ معرفت کہتے ہیں، اس کے متعلق کہتا ہے کہ یہ سب من گھڑت باتیں ہیں۔ چونکہ وہ خود محروم ہے اس لیے ان باتوں کو من گھڑت بتلاتا ہے۔ اس کے دل میں یہی ہے کہ یہ باتیں من گھڑت ہیں۔ مگر یہ باتیں تو قرآن میں بھی ہیں۔ ان کے متعلق اسے ایسا کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ جن باتوں کو وہ من گھڑت کہتا ہے وہ قرآن و سنت ہی سے ماخوذ ہیں، پھر انکار کرنے کی وجہ کیا ہے؟

جو بات معلوم نہ ہو اُسکا انکار کُفر ہے

یہ بھی کفر کا ایک درجہ ہے، گو شرعی کفر نہ ہو لیکن کفران تو ہے ہی کہ آدمی کو جو چیز معلوم نہ ہو اس کا انکار کر دے۔ انسان کی مصیبتوں کی جڑ یہی ہے کہ جب وہ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا تو ان کا انکار کر بیٹھتا ہے۔ وہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا جہاں تک اولیاء پہنچے ہیں،

جامعہ تعلیمات اسلامی

اس لیے وہ ان کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ کفر جحودی کی بدترین قسم ہے۔ پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی اس بات کا انکار نہ کرے جو کتاب وسنت میں آئی ہے جس کا اولیاء اقرار کرتے ہیں جس کے عرفاء اپنے ادراک کے مطابق قائل ہیں اور جس کا فلاسفہ کو اعتراف ہے۔ اگر خود اس نے درک نہیں کیا ہے تو کہدے کہ مجھے معلوم نہیں۔ مگر یہ مردود تو کہتا ہے کہ جب تک میں اپنے تیز نشتر سے خدا کو چیر پھاڑ کر نہیں دیکھ لوں گا میں تو مانوں گا ہی نہیں۔ یہ جحود ہے جو اللہ کو بھی اپنے نشتر کے نیچے دیکھنا چاہتا ہے۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ جو باتیں انبیاءؑ اور اولیاء نے بتلائی ہیں ہم ان کا انکار نہ کریں۔ اگر شروع ہی میں انکار کردیں گے تو اگلا قدم اٹھا ہی نہیں سکتے۔ جو شخص اس کا منکر ہے کہ کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے، وہ اصلاً جستجو ہی نہیں کریگا۔ جو آدمی آگے بڑھنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے اس بھول بھلیاں سے نکلے۔ سب سے پہلے تو وہ اس کا اعتراف کرے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ باتیں صحیح ہوں۔ اگر انکار کرے گا تو یہ انکار کی دیوار ہمیشہ کے لیے اس کا راستا روک دے گی۔ پھر خدا سے دعا کرے کہ خدا اس کے لیے کوئی ایسا راستا کھول دے جس سے وہ وہاں پہنچ جائے جہاں اسے پہنچنا چاہیے۔

ہم کتاب وسنت کا انکار نہ کریں

اگر آدمی انکار نہیں کریگا اور دعا کرے گا کہ اس کے لیے راستا کھل جائے تو خدا اسے محروم نہیں رکھے گا اور آہستہ آہستہ راستہ کھل جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ ہماری یہ حالت نہیں ہوگی اور ہم کتاب وسنت کا انکار

نہیں کریں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ آدمی کتاب وسنت کا تو قائل ہوتا ہے لیکن جب کتاب وسنت میں وارد کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہیں آتی تو زیادہ سے زیادہ وہ وہاں یہ نہیں کہتا کہ ایسا نہیں ہے لیکن جب کوئی دوسرا شخص اس سے یہ کہتا ہے کہ کتاب وسنت میں یہ آیا ہے اسوقت وہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے معلوم نہیں بلکہ اسے لغو بتلاتا ہے۔

مطلق انکار راستے کا پتھر ہے

مطلق انکار آدمی کو بہت سے مسائل سے محروم کر دیتا ہے اور اس کے راہِ راست پر چلنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ جن باتوں کی اولیاء نے کشفی تصدیق کی ہے ان کے متعلق کم ازکم یہ احتمال تو دیجیے کہ ممکن ہے یہ درست ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص صریحاً نہ کہے کہ ممکن ہے لیکن یہ کہ آدمی قطعی انکار کر دے اور یہ کہے کہ یہ مسائل ہیں ہی نہیں، یہ لغویات ہیں۔ ایسا آدمی پھر آگے بڑھتے ہیں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اگر کامیابی حاصل کرنی چاہتا ہے تو اپنے دل سے انکار کو نکال پھینکے اور پھر قدم آگے بڑھائے۔

ہم جحود کو دل سے نکال دیں

مجھے امید ہے کہ ہم اس تکذیب کے حجاب کو اپنے دل سے دُور کر دیں گے اور خدائے تبارک وتعالیٰ سے التجا کریں گے کہ ہمیں قرآن کی زبان سے یعنی جس زبان میں کہ قرآن نازل ہوا ہے اور جو ایک خاص طرح کی زبان

جامعہ تعلیمات اسلامی

ہے اس سے آشنائی بخشے۔ قرآن بھی انسان کی طرح گوناگوں صلاحیتوں کا حامل ہے۔ قرآن ایک دستر خوان ہے جو خدا نے ہمارے لیے بچھایا ہے۔ یہ ایک بہت وسیع دستر خوان ہے جس سے ہر شخص اپنی خواہش کے موافق غذا حاصل کر سکتا ہے۔ اگر آدمی بیمار نہ ہو اور اسکی بھوک جاتی نہ رہی ہو کیونکہ دل کے امراض میں بھوک نہیں رہتی ہاں یہ ایک وسیع دستر خوان ہے، جس سے سب استفادہ کر سکتے ہیں جس طرح یہ دنیا ایک وسیع دستر خوان ہے جس سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کوئی گھاس کھاتا ہے تو کوئی میوے۔ کوئی کسی طرح استفادہ کرتا ہے اور کوئی کسی طرح۔ انسان ایک طرح سے استفادہ کرتا ہے تو حیوان دوسری طرح اور جو انسان حیوانیت کے درجے میں ہیں، وہ کسی اور طرح سے۔ جوں جوں سطح بلند ہوتی جاتی ہے، اس خدائی دستر خوان سے جو وجود سے عبارت ہے، استفادہ کا طریقہ بھی بہتر ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن بھی ایک وسیع دستر خوان ہے جو سب کے لیے بچھا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی بھوک اور خواہش کے مطابق اس سے فائدہ اٹھانے کی راہ نکال سکتا ہے۔ اعلیٰ ترین استفادہ اس سے مخصوص ہے جس پر یہ نازل ہوا تھا اور جو اس کا اولین مخاطب ہے۔ اِنَّمَا یَعْرِفُ الْقُرْاٰنَ مَنْ خُوْطِبَ بِہٖ۔

نبوّت کا قطعی انکار

لیکن ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اس دستر خوان سے ہم بھی بہرہ اندوز ہوں۔ اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے ہم یہ خیال دل سے نکال ڈالیں کہ طبیعی اور مادی مسائل کے سوا کسی چیز کا وجود ہی نہیں اور قرآن فقط ان ہی طبیعی اور اجتماعی مسائل کو بیان کرنے کے لیے

جامعہ تعلیمات اسلامی

آیا ہے اور اس کا تعلق صرف دنیوی زندگی سے ہے۔ ایسا خیال نبوت کا قطعی انکار ہے۔ قرآن انسان کو انسان بنانے کے لیے آیا ہے اور یہ سب ذریعہ ہے ایک مقصد کے حصول کا۔

دعائیں اور عبادتیں ذریعہ ہیں

تمام عبادات بھی ذریعہ ہیں۔ تمام دعائیں بھی ذریعہ ہیں اور یہ سب ذریعہ ہیں اس مقصد کا کہ انسان کے اصل جوہر کھلیں۔ انسان میں جو صلاحیتیں خفتہ ہیں وہ بیدار ہو جائیں۔ انسان انسانیت کے مرتبہ تک پہنچ جائے۔ انسانِ بالقوہ انسانِ بالفعل بن جائے۔ طبیعی انسان خدائی انسان بن جائے تاکہ اس کی ہر چیز خدائی ہو جائے۔ وہ جو کچھ دیکھے اور سمجھے' حق دیکھے اور سمجھے۔ انبیاءؑ اسی لیے آئے ہیں۔ وہ بھی ایک ذریعہ ہیں۔ انبیاءؑ اس لیے نہیں آئے کہ وہ حکومت قائم کریں۔ انہیں حکومت کا ہے کے لیے چاہیے تھی حکومت بھی اپنی جگہ ہے لیکن یہ بات نہیں کہ انبیاءؑ فقط دنیا کا انتظام کرنے آئے تھے۔ حیوانات کی بھی دنیا ہے' وہ بھی اپنی دنیا کا نظم و نسق چلاتے ہیں۔

عدل حق تعالیٰ کی صفت ہے

جو چشمِ بصیرت رکھتے ہیں ان کی نظر میں عدل کی بحث حق تعالیٰ کی ایک صفت کی بحث ہے۔ عدلِ الٰہی کا انصرام بھی انبیاءؑ کا ایک کام ہے۔ وہ انصاف پر مبنی حکومت بھی قائم کرتے ہیں لیکن یہ سب باتیں ذریعہ

ہیں اس کا کہ انسان ایک ایسے مرتبہ پہ پہنچ جائے جو انبیاءؑ کی آمد کا مقصد ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں ہماری تائید کرے!

بقیہ مطالب بیان کرنے سے پہلے ایک بات عرض کر دینا مناسب ہے جو شاید مفید بھی ہے اور ضروری بھی اور وہ یہ ہے کہ اہل علم اور اہل نظر میں بسا اوقات اختلاف اس لیے پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر گروہ کی اپنی ایک خاص زبان ہے۔

ایرانی، ترک اور عرب کے مابین انگور کا قضیہ

معلوم نہیں آپ نے بھی یہ قصہ سنا ہے کہ نہیں؟ تین آدمی تھے جن میں سے ایک ایرانی تھا، دوسرا ترک اور تیسرا ایک عرب تھا۔ وہ آپس میں یہ بحث کر رہے تھے کہ آج دوپہر کے کھانے پر کیا چیز کھائی جائے۔ ایرانی نے کہا کہ انگور مناسب رہیں گے۔ عرب نے کہا: نہیں، ہم تو عنب

کھائیں گے۔ ترک بولا: نہیں، ہمیں یہ دونوں چیزیں منظور نہیں۔ ہم تو اوزوم کھائیں گے۔ چونکہ ایک دوسرے کی زبان سمجھتے نہیں تھے اس لیے آپس میں اختلاف ہوا۔ کہتے ہیں کہ آخر ان میں سے کوئی گیا اور انگور لے آیا۔ دیکھا تو سب ایک ہی چیز کے لیے کہہ رہے تھے۔

مختلف زبانوں میں ایک ہی بات کو مختلف الفاظ میں کہا جاتا ہے مثلاً فلسفیوں کی ایک خاص زبان ہے۔ ان کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ اسی طرح عرفاء کی بھی اپنی زبان ہے اور ان کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ فقہاء کی بھی اپنی اصطلاحات ہیں۔ شعراء کی اپنی مخصوص شعری زبان ہے۔ اولیائے معصومین علیہم السلام کا طرزِ کلام سب سے جداگانہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تین یا چار گروہوں میں سے کس کی زبان اہل عصمت کی زبان سے نزدیک تر ہے اور کون سی زبان وحی کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔ میرے خیال میں کسی آدمی کو، کسی عاقل کو اس میں اختلاف نہیں ہو گا کہ حق تعالیٰ ہے، وہ موجودات کا سرچشمہ ہے اور یہی سرچشمہ تمام موجودات کے وجود کی علت ہے۔ کوئی شخص اس کا قائل نہیں ہے کہ آپ اپنے کوٹ پتلون سمیت خدا ہیں، نہ کوئی عاقل یہ تصور کر سکتا ہے کہ فلاں شخص اپنے عمامہ و ریش و عصا سمیت خدا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ سب مخلوق ہیں۔

لیکن علت و معلول کو جس طرح بیان کیا جاتا ہے اور اس سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے اس میں فرق کی وجہ سے اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ جو حضرات عرفاء کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، وہ کیا چاہتے

تھے؟ کیوں اس طرح کے الفاظ استعمال کرتے تھے؟ انہیں اس خاص طرز کی تعبیر پر کس بات نے آمادہ کیا۔

مختلف گروہوں اور انکی تعبیروں میں تصفیہ کی راہ

اب میں چاہتا ہوں کہ ان مختلف گروہوں میں تصفیہ کرادوں کیونکہ یہ سب ایک ہی بات کہتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ سب فلاسفہ کو بے قصور ٹھیراؤں یا سب عارفوں یا سب فقہاء کی صفائی پیش کروں۔ نہیں، یہ بات نہیں ہے:

اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

ان میں بہت سے دکاندار ہیں جو وہی باتیں کرتے ہیں جو انکی تجارت کے فروغ کا باعث ہوں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام گروہوں میں بہت سے اشخاص نیک ہیں۔ ان میں جو اختلاف ہے وہ مدرسہ کی پیداوار ہے۔ اس کی مثال بالکل اس اختلاف کی ہے جو اصولیوں اور اخباریوں میں ہے۔ بعض اوقات شاید اخباری اصولیوں کی تکفیر پر اتر آتے ہیں اور اصولی اخباریوں کو جاہل کہتے ہیں حالانکہ ان کے مقصد میں فرق نہیں۔ مقصد دونوں کا ایک ہے۔

اب ہماری بحث کا نقطہ یہ ہے کہ فلاسفہ کا ایک طبقہ علت العلل، معلول اول، معلول ثانی جیسی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ وہ اکثر علیت و معلولیت کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں خصوصاً ماقبل اسلام کے فلاسفہ علّیت و معلولیت، سببیت و مسببیت اور مبداء و اثر جیسی ترکیبیں انکی

پسندیدہ اصطلاحات ہیں۔

ہمارے فقہاء بھی علیت و معلولیت جیسے الفاظ کے استعمال سے پرہیز نہیں کرتے اور نہ انھیں خالقیت و مخلوقیت جیسے الفاظ کے استعمال سے انکار ہے۔ ایک طبقہ اہلِ عرفان کا ہے۔ وہ اس اختلاف کی بنیاد پر جو ان کے اور دوسروں کے درمیان ہے بالکل ہی مختلف تعبیرات استعمال کرتے ہیں: جیسے ظاہر، مظہر، تجلی وغیرہ۔ ان کے علاوہ وہ کچھ اور ایسے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں جن پر بعض ظاہر بینوں کو اعتراض ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ ایسے الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ ائمہ اہلبیت علیہم السلام نے بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ائمہؑ نے کہیں علیت و معلولیت اور سببیت و مسببیت وغیرہ کا استعمال کیا ہو البتہ ان کے کلام میں خالقیت و مخلوقیت ہے، تجلّی ہے، ظاہر و مظہر وغیرہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اہلِ عرفان نے فلاسفہ کی اصطلاحات سے کیوں گریز کیا ہے اور انھوں نے عوام الناس کا طرزِ بیان بھی کیوں اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے ایک اور ہی اسلوب اختیار کیا ہے جس پر اہلِ ظاہر عموماً اعتراض کرتے ہیں۔ آئیے، دیکھیں اس کی کیا وجہ ہے۔

علت و معلول

علت و معلول کی بنیاد پر ایک موجود کو علت مانا جاتا ہے اور کسی دوسرے کو معلول۔ علیت و معلولیت کا اصول یہ ہے کہ علت ایک طرف ہو اور معلول دوسری طرف۔ اس ایک طرف سے کیا مراد ہے؟ اس سے

جامعہ تعلیمات اسلامی

مراد یہ ہے کہ وہ مکاناً ایک دوسرے سے مختلف ہوں یعنی وہ الگ الگ دو جگہ واقع ہوں، جیسے مثلاً سورج کی روشنی اور خود سورج۔ سورج میں خود بھی روشنی ہے لیکن اس سے روشنی نکلتی بھی ہے۔ اس طرح کہ سورج ایک جگہ ہے اور اس سے نکلنے والی روشنی جس کا ایک الگ وجود ہے، ایک دوسری جگہ۔ سورج سے نکلنے کی وجہ سے یہ روشنی اس کا اثر اور معلول ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ذاتِ واجب الوجود کے بارے میں بھی اس طرح کی علیت و معلولیت کا تصور کیا جا سکتا ہے جس طرح کی علیت و معلولیت نیچر میں پائی جاتی ہے۔ جیسے مثلاً آگ، حرارت کی علت ہے اور سورج، روشنی کی۔ نیچر میں تو معلول علت کا اثر ہوتا ہے اور علت اور معلول جگہ کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ علت ایک جگہ ہوتی ہے اور معلول دوسری جگہ۔

اثر اور مؤثر

نیچر میں اثر اور مؤثر بھی عموماً اس طرح ہوتے ہیں کہ جگہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ اب کیا ہم یہ کہیں کہ مبداء اعلیٰ اور مخلوقات بھی اسی طرح ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ خالق ایک مکان میں اور مخلوق ایک مکان میں۔ خالق ایک زمان میں اور مخلوق ایک زمان میں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس کا تصور بہت مشکل ہے۔ یہی بتلانا مشکل ہے کہ موجودِ مجرد کے وجود کی کیا شکل ہے؟ خصوصاً مبداءِ اعلیٰ کے متعلق چاہے تعبیر کا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے، اس کو بیان کرنا ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ کی قیومیت کس طرح موجودات کا احاطہ کیے ہوئے ہے؟ قرآن

جامعہ تعلیمات اسلامی

جو کہتا ہے کہ ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ "تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے" اس مَعَکُمْ کا کیا مطلب ہے؟ کیا خدا آدمی کے ساتھ اس کے پہلو میں ہے؟

"ھُوَ مَعَکُمْ" کا مفہوم

اس طرح کی تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ حقیقت کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں اس لیے واقعیت کو بیان کرنے کے لیے نزدیک ترین الفاظ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ قرآن و سنت میں بھی قریب ترین الفاظ ہی کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنا بہت مشکل ہے کہ خالق کہاں ہے؟ خالق مخلوق کے ساتھ کس طرح ہے؟ کیا خالق اور مخلوق کی وہی صورت ہے جو آگ اور اس کے اثر کی ہے؟ یا ان میں وہ تعلق ہے جو نفس اور آنکھ، ناک اور دیگر قویٰ میں۔ شاید یہ دوسری مثال حقیقت سے بہت قریب ہو لیکن اس مثال سے بھی مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہو سکتا۔ خالق پوری طرح مخلوق کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور یہ احاطہ قیومی احاطہ ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا مشکل ہے۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ موجودات پر یہ قیومی احاطہ اس طرح ہے کہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں خدا نہ ہو۔

لَوْ دُلِّیتُمْ بِحَبْلٍ اِلَی الْاَرْضِیْنَ السُّفْلٰی لَهَبَطْتُمْ اِلَی اللّٰہِ "اگر تمہیں سب سے نچلی زمینوں تک بھی لٹکا دیا جائے تب بھی تم وہاں خدا ہی کو پاؤ گے" یہ بھی محض کہنے کا ایک طریقہ ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ سب کچھ اللہ ہی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ بالفرض اگر کوئی آدمی جو عبا اور

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامع تعلیمات اسلامی

عمامہ پہنے ہوئے ہے' وہ حق تعالیٰ ہے۔ ایسی بات تو کوئی شخص بہ قائمی ہوش و حواس نہیں کرے گا۔ ہم تعبیر کے لیے صرف ایسے الفاظ اختیار کر سکتے ہیں جو مفہوم سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوں۔ جو شخص ان مسائل سے واقف نہیں ہے اس کی توجہ خالق و مخلوق کے تعلق کی طرف مبذول کرانے کے لیے بعض دفعہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ بھی صحیح ہے کہ سب کچھ اللہ ہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی خاص چیز کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حق تعالیٰ ہے۔ دیکھیے مسلمان فلسفی یہ کہتے ہیں کہ: صِرف الوجود، کُلّ الاَشْیاءِ وَلَیْسَ بِشَیْءٍ مِنْهَا اللہ تعالیٰ خالص وجود ہے' وہ سب کچھ ہے مگر ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ "سب کچھ ہے" اور کچھ بھی نہیں۔ بہ ظاہر یہ دو متضاد باتیں ہیں مگر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ذاتِ خداوندی ہر نقص سے پاک ہے۔ وہ خالص وجود ہے۔ اس میں کوئی کمی یا عیب نہیں۔ وہ ہر کمال سے متصف ہے اور باقی سب موجودات ناقص ہیں۔

اس لیے وہ لیس بشیءٍ منها ہے۔ اگر حق تعالیٰ دوسری موجودات میں سے ہوگا تو ناقص ہو جائے گا مگر وہ ایک مکمل موجود ہے جو ہر نقص سے پاک ہے اور جب وہ ہر نقص سے پاک ہے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی ایسا کمال ہو جو اس میں نہ ہو۔ جو کمال بھی کسی مخلوق میں ہے وہ اسی کے کمال کا جلوہ اور ترشح ہے۔ جب ہر کمال اسی کا جلوہ ہے تو وہ اپنی ذات میں کلِ کمال ہے۔ کُلُّ الاَشْیَاء کا مطلب ہے کُلُّ الکَمَال اور لَیْسَ بِشَیْءٍ مِنْهَا کے معنی ہیں کہ اس میں کوئی نقص نہیں۔ کُلُّ الاَشْیَاء کا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی خدا ہو۔

جامع تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

اسی لیے کہتے ہیں کہ: لَیْسَ بِشَیْءٍ مِّنْهَا. یعنی یہ کہ وہ تمام کمال ہے جب کہ کوئی دوسرا موجود تمام کمال نہیں۔ چونکہ وہ تمام کمال ہے اس لیے ہر کمال سے متصف ہے۔ اسی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی ایسا شخص جسے ان مسائل سے آگاہی نہیں ہے یہ مصرع سنتا ہے: ع چوں کہ بیرنگی اسیرِ رنگ شد۔ اگرچہ اس مصرع کا تعلق اس موضوع سے نہیں ہے لیکن کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا کہ اس مصرع کا حقیقتِ الٰہیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق تو دراصل ایسی لڑائی سے ہے جو دو آدمیوں کے درمیان ہو۔ مگر چونکہ لوگ مطلب نہیں سمجھتے اس لیے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ تو کفر ہے حالانکہ اس کا تعلق اس مسئلے سے قطعی نہیں ہے اور اس کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے وہ غلط ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ دنیا میں جو جنگیں ہوتی ہیں وہ کس بات پر ہوتی ہیں۔

لڑائی کیوں ہوتی ہے؟

لڑائی کس بات پر ہوتی ہے؟ جنگ کی بنیاد کیا ہے؟ یہاں جو رنگ کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد ہے تعلق۔ دوسری جگہوں پر اور بعض دوسرے شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔ کسی نے کہا ہے: ع از آنچہ رنگِ تعلق پذیرد آزاد است۔ رنگ اور بے رنگی۔ رنگ کے معنی ہیں تعلق اور بے رنگی سے مراد ہے بے تعلقی۔ اگر کسی خاص چیز سے طبیعت کو تعلق اور لگاؤ نہ ہو تو جھگڑا نہیں ہو سکتا۔ جھگڑے کی وجہ یہی ہے کہ آدمی کی طبیعت کو کسی چیز سے لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنے لیے حاصل کرنے کی

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

کوشش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اصل فطرت میں رنگ نہیں ہے۔ اگر تعلق کا رنگ بیچ میں سے نکل جائے تو پھر جھگڑا نہیں ہو گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصے میں جس طرح حضرت موسیٰؑ بے تعلق تھے، اگر فرعون بھی اسی طرح بے تعلق ہوتا تو یہ سب جھگڑا پیش نہ آتا۔ اگر کسی جگہ سب انبیاءؑ بھی جمع ہو جائیں تو کبھی جھگڑا نہ ہو۔ یہ سب جھگڑا تعلق ہی کا ہے۔ بے رنگی اسیرِ رنگ شد۔ فطرت جو بے تعلق تھی جب تعلق کی اسیر ہو گئی تو جھگڑے پیدا ہو گئے۔ اگر یہ تعلق کا کانٹا نکال دیا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون بھی آپس میں صلح کر لیں گے۔ اس مضمون کا تعلق حقانیت کے موضوع سے ہے ہی نہیں جس کسی نے اس مصرع پر اعتراض کیا ہے، اسے یہ خیال نہیں آیا کہ یہ مصرع تو ان دو آدمیوں کے متعلق ہے جو آپس میں لڑ رہے ہوں نہ کہ اصل مسئلہ سے۔

ائمہؑ کی دعاؤں کے کلمات

جو کلمات ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی دعاؤں میں آئے ہیں، وہ تو آپ کو معلوم ہیں۔ آئیے دیکھیں کہ کیا اہل عرفان نے بھی اسی طرح کے کلمات استعمال کیے ہیں جن کی بنا پر حقیقت سے ناواقف لوگوں نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے یا ان کے کلمات ان کلمات سے مختلف ہیں جو ائمہؑ کی زبان پر ہیں۔ یہ موضوع سیرِ روحانی سے متعلق ہے۔

مناجاتِ شعبانیہ میں یہ کلمات آئے ہیں کہ: اِلٰهِی هَبْ لِی کَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْكَ وَ اَنِرْ اَبْصَارَ قُلُوبِنَا بِضِیَاءِ

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

نَظْرِهَا اِلَيْكَ حَتّٰى تَخْرِقَ اَبْصَارُ الْقُلُوْبِ حُجُبَ النُّوْرِ فَتَصِلَ اِلٰى مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ وَ تَصِيْرَ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِكَ۔ اے میرے خدا! مجھے توفیق دے کہ میں سب سے بالکل کٹ کر تیرا ہی ہو رہوں۔ ہمارے دل کی آنکھوں کو اپنے دیدار کے نور سے منور فرما تاکہ دل کی آنکھیں نور کے پردوں کو چاک کر کے عظمت کے سرچشمے تک پہنچ جائیں اور ہماری ارواح تیرے حظیرہ قدس میں معلق ہو جائیں۔ اس کے بعد یہ عبارت ہے: اِلٰهِىْ وَاجْعَلْنِىْ مِمَّنْ نَادَيْتَهٗ فَاَجَابَكَ وَلَاحَظْتَهٗ فَصَعِقَ لِجَلَالِكَ۔ اے میرے خدا! مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے جن کو تو نے آواز دی تو انھوں نے لبیک کہا، اور تو نے ان پر نظر کرم ڈالی تو وہ تیرے جلال کے باعث ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ اب کیا فرماتے ہیں یہ حضرات؟ یہی کچھ تو اہل عرفان بھی کہتے ہیں۔ ہمارے سب ائمہؑ جو یہ دعا پڑھا کرتے تھے تو ان کا مقصد کیا تھا؟ كَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَيْكَ سے کیا مراد ہے؟ یعنی هَبْ لِىْ كَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَيْكَ کے کیا معنی ہیں؟

امام "كَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ" خدا سے دعا مانگتے ہیں

امام كَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ نصیب ہونے کی خدا سے دعا کرتے ہیں حالانکہ سیر روحانی خود ان کا اپنا فعل ہے مگر وہ اس کی دعا مانگتے ہیں۔ آخر یہ سب کیوں؟ اَنِرْ قُلُوْبَ اَبْصَارِنَا یہ دل کی آنکھیں کیا ہوتی ہیں جن سے وہ

جامعہ تعلیمات اسلامی

جامعہ تعلیمات اسلامی

خدا تعالیٰ کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ پھر دل سے کیا مراد ہے اور دل کی آنکھوں کا کیا مطلب ہے؟

پھر ان سب کی غایت یہ بیان کی گئی ہے کہ: تَخْرِقَ اَبْصَارُ الْقُلُوْبِ حُجُبَ النُّوْرِ یعنی دل کی آنکھیں نور کے پردوں کو چاک کر کے تَصِلَ اِلٰی مَعْدِنِ الْعَظْمَۃِ وَتَصِیْرَ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَۃً بِعِزِّ قُدْسِکَ عظمت کے سرچشمے تک پہنچ جائیں اور ہماری ارواح تیرے حظیرہ قدس میں معلق ہو جائیں۔ یہاں معلق ہو جانے سے کیا مراد ہے؟ پھر اس کے بعد جو ہے کہ الٰھی اجعلنی ممن نادیتہ ... فصعق لجلالک تو یہاں جلال کے سبب ہکا بکا رہ جانا اور ہوش و حواس کھو بیٹھنا کیا ہے؟ یہی بات حضرت موسیٰؑ کے بارے میں قرآن میں کہی گئی ہے۔ اہل عرفان کی اصطلاح میں جسے فنا کہا جاتا ہے کیا یہ اس سے کچھ مختلف چیز ہے؟ فَصَعِقَ لِجَلَالِکَ۔ اسی طرح درجہ بدرجہ بلند مراتب حاصل کرتے ہوئے سالک وہاں پہنچ جاتا ہے کہ جہاں دل کی آنکھیں سب پردوں کو چاک کر کے عظمت کے سرچشمہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ عظمت کا سرچشمہ کیا ہے اور اس تک پہنچ جانے سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ وہی وصول باللہ نہیں جس کی اہل عرفان بات کرتے ہیں؟ کیا سرچشمۂ عظمت حق تعالیٰ کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ سرچشمۂ عظمت تو وہی ہوگا جس سے سب عظمتیں حاصل کی جا سکیں۔ اس سرچشمۂ عظمت تک وصول کے بعد ہی تَصِیْرُ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَۃً بِعِزِّ قُدْسِکَ کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ بھی وہی بات ہے جو اہل عرفان کہتے ہیں۔

کوئی شخص جس نے حق تعالیٰ اور مخلوقات کے رشتہ پر غور کیا ہو، اس تعلق کی تعبیر کے لیے علت و معلول کے الفاظ استعمال نہیں کرے گا۔ ان الفاظ کا استعمال درحقیقت تعبیر کی نارسائی ہے۔ اس تعلق کو علت و معلول اور اثر و مؤثر کے الفاظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ خالق و مخلوق کے الفاظ بھی محض عوام الناس کے ذوق کی پیروی ہے۔ ان سب سے بہتر تعبیر تجلّی ہے۔ فَتَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ مگر یہ بھی اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے محض قریب ترین لفظ ہے جس کو کسی طرح الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔

ایک ایسا مسئلہ جس کا تصور اسکی تصدیق سے مشکل تر ہے

حق اور خلق کے درمیان ربط ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تصور مشکل ہے لیکن تصور کے بعد اس کی تصدیق آسان ہے لیکن دقت یہ آپڑی ہے کہ ایسے موجود کا تصور کیسے کیا جائے جس سے خالی تو کوئی بھی جگہ نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فلاں جگہ ہے۔ وہ ظاہر اشیا ہے، وہ باطن اشیا ہے اور اس کی معلول بھی ہیں۔ وہ ظاہر میں بھی مؤثر ہے اور باطن میں بھی۔ لایخلوا منہ الشئ ۔اب بتلایئے کہ یہ سب بیان کرنے کے لیے موزوں اور مناسب الفاظ کہاں سے لائے جائیں اور اس مطلب کو کیونکر ادا کیا جائے؟ جو الفاظ بھی لائے جائیں، مطلب ادا نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جو اس کے اہل ہیں وہ دعا کریں اور اس طرح دعا کریں جیسے مناجات شعبانیہ میں ہے۔ خدا سے التجا کریں کہ ایسا

جامعہ تعلیمات اسلامی

ہو جائے، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ اس کی وجہ سے ایک جماعت دوسری جماعت کو کافر ٹھہرائے یا ایک گروہ دوسرے گروہ کو جاہل قرار دے۔ اگر کوئی چاہے کہ اسی مفہوم کو ادا کرے تو وہ اسے کیسے ادا کرے گا؟ یہ بھی سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔ اس کے جذبات کو سمجھیے جو صرف اسی طرح اپنے دل کا مدعا بیان کرسکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کے دل میں نور موجزن ہوتا ہے تو وہ یہ بھی پکار اٹھتا ہے کہ: سب کچھ وہی ہے۔ ہمہ اوست!

امام علیؑ اللہ کی آنکھ ہیں، اللہ کا نور ہیں

آپ دعا میں پڑھتے ہیں کہ علی عین اللہ اس کا کیا مطلب ہے؟ امام علیؑ کے لیے عین اللہ، نور اللہ، ید اللہ کے الفاظ مشہور ہیں۔ ید اللہ کے کیا معنی ہیں؟ یہ وہی الفاظ ہیں جو اہل عرفان بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہماری روایات میں بھی یہ آیا ہے کہ جو صدقہ فقیر کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے، وہ خدا کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔

قرآن میں بھی ہے کہ: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ
وہ کنکریاں آپ نے نہیں پھینکیں، جب آپ نے پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ وہ بات ہے جو آپ سب کہتے ہیں لیکن اہل عرفان کو دست خدا کی بات کرنے کی اجازت نہیں۔ جب وہ بیچارے صاف نہیں کہہ سکتے تو دوسرے طریقے سے کہتے ہیں۔ اس طرح کی تعبیرات قرآن اور خصوصاً دعاؤں میں بکثرت آئی ہیں۔ جب قرآن اور دعاؤں میں یہ باتیں موجود

ہیں تو اہل عرفان سے بدظنی کی وجہ؟ یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ کہنے والے کا مقصد کیا ہے؟ اس نے اس طرح کیوں کہا ہے، اسے کیا تکلیف ہے کہ اس نے وہ الفاظ استعمال نہیں کیے جو عام لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اسے اگر معلوم بھی ہے کہ عوام کس طرح کہتے ہیں تو کیا ہوا؟ اگر اس نے وہ الفاظ استعمال نہیں کیے جو عام پسند ہیں تو اس لیے کہ اس نے حقیقت کو قربان نہیں کیا بلکہ خود کو حقیقت پر قربان کر دیا۔ اگر ہم اس بات کو سمجھ سکیں تو ہم بھی وہی الفاظ استعمال کریں۔

چنانچہ قرآن نے بھی یہ تعبیر اختیار کی ہے اور ائمہ ؑ نے بھی اسی طرح کے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر فرض کیجیے کہ کوئی یہ کہے کہ یہ حق ہے تو کوئی اس کا یہ مطلب لے کہ یہ خدا ہے۔ ایسی بات کوئی ہوشمند تو کہے گا نہیں۔ یہ دیکھیے کہ ظہور کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے اور اسے حق تعالیٰ سے کیسے جدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک دعا میں اولیاء کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ: لَا فَرْقَ بَیْنَکَ وَبَیْنَھُمْ اِلَّا اَنَّھُمْ عِبَادُکَ خَلْقُھُمْ بِیَدِکَ، رَتْقُھُمْ بِیَدِکَ۔ "تجھ میں اور ان میں کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ وہ تیرے بندے ہیں۔ ان کو پیدا کرنا اور ان کے امور کی اصلاح کرنا تیرے ہاتھ میں ہے۔" درحقیقت یہ بھی تعبیر کی نارسائی ہے۔ اسی لیے مطلب ادا کرنے کے لیے ائمہ ؑ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو دوسروں کے الفاظ کے مقابلے میں قرآن سے نزدیک تر ہیں۔

یہ سمجھیے کہ اہل عرفان وہ لوگ ہیں کہ جن کے متعلق کوئی بھی کھڑا ہو کر کہہ دے کہ یہ کون ہوتے ہیں؟ ہمارے سامنے ایسے لوگ ہوئے ہیں جنکو

جامع تعلیمات اسلامی

ہم نزدیک سے جانتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ یہ کس قسم کے آدمی ہیں۔ یہ لوگ تمام علوم میں اہل تفکر اور باکمال تھے۔ پھر بھی وہ اسی طرح کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ جلوے کا ذکر کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ اللہ کا جلوہ ہے۔ دعائے سمات میں طَلْعَتُكَ کا لفظ ہے۔ اس کے معنیٰ بھی جلوہ ہیں۔ اسی طرح کا ایک لفظ نور ہے۔ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِیْ ..... بِاسْمِكَ اس لیے اہل عرفان سے صلح کر لیجیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان میں سب اچھے ہیں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ سب کو مسترد مت کیجیے۔ جب میں علماء کی تائید کرتا ہوں تب بھی میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ میں ہر قسم اور ہر طرح کے علماء کی تائید کرتا ہوں۔ میرا مقصد یہی ہوتا ہے کہ سب کو رد مت کیجیے۔ یہ نہیں ہوتا کہ سب کو قبول کر لیجیے۔ یہاں بھی یہی بات ہے۔ یہ مت سمجھیے کہ جو بھی کوئی عارفانہ بات کرتا ہے وہ کافر ہے۔

ہر بات کی تحقیق ضروری ہے

پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ آدمی کہہ کیا رہا ہے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے تو پھر شاید انکار کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ سارا قصہ وہی عنب' انگور اور ازوم کا ہے۔ ایک اسی بات کو ایک طرح سے بیان کرتا ہے' دوسرا اس کے لیے علیت و معلولیت کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے' تیسرا سببیت و مسببیت کہتا ہے' چوتھا ظہور و مظہر۔ یہ سب کبھی نہ کبھی ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں انھیں سمجھ میں آتا ہے کہ اس ہستی کو کن الفاظ سے تعبیر کیا جائے جو ہر جگہ ہے لیکن وہ اشیاء میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی لیے کہنے والا کبھی یہ بھی کہہ

جامع تعلیمات اسلامی

دیتا ہے کہ علیؑ یداللہ، علیؑ عین اللہ۔

قرآن کہتا ہے کہ: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ نیز جس نے آپ سے بیعت کی، اس نے خدا سے بیعت کی۔ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ یعنی اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھا ہوا ہو جیسا کہ ہم رکھتے ہیں بلکہ یہاں فوق سے مراد فوقِ معنوی ہے۔ اسی طرح فَوْقَ أَيْدِيكُمْ میں بھی فوق معنوی مراد ہے۔ ہمارے پاس اس فوق کا کما حقہ مطلب ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

جس طرح خدائے تبارک و تعالیٰ اس سے بہت بالاتر ہے کہ وہ کسی شے کے ساتھ مخلوط ہو جائے یا عام معنی میں کسی شے سے مربوط ہو، اسی طرح وہ اس سے بھی بالاتر ہے کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ اس کے جلوے کی کیا نوعیت ہے۔ اس کا جلوہ بھی ہمارے لیے غیر معلوم ہے البتہ یہ ہمارا ایمان ہے کہ اس نوع کی کوئی چیز ہے ضرور۔ ہم اس کے وجود کو مسترد نہیں کرتے۔ جب ہم یہ مانتے ہیں کہ اس طرح کی چیزیں ہیں تو ہمارا یہ یقین ہوتا ہے کہ ان کا ذکر کتاب و سنت میں کسی نہ کسی عنوان سے موجود ہے۔ جلوۂ حق کا ذکر جہاں قرآن میں ہے وہاں تجلی اور ظہور کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔ سورۂ حدید میں ہے۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ سورۂ حدید کی آخری چھ آیات ان لوگوں کے لیے ہیں جو آخری زمانے میں آئیں گے۔ وہی ان کو سمجھیں گے۔ ان آیات میں تخلیق کی کیفیت وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان ہی آیات میں

جامعہ تعلیمات اسلامی

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ اور ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ اس آخری زمانہ کا مطلب بھی کوئی آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ شاید دنیا میں ایک دو اشخاص ایسے موجود ہوں جو اس کا مطلب سمجھ سکتے ہوں۔

غلط فہمیاں دُور ہونی چاہئیں

میرا خاص نکتہ یہ ہے کہ غلط فہمی دُور ہونی چاہیے۔ جو اختلاف اہل مدرسہ اور اہل علم میں ہے وہ ختم ہونا چاہیے۔ معارف کا راستا نہیں روکنا چاہیے۔ اسلام فقط احکام فرعیہ کا نام نہیں، یہ احکام فرع ہیں، بنیاد کچھ اور ہے۔ ہمیں اصل کو فرع پر قربان نہیں کرنا چاہیے اور یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ اصل بلاضرورت ہے اور اسے اصل کہنا خلافِ واقعہ ہے۔ ایک صاحب کہتے تھے کہ مرحوم شیخ محمد بہاری کے سامنے کسی کا تذکرہ آیا۔ کہنے لگے کہ وہ تو عادل کافر ہے۔ ہم نے کہا: یہ کیا بات ہوئی! عادل بھی ہے اور کافر بھی۔ شیخ محمد بہاری نے کہا: عادل تو اس لیے ہے کہ شرعی احکام پر عمل کرتا ہے، کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور کافر اس لیے ہے کہ جس خدا کی وہ پرستش کرتا ہے وہ خدا ہی نہیں۔

چیونٹی بھی اپنی ذات سے محبت کرتی ہے

ہماری روایات میں ہے کہ شاید چیونٹی یہ سمجھتی ہے کہ خدا کے دو سینگ ہیں۔ یہ حُبِّ نفس ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ چیونٹی میں بھی ہے۔ یہ چیونٹی بھی عجیب چیز ہے۔ اس کا خیال ہے کہ خدا کے دو سینگ ہیں۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

وہ سینگ ہونے کو کمال سمجھتی ہے۔ ہم بھی جب اپنی خوبی اور کمال کی بات کرتے ہیں تو کچھ اسی طرح سے سوچتے ہیں۔ یہ وہی چیونٹی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے لشکریوں کے بارے میں کہتی ہے کہ انہیں سمجھ ہی نہیں۔

یَآاَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ لَا یَحْطِمَنَّکُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُہٗ وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ چیونٹیو! اپنے گھروں میں گھس جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور ان کے لشکری بے سمجھے بوجھے تمہیں کچل دیں۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِکًا مِّنْ قَوْلِھَا وہ اسکی بات پر ہنستے ہوئے بولے کہ یہ مجھے بے سمجھ کہتی ہے۔ چیونٹی نے جو بات کہی سب جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہُدہُد نے بھی اسی طرح کہا تھا: اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِہٖ۔ یعنی مجھے وہ کچھ معلوم ہے جو آپ کو معلوم نہیں۔ یہ بات ایسے آدمی سے کہی جا رہی ہے جو پیغمبر ہے اور اس کے اصحاب اور احباب میں ایسا آدمی بھی موجود ہے جو بلقیس کے تخت کو چشم زدن میں حضرت سلیمانؑ کے پاس لے آیا تھا۔ اب تک ایسا اتفاق کسی انسان کو پیش نہیں آیا تھا۔ یہ کیا قصہ تھا؟ یہ بات خود غیر معلوم ہے۔ کیا یہ کوئی بجلی کا مواصلاتی نظام تھا یا کسی چیز کو معدوم کر کے دوبارہ وجود میں لانے کی صورت تھی؟ کیا اس تخت کو بجلی کی لہروں میں تبدیل کر کے پہنچایا گیا تھا؟ آخر کیا بات تھی؟ روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے ایک شخص اسم اعظم کا ایک حرف جانتا تھا۔ وہ ایسا تھا کہ پلک جھپکنے سے بھی پہلے مطلوب کو حاضر کر دیتا تھا۔ ایسے پیغمبر کے سامنے ہُدہُد یہ کہے کہ: اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِہٖ — بہر حال شیخ مرحوم کے

جامعہ تعلیمات اسلامی

کہنے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ جو کچھ سمجھتے تھے وہی کہتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔

بعض مسائل سے محروم رہنا بدقسمتی ہے

میرا خیال یہ ہے کہ اہل علم کے ایک گروہ کی جس میں بہت اچھے اور نیک لوگ شامل ہیں، بعض مسائل سے محرومی بدقسمتی ہے۔ ہم قم میں آئے تو مرزا علی اکبر حکیم رحمۃ اللہ علیہ قم میں تھے۔ جب قم میں حوزۂ علمیہ قائم ہوا تو ایک مقدس شخصیت نے جو اب ہم میں نہیں رہی، کہا تھا دیکھو اب اسلام کی کیا نوبت آگئی ہے کہ مرزا علی اکبر کے گھر میں اسلام کا کاروبار شروع ہوا ہے؟

علماء وہاں جا کر درس لیتے تھے۔ مرحوم آغا خوانساری اور مرحوم آغا اشراقی جیسے بزرگ مرزا علی اکبر سے پڑھتے تھے اور ان صاحب نے فرمایا تھا کہ دیکھو یہ نوبت آگئی ہے کہ اسلام کا کاروبار مرزا علی اکبر کے گھر میں شروع ہوا ہے حالانکہ یہ صاحب نیک آدمی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے ایک نمائندہ نے منبر پہ کہا تھا کہ میں نے خود مرزا علی اکبر کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ آغا شاہ آبادی مرحوم کو اس سے بہت تکلیف پہنچی تھی کہ ان صاحب نے یہ کہا کہ مرزا علی اکبر بھی قرآن پڑھتے تھے۔

بہرصورت اس طرح کی بدگمانیاں اور اپنے آپ کو ایک نیک کام سے علیحدہ رکھنا افسوسناک ہے۔ یہ صاحب ایک علمی مرکز میں شرکت سے بھی جو بہت نیکی کا کام ہے محروم رہے۔ اور باتوں کو چھوڑیئے فلسفہ تو بہت معمولی چیز ہے، کچھ لوگوں کو اس پر بھی اعتراض ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ

جامعہ تعلیمات اسلامی

یہ لوگ ایک دوسرے کا مطلب نہیں سمجھتے، اسی سے یہ سب جھگڑے پیش آتے رہتے ہیں۔ اگر مطلب سمجھ لیں تو کوئی جھگڑا نہ رہے۔ ایک صاحب با جبہ ریش و عمامہ دوسرے صاحب کی تکفیر کرتے ہیں اس لیے کہ انہیں معلوم نہیں کہ دوسرے صاحب کہتے کیا ہیں۔ دوسرے صاحب کی خطا یہ ہے کہ وہ علیت و معلولیت جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو پہلے صاحب کی نظر میں ایسی تعبیریں ہیں جو خلاف واقعہ ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اسم، ہستی سے جدا نہیں ہے۔ اسم، ظہور ہے، علامت ہے لیکن ایسی علامت نہیں جیسے کہ عام طور پہ سنگِ میل نصب کر دیے جاتے ہیں، اسی لیے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ فلاں چیز اللہ کی علامت ہے۔ قرآنی آیات میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، وہ حقیقت سے نزدیک تر ہیں۔ پھر بھی وہ حقیقت کی کما حقہ، نمائندگی نہیں کرتے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ ان سے بہتر الفاظ موجود نہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن ایک دسترخوان کی مانند ہے۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اس پہ کسی ایک گروہ کی اجارہ داری نہیں۔ وہ سب کا ہے اور سب کو اس سے مستفید ہونے کا حق ہے۔ ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کی دعائیں معارف سے مالا مال ہیں لیکن کچھ افراد کی کوشش ہے کہ لوگوں کو ان سے محروم کر دیں۔ دعاؤں میں معارف ہیں۔ دعائیں قرآن کی زبان ہیں۔ دعائیں شارحِ قرآن ہیں۔ وہ ان مسائل کی تشریح کرتی ہیں جن تک دوسروں کی رسائی نہیں۔

لوگوں سے دعائیں چھڑانا بالکل غلط ہے

لوگوں سے دعائیں چھڑانا غلط ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اب ہم قرآن پڑھنا چاہتے ہیں، اس لیے دعا کچھ نہیں۔ لوگوں کو دعا سے اُنسیت پیدا کرنی چاہیے تاکہ خدا سے انسیت پیدا ہو۔ جن لوگوں کو خدا سے انسیت ہے، اُن کے نزدیک دنیا کی کچھ حقیقت نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو اہمیت نہیں دیتے۔ خدا کے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ انہی میں وہ لوگ ہیں جو خدا کے لیے جہاد کرتے تھے اور دعائیں بھی پڑھتے تھے۔ ان کے بھی یہی حالات تھے لیکن وہ خدا کے لیے تلوار چلاتے تھے۔ لوگوں کو ان برکات سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن اور دعا اسی طرح ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں، جس طرح رسول ؐ قرآن سے جُدا نہیں ہیں۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پاس قرآن ہے اس لیے ہمیں رسول ؐ کی ضرورت نہیں۔ قرآن اور رسول ؐ ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں۔ وہ ہمیشہ اکٹھے ہی رہیں گے۔ لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ ان میں جُدائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہم اگر الگ الگ حساب لگائیں اور یہ چاہیں کہ قرآن علیحدہ ہو، ائمہ ؑ علیحدہ ہوں اور دعائیں علیحدہ ہوں اور دعاؤں کے متعلق بھی یہ کہیں کہ ہمیں دعاؤں سے مطلب نہیں اور دعا کی کتابوں کو آگ لگا دیں یا فرض کریں کہ عارفوں کی کتابوں کو جلادیں، تو جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیچارے ناواقف ہیں۔ جب آدمی اپنی حد سے گزر جاتا ہے تو غلطی

میں پڑ جاتا ہے۔

کسروی اور حافظ

کسروی ایک تاریخ نویس تھا۔ اس کی تاریخی معلومات اچھی تھیں۔ لکھتا بھی خوب تھا لیکن اس میں غرور پیدا ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پیغمبری کا دعویٰ کرنے لگا۔ دعاؤں کو بالکل چھوڑ دیا۔ قرآن کو ضرور مانتا تھا۔ نبوت کو اتنا گرایا کہ اپنی سطح پر لے آیا۔ خود تو اوپر اٹھ نہیں سکتا تھا۔ نبوت کو گرا دیا۔ دعاؤں اور قرآن وغیرہ سب کا ساتھ ہے۔ عرفاء عارف مسلک شعرا اور فلاسفہ سب ایک ہی بات کہتے ہیں۔ ان کے مطالب الگ الگ نہیں صرف تعبیر کا فرق ہے اور زبان مختلف ہے۔ شعر کی اپنی ایک خاص زبان ہے۔ حافظ کا خود اپنا ایک الگ اسلوب اور طرز بیان ہے۔ حافظ بھی وہی مسائل بیان کرتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں لیکن ایک دوسری زبان میں۔ زبانیں مختلف ہوں لیکن مضمون کی برکتوں سے لوگوں کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن و سنت اور دعاؤں کے وسیع دسترخوان کی طرف لوگوں کو بلایا جائے تاکہ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اس سے فیض اٹھا سکے۔

یہ تمہید تھی ان سب مضامین کی جو بعد میں پیش کیے جائیں گے۔ اگر زندگی رہی اور ہم نے بھی کسی وقت کوئی ایسی تعبیر بطور احتمال بیان کر دی تو یہ نہ کہیے کہ ہم بھی ان تعبیرات کو دوبارہ میدان میں لے آئے نہیں یہ بات نہیں۔ ان تعبیرات کو تو دوبارہ رواج پانا چاہیے۔ کچھ کاریگر قسم کے لوگ

آغا شاہ آبادی مرحوم کے پاس آیا کرتے تھے۔ مرحوم ان کے سامنے بھی مسائل اس طرح بیان کرتے تھے جیسے اور سب کے سامنے۔ میں نے ایک دن ان سے عرض کیا کہ یہ لوگ اور یہ مسائل ؟ کہنے لگے: چھوڑو۔ یہ کفریات ان کے کانوں میں بھی پڑجائیں تو اچھا ہے!

ہمارے یہاں بھی کچھ ایسے لوگ تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون تھے۔ کسی کا نام لینا غلطی ہوگی۔ اب موضوع بحث یہ ہے کہ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ میں بھی اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ہے اور اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ کے بعد بھی اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ہے بِسۡمِ اللّٰه میں اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کے الفاظ اسم کی بھی صفت ہو سکتے ہیں اور اللہ کی بھی۔ دونوں احتمال ہیں۔ انشاء اللہ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں میں سے کونسا احتمال فہم سے نزدیک تر ہے۔

جامعہ تعلیمات اسلامی

اشاریہ

شخصیات

آخوند مُلا حسین قلی ہمدانی: ۱۱۳-۱۱۶-۱۱۷-۲۱۹-۲۲۱-۲۲۳-۲۲۴

آغا اشراقی: ۳۴۴

آغا حاج مرزا علی آغا قاضی: ۱۱۴-۱۱۵-۱۵۲-۱۶۶-۱۹۲-۱۹۹-۲۰۳-۲۲۴

آغا خوانساری: ۳۴۴

آغا سید احمد کربلائی طہرانی: ۱۱۴-۱۱۷-۲۲۴

آغا سید حسین قاضی: ۱۵۲

آغا سید علی شوشتری: ۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴

آغا سید قریش قزوینی: ۱۵۲

آغا شاہ آبادی: ۳۴۴-۳۴۸

آغا محمد سعید حبوبی: ۲۲۴

آغا رضا قمشہ ای: ۸۵

آغا میرزا ہاشم رشتی: ۸۲-۸۵

ابراہیمؑ (خلیل اللہ)، حضرت: ۱۵۰-۱۵۲-۱۵۷-۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۳-۱۶۴

ابراہیم بن ادھم: ۱۹-۵۸-۵۹

ابن تیمیہ: ۵۴

ابن خلکان: ۶۱

ابن سینا: (دیکھیے بوعلی سینا)

ابن عربیؒ، محی الدین (شیخ اکبر): ۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱

جامعہ تعلیمات اسلامی

۸۲-۸۳-۸۵-۲۱۰-۲۳۰

ابن فارض : ۴۷-۸۴-۱۳۰

ابن فہد حلّی : ۸۲

ابن ندیم : ۵۸

ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری (داتا گنج بخش) : ۶۸

ابوبصیر : ۲۰۸

ابوالعباس بن شریح : ۶۵

ابوالفضل سرخسی : ۶۵

ابوالقاسم قشیری : ۵۵

ابوبکر، حضرت : ۴۳-۷۷

ابوبکر شبلی : ۶۴-۶۵

ابوحمزہ ثمالی، حضرت : ۵۰

ابوذر غفاری، حضرت : ۵۰-۵۱-۵۶-۱۴۲-۲۲۰

ابوسعید ابوالخیر : ۵۷-۶۶-۶۷

ابوسفیان : ۲۹۵

ابوطالب مکّی : ۶۵

ابوعبدالرحمٰن شامی : ۶۳

ابوعبداللہؑ حضرت (امام حسینؑ) : ۱۷۰-۲۲۵-۲۹۱-۲۹۷

ابوعلی رودباری : ۶۵

ابوعلی دقاق نیشاپوری (شیخ نوحہ گر) : ۶۸

ابومحمد جعفر خلدی : ۵۸

ابونصر سراج طوسی : ۵۵-۶۵

ابوہاشم صوفی کوفی : ۵۴-۵۵-۵۹

احمد مجتبیٰؐ، حضرت : ۲۰۳

احمد بن حنبل : ۶۲

احمد جامی ژندہ پیل : ۷۰-۸۳

احمد غزالی : ۶۹

ادریسؑ، حضرت : ۱۶۶-۱۶۷

ارسطو : ۴۲

اسحاقؑ، حضرت : ۱۵۸-۱۶۱-۱۶۳

اسماعیلؑ، حضرت : ۱۶۲
افلاطون : ۴۲
اقبال، علامہ : ۱۷۸
الحاج مرزا جواد ملکی تبریزی : ۱۱۶
۲۲۴-۱۹۲
الیاسؑ، حضرت : ۱۶۲
اویس قرنی : ۱۸
ایاز : ۹۳-۹۴
ایوبؑ، حضرت : ۱۶۲
بابا فرج اللہ (مجذوب) : ۱۱۹
۱۲۰
باقرؑ، امام محمد : ۱۲-۴۲
بایزید بسطامی (طیفور بن عیسٰی) :
۱۹-۶۰-۶۴-۶۶-۱۹۸
بسر حافی : ۶۱
بلقیس، ملکۂ سبا : ۳۴۳
بو علی سینا (شیخ الرئیس) : ۶۶
۶۷-۷۵-۸۸-۸۹
۹۰-۹۱-۹۲-۹۴
۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱
۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵-۳۱۱
۳۱۹-
بہاءالدین : ۷۱
بہاءالدین نقشبند شیخ : ۸۴
۲۱۹
ثعلب : ۶۵
جابر بن عبداللہ انصاریؓ حضرت :
۱۲
جبرئیل : ۳۱۶
جعفر صادقؑ، امام : ۱۷-۵۵
۶۰-۷۳-۱۴۶-۱۸۳
۱۹۳-۲۰۲
جارج جرداق : ۵۱
جلال الدین دوانی، محقق : ۷۹
۸۲
جامی، نورالدین عبدالرحمان :
۵۸-۶۳-۷۴-۸۲
۸۳-

جنید بغدادی: ۱۹-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵

حاج امام قلی نخجوانی: ۱۵۲

حاجی شیخ محمد بہاری: ۱۹۲-۲۲۴-۳۴۲

حاجی مرزا حسین نوری: ۶۰

حارث محاسبی: ۶۲-۶۳

حافظ شیرازی، خواجہ: ۶۴-۷۴-۷۹-۸۰-۱۱۴-۱۲۰-۱۹۲-۲۲۴-۳۴۷

حسن بصری: ۱۸-۵۴-۵۷-۵۸

خواجوی کرمانی: ۷۸

خضرؑ، حضرت: ۱۵۱

خواجہ عبداللہ انصاری: ۶۵-۶۸-۶۹-۷۹-۹۷

خواجہ نصیرالدین طوسی: ۷۶-۷۷-۱۰۵

داؤدؑ، حضرت: ۱۶۲

ذوالنون مصری: ۶۳-۶۵

رابعہ شامیہ: ۵۸-۵۹-۶۶

رابعہ عدویہ: ۵۸

ربیع بن خیثم: ۱۸

رشید ہجری: ۱۸

رضاؑ، امام علی بن موسیٰ: ۱۲-۵۹-۸۲-۲۳۱

روزبہان بقلی شیرازی (شیخ شطاح): ۷۱

سجادؑ، امام (دیکھیے علی بن الحسینؑ) ۱۲

سری سقطی: ۵۵-۶۱-۶۲-۶۳

سعدی، شیرازی، شیخ: ۶۱-۷۳-۹۳-۹۴

سفیان ثوری: ۵۴-۵۵-۵۹

سلمان فارسی، حضرت: ۱۸-۵۶-۲۰۵

سلیمانؑ، حضرت: ۱۶۲-۳۴۳

جامعہ تعلیمات اسلامی

سنائی غزنوی : ۷۰، ۲۰۷
سہل بن عبداللہ تستری : ۶۳
سید بحرالعلوم : ۱۳۵-۲۱۶
سید حیدر آملی : ۸۰
سید الساجدینؑ (دیکھیے علیؑ بن الحسینؑ)
سید الشہداء (دیکھیے ابو عبداللہ)
سید قطب : ۲۳۱
سید محمد نور بخش : ۸۲-۸۴
شاہ نعمت اللہ ولی : ۸۱
شریف بلخی : ۱۹
شبلنجی : ۵۹
شعیبؑ، حضرت : ۱۷۸
۳۱۲
شقیق بلخی : ۵۹
شمس تبریز : ۷۸
شیبان راعی : ۱۹
شیخ ابوالحسن اشعری : ۲۰۸
شیخ ابوالحسن خرقانی : ۶۶
شیخ ابومدین مغربی اندلسی : ۷۴
شیخ شہاب الدین سہروردی زنجانی : ۷۳-۷۸
شیخ شہاب الدین سہروردی (شیخ اشراق) : ۷۴
شیخ صدوق : ۳۰۸
شیخ طبرسی : ۲۳۱
شیخ طوسی (شیخ الطائفہ) : ۶۲
شیخ عبدالرزاق لاہیجی : ۷۸
۷۹
شیخ محمود شبستری : ۷۲-۸۰
۸۲
شیخ مرتضیٰ انصاری : ۲۲۲
۲۲۳
شیخ نجم الدین کبریٰ : ۱۷-۷۳
شہید ثانی : ۷۹
صائن الدین علی ترکہ اصفہانی :
۸۱
صدرالدین دشتکی، میر : ۸۲

صدرالدین محمد قونوی : ۷۶-۷۸
۸۱-۸۲
طاؤس یمانی : ۱۹
طنطاوی جوہری : ۲۳۱
عائشہ، بی بی : ۱۳۶
عبدالرزاق کاشانی : ۷۸-۷۹
۹۶-۲۳۰
عبدالعزیز قراطیسی : ۱۸۳
عبدالقادر گیلانی، شیخ : ۷۰
۷۳-۷۵
عبدالکریم جیلی : ۸۰-۸۱-۱۲۳
عبدالواحد بن زید : ۵۴
عزیزالدین نسفی : ۸۱
عطار، فریدالدین : ۱۹-۵۵
۷۱-۷۲-۷۳-۷۷
علاءالدولہ سمنانی : ۷۸-۷۹
علی مرتضیٰؑ، امیرالمومنین امام :
۷-۱۰-۱۸-۱۹-۳۰
۲۵-۴۹-۵۱-۵۸
۹۳-۱۰۲-۱۴۱-۱۵۵
۱۵۶-۱۶۳-۱۶۵-۱۶۷
۱۹۷-۲۲۱-۲۲۹-۳۳۸/۳۴۱
علیؑ بن الحسینؑ (زین العابدینؑ)
امام : ۸۴-۱۶۷
علی بن عیسیٰ اربلی : ۵۹
عیسیٰؑ، حضرت : ۱۶۲
عین القضاۃ ہمدانی : ۶۹
غالب، مرزا اسداللہ خاں : ۱۱۴
غزالی، ابو حامد محمد : ۶۹
فارابی : ۷۵
فاطمہ زہراؑ بی بی : ۱۵۶-۲۲۹
فخرالدین عراقی ہمدانی : ۷۸
۸۳
فرزدق : ۸۴
فرعون : ۳۳۴
فضیل بن عیاض : ۶۰
فیض کاشانی : ۸۵
فیثاغورث : ۴۲

قارون : ۱۴۷
قاسم غنی، ڈاکٹر : ۵۴-۵۶
قاضی سعید قمیؒ : ۸۵
قاضی طیؒ : ۱۴
قاضی نوراللہ شوشتری : ۸۲
قطب الدین حیدر : ۷۳
کسروی : ۳۴۷
کمال الدین اصفہانی : ۷۳
کمیل بن زیاد نخعی : ۱۸-۴۹-۱۰۲
لوطؑ، حضرت : ۱۶۲-۱۶۳
مالک بن انس : ۶۳
مالک بن دینار : ۱۹-۵۸
ماسینیوں : ۵۲
مجدد الدین بغدادی : ۷۳
محدث قمیؒ : ۵۶
مرتضیٰ مطہری شہید، استاد شیخ :
۱۴-۶۴
مریمؑ، بی بی : ۴۶
محمد مصطفیٰؐ، حضرت : ۷-۱۳
۱۵۵-۲۲۹
محمد بن حسن شیبانی : ۸۳
محمد بن حسن فناری رومی : ۸۱
۸۵
محمد بن مسلم : ۱۷۲
محمد حسن طباطبائیؒ، سید : ۱۶۶
محمد حسین طباطبائیؒ، سید : ۱۴
محمد لاہیجی نوربخش، شمس الدین :
۸۰-۸۲-۸۳-۸۴
محمود غزنوی، سلطان : ۹۳-۹۴
مرزا علی اکبر حکیم : ۳۴۴
معاویہ بن ابی سفیان : ۵۱
۲۹۹
معروف کرخی : ۱۹-۵۹-۶۲
۸۲-۲۲۱
معصوم علی شاہ : ۱۹
مقتدر باللہ : ۶۴
ملّا سلطان علی : ۲۳۱
ملّا صدرا (صدر المتالہین) : ۱۲

۷۵-۸۵-۱۰۵
منصور حلاّج، حسین بن : ۶۴
موسیٰ ؑ، حضرت : ۱۵۱-۱۶۰
۱۶۲-۳۱۲-۳۱۳-۳۳۴
۳۳۶
موسیٰ بن جعفر الکاظم ؑ، امام :
۵۹-۶۱-۱۹۰
مولانا روم، جلال الدین محمد بلخی :
۹۷-۹۸
مہاتما بدھ : ۵۸
مہدی ؑ، امام : ۷
میثم تمّار : ۱۸
نکلسن : ۵۲-۵۵-۵۷
نوح ؑ، حضرت : ۱۶۰-۱۶۲
۱۶۳-۱۶۴
نوشیروان : ۶۵
والیسع ؑ، حضرت : ۱۶۲
ہارون ؑ، حضرت : ۱۶۲
یحییٰ ؑ، حضرت : ۱۶۲
یعقوب ؑ، حضرت : ۱۵۸
۱۶۱-۱۶۲
یوسف ؑ، حضرت : ۱۵۷
۱۶۰-۱۶۳
یونس ؑ، حضرت : ۱۶۲

کتابیات

احتجاج طبرسی : ۴۷
احیاء العلوم الدین : ۱۲-۶۹
ارشاد دیلمی : ۲۰۳
اسفار اربعہ : ۱۳-۱۴-۱۰۵
اشارات : ۱۴-۸۸-۱۰۴
اصطلاحات : ۹۶
اصول کافی : ۱۲-۴۶-۴۸
۵۵-۱۴۶
الفہرست : ۵۸
القرآن الحکیم : ۱۹-۲۳-۲۴
۲۵-۲۶-۴۵-۴۶
۵۲-۵۳-۱۱۷-۱۱۸

جامعہ تعلیمات اسلامی

۱۲۱ - ۱۸۷ - ۳۰۰ - ۳۰۱
۳۰۲ - ۳۱۰ - ۳۲۰ - ۳۲۲
۳۲۳ - ۳۳۰ - ۳۳۱ - ۳۳۶
۳۳۸ - ۳۳۹ - ۳۴۱ - ۳۴۴
۳۴۵ - ۳۴۶ - ۳۴۷

اللمع : ۶۵

الانسان الکامل : ۸۰ - ۱۲۳

بحارالانوار : ۲۵ - ۲۰۳

بوستان : ۹۳

تاریخ حشری : ۱۲۰

تاریخ تصوف دراسلام : ۵۴
۵۶ - ۵۷ - ۶۳

تذکرۃ الاولیاء : ۱۹ - ۵۵ - ۷۱

توحید : ۲۰۸

تمہید القواعد : ۸۱

جامع الاسرار : ۸۰

دیوان شمس تبریز : ۷۷ - ۷۸

رسالۂ بحرالعلوم : ۲۱۶

ریحانۃ الادب : ۵۹

رعایۃ حقوق اللہ : ۵۷

روضات الجنّات : ۶۴ - ۷۸

شرح اشارات : ۱۰۵

شرح لمعات عراقی : ۸۴

شرح منازل السائرین : ۹۶

سفینۃ البحار : ۵۶

شفاء : ۱۴

صحیفۂ سجادیہ : ۵۰

صوفیہ وفقراء : ۵۴

طبقات الصوفیہ : ۶۳

طرائق الحقائق : ۱۹

عدۃ الداعی : ۱۲

عوارف المعارف : ۷۳

علل گرایش بہ مادیگری : ۶۴
۸۱

عیون اخبار الرضاؑ : ۱۲

فتوحات مکیہ : ۷۴

فصوص الحکم : ۷۶ - ۷۸ - ۸۰
۸۳

فلوک : ٧٧
قصیدہ بُردہ : ٨۴
قصیدہ تائیہ : ٨۴
قصیدہ میمیہ : ٨۴
قوت القلوب : ٦٥
کشف الغمہ : ٥٩
کشف المحجوب : ٦٨
گلستان : ٨۴
گلشنِ راز : ٧٣-٨٠-٨٢
لوائح بہارستان : ٨۴
مثنوی مولوی : ٥٨
مستدرک : ٦٠
مجالس المومنین : ٨٢
مجمع البیان : ٢٣١
مصباح الانس : ٨٢
مصباح الشریعۃ : ٦٠-٢٠٢
٢٠٣
مفاتیح الجنان : ٢٩٨
مفتاح الغیب : ٧٧-٨١-٨٣
منازل السائرین : ٦٩-٧٨
٩٧
منطق الطیر : ٧٢
منہاج الکرامہ : ٦١
میراث اسلام : ٥٣-٥٧
نامۂ دانشوران : ٦٧
نفحات الانس : ٨۴
نص النصوص : ٨٠
نصوص : ٧٧
نورالابصار : ٥٩
نہج البلاغہ : ۴٩-٢٩٨
وفیات الاعیان : ٦١

اماکن

افغانستان : ٧٠
اندلس : ٧۴
ایران : ٧٠-٧٧
بغداد : ٦١-٦٩-٧٠
بلخ : ٥٨-٧٧

تبریز :
تربت :
تربت حیدریہ : ۷۳
جام : ۸۳
خراسان : ۶۴
خوارزم : ۷۱
دمشق : ۷۶
رملہ : ۵۴
شام : ۷۴ - ۲۹۹
شوشتر : ۲۲۱
شیراز : ۸۲
طہران (تہران) : ۱۹ - ۸۲ - ۱۷۰
عراق : ۲۹۹
فلسطین : ۵۴
قونیہ : ۷۷
کربلائے معلیٰ : ۱۶۷
کرمان : ۸۱
ہامان : ۸۱
مدینۂ منورہ : ۷۳
مرو : ۶۰
مشہد : ۸۳
مصر : ۶۳
مکہ معظمہ : ۶۳ - ۷۳ - ۷۴ - ۷۷
نجف اشرف : ۱۹۶ - ۲۲۲
نہاوند : ۶۲
نیشاپور : ۷۷
ہرات : ۶۸ - ۶۹
ہندوستان : ۹۹

قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ فِی قُرآنِ الکَرِیم،

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ

جامع تعلیمات اسلامی

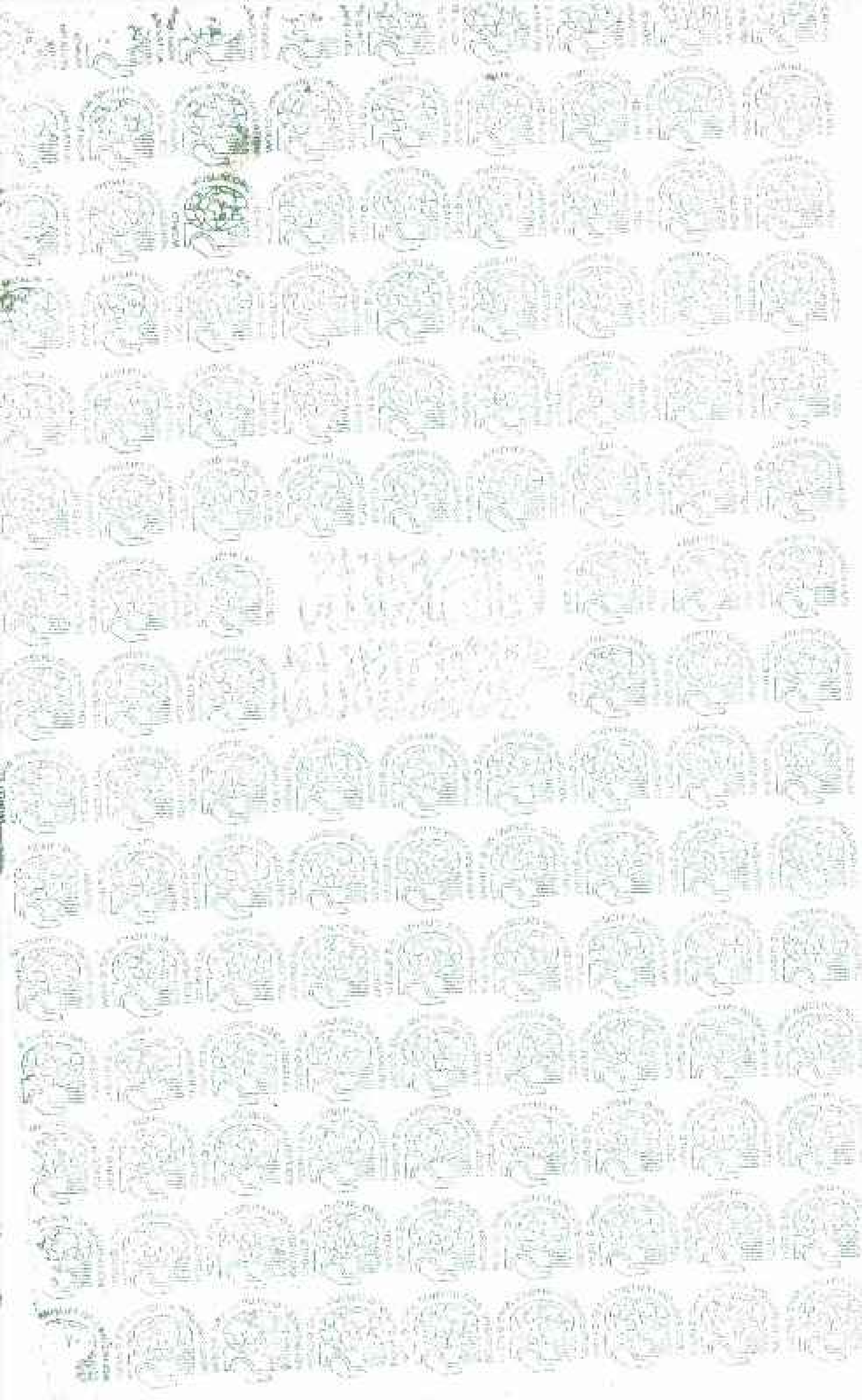

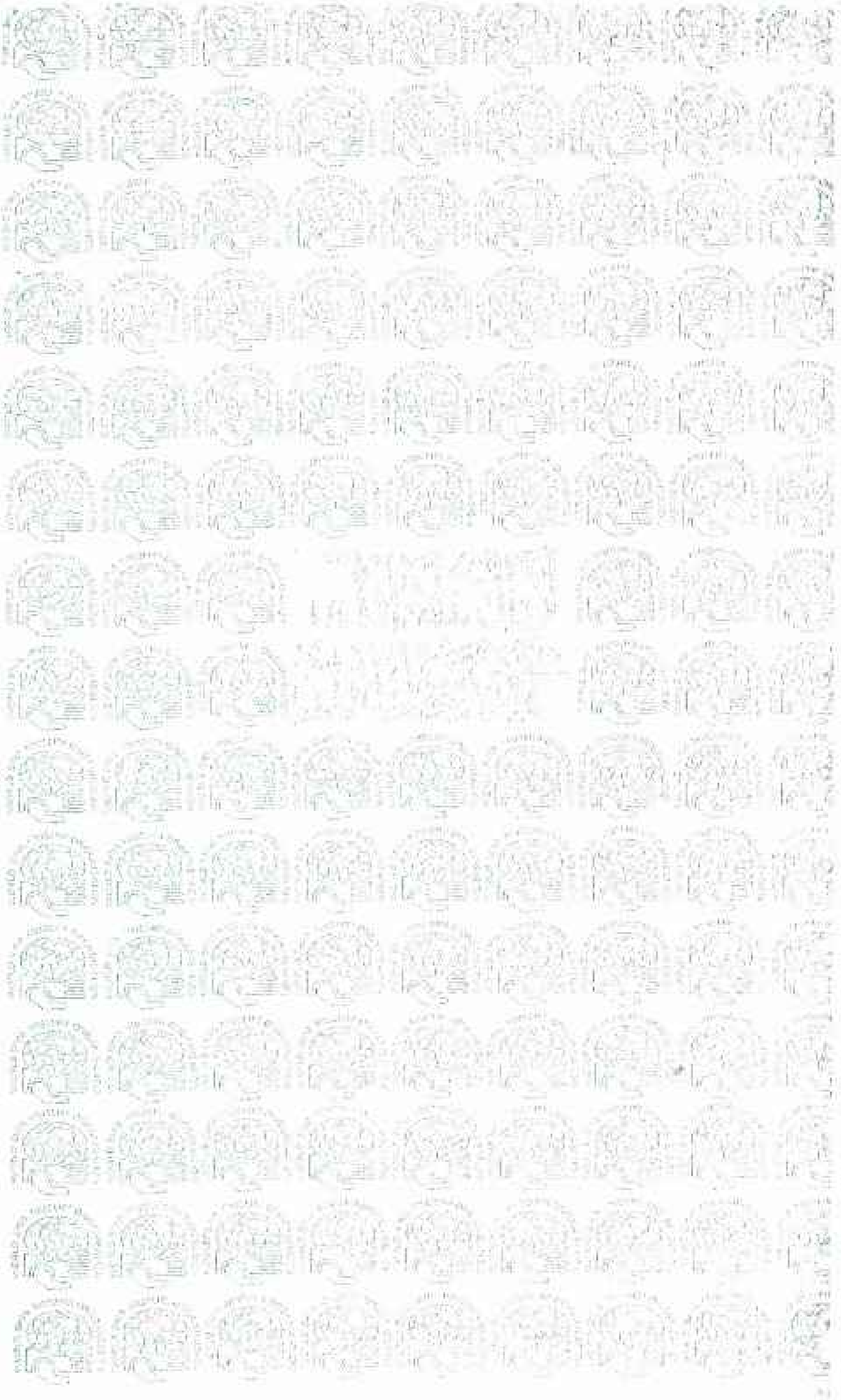

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان کی مطبوعات

اسلام دین فطرت
اسلام دین معاشرت
اسلام دین معرفت
اسلام دین حکمت
فلسفۂ معجزہ
فلسفۂ شہادت
فلسفۂ ولایت
فلسفۂ حجاب
فلسفۂ احکام
تاریخ عاشورا
گفتارِ عاشورا
بنائے کربلا
مرگِ گل رنگ
مکتب اسلام
مکتب رسولؐ
مکتب تشیع
آخری فتح
انتظارِ امامؑ
اسلام کی خاتون اول خدیجۃ الکبریٰؑ
سیدۃ النساء العالمین فاطمۃ الزہراؑ
شریکۃ الحسینؑ زینبؑ علیا مقام

وسیلۃ النجات
توضیح المسائل آیت اللہ سیستانی
حکایاتِ القرآن
حیاتِ انسان کے چھ مرحلے
مقالاتِ مطہری
بُت شکن
مَردِ انقلاب
ہار جیت
بہلول عاقل
فُزتُ بِرَبِّ الکعبہ
سخن
ابوطالب۔ مظلوم تاریخ
البیان (تفسیر سورۂ حمد)
حیات پنجتنؑ
سیر و سلوک
یسرنا القرآن
غدیر کی برکتیں
تعلیماتِ اسلامی
پاسدارانِ اسلام
دعائے خلیل، نویدِ مسیحا
انسانِ کامل

نیز بچوں کے لئے دلچسپ مذہبی کہانیاں بھی دستیاب ہیں